۲۱۳ واقع یہ ہے ---

۲۲۷ - اُٹھ اُٹھ/اٹھنا

وہ صورتیں الٰہی

رفیع الدین ہاشمی
۲۶ مارچ ۱۹۷۹ء

وصیتیں الٰہی

مالک رام

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار، دہلی ۶

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ، بمبئی ۳

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ ۲

فروری ۱۹۷۴ء، پہلی بار

جولائی ۱۹۷۶ء: دوسری بار

قیمت : =/12

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) ۵۲۸ پٹودی ہاؤس دریا گنج۔ دہلی ۶

رشید احمد صدّیقی

کی نذر

گرچہ خُردیم، نسبتے ست بزرگ

تعارف

اپنی افتادِ طبع کے باعث مجھے اپنی زندگی میں بہت ادیبوں سے ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے۔ میں انھیں تین گروہوں میں تقسیم کر سکتا ہوں۔ اول، وہ افراد: جن سے کہیں سرسری ملاقات ہوئی؛ اس کے بعد نہ ان سے ملنے کا اتفاق ہوا، نہ ابتدائی تعلقات میں اتنی قربت محسوس کر سکا کہ مراسلت کا سلسلہ قائم ہو جاتا۔ دوسرے، وہ حضرات؛ جن سے مراسلت تو بہت دن رہی، لیکن یکجائی کے مواقع بہت کم ملے۔ اتنے کم کہ نہ میں ان سے استفادہ کر سکا، نہ ان کی شخصیت کا اثر مجھ پر ہوا۔ تیسری جماعت ان احباب پر مشتمل ہے، جن سے لمبے عرصے تک تعلقات رہے؛ ان سے خط و کتابت بھی رہی؛ اور ان کے کردار اور شخصیت پر میں کچھ لکھ بھی سکتا ہوں۔

اس مجلد میں اسی تیسرے طبقے کے چند ان بزرگوں کے بارے میں اپنے تاثرات جمع کر رہا ہوں جن سے مجھے اپنی حیاتِ مستعار میں ملاقات اور استفادے کا موقع میسّر آیا۔ یہ سب میرے معاصر ہیں۔ معاصرت کے لیے عمر کی برابری ضروری نہیں، البتہ ایک زمانے میں موجودگی لابدّ ہے۔ خوش قسمتی سے مجھے اپنی خردی اور ہیچمدانی و ہیچمیرزی کے باوجود ان بزرگوں کی خدمت میں رہنے کی سعادت اور مسرت حاصل ہوئی۔ ان میں سے بعض کے مجھ پر احسانات بھی ہیں۔ واجب تھا کہ میں اس کے لیے ان کا شکریہ اور خدا کا

شکر ادا کرتا۔ اس کتاب کی اشاعت سے یہ مقصد بھی میرے پیش نظر ہے۔

آپ کہینگے کہ اگر بنیاد یہی ہے، تو اور سب تو ٹھیک سہی، یہ غالبؔ کا اس مجموعے میں شمول کیونکر جائز قرار دیا جاسکتا ہے؟ تو اب میں آپ کو کیونکر یقین دلاؤں کہ غالب سے میری اکثر ملاقات رہی ہے اور میں نے انھیں بھی اتنے ہی قریب سے دیکھا ہے، جتنا ان دوسرے بزرگوں کو جن کے حالات آپ اس کتاب میں پائینگے۔ بلکہ جسارت کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ دوسروں کی موت کے بعد ان سے ملاقات واقعی منقطع ہو گئی، غالب سے تو آج تک جاری ہے، حال آں کہ وہ جسدی لحاظ سے ان سب سے کہیں پہلے راہیِ ملکِ بقا ہوئے تھے۔

چونکہ یہ مضامین میرے اور ان مرحومین کے باہمی تعلقات پر مبنی ہیں، اس لیے لامحالہ ان میں مجھے اکثر صیغۂ واحد متکلّم استعمال کرنا پڑا۔ یہ نہ خیال کیا جائے کہ اس سے مجھے اپنی نمائش منظور رہی ہے۔ میں کیا اور میری بساط ہی کیا، جس کی نمائش کرنے کی مجھے تمنّا ہو۔ ہے یہ کہ سلسلۂ کلام کو مسلسل اور مربوط رکھنے کے لیے کبھی اپنے بارے میں بھی بات کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ آپ چاہیں، تو ان حصّوں کو نظر انداز کر دیجیے؛ یہ کچھ ایسے اہم بھی نہیں۔

میرا دوسرا مقصود ان اصحاب کی زندگی کے وہ نقوش اور کردار کے وہ پہلو محفوظ کرنا ہے، جن تک ان کے سوانح نگار کی آسانی سے دسترس نہیں ہو سکتی۔ اگر ان مضامین سے کسی کو ان کے کردار کی تشکیل و تکمیل میں کچھ مدد مل سکے، تو میرا مقصد حاصل ہو گیا۔

ایک اور بات:

آپ کو دو ایک جگہ واقعات یا حالات میں تکرار کا احساس ہوگا۔ لیکن آپ ملاحظہ کرینگے کہ اس میں بھی اجمال اور تفصیل کا فرق ہے، یہ مضامین مختلف اوقات میں قلمبند ہوئے ہیں۔ حالات کا اقتضا یہ تھا کہ ہر ایک مضمون کسی اور تحریر یا مضمون کی طرف رجوع کیے

بغیر اپنی جگہ مکمل شکل میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ جہاں جیسی ضرورت پیش آئی، اسی کے مطابق میں نے شرح و بسط یا اختصار سے کام لیا۔ اب کہ یہ مضامین یکجا کتابی شکل میں چھپنے والے ہیں، اس سے اجتناب کی یہ راہ تھی کہ جگہ جگہ دوسرے مضامین کے حوالے دے کر ان حصّوں کو حذف کر دیا جاتا۔ لیکن یہ طریقہ اختیار کرنے سے مضمون کا تسلسل قائم نہیں رہ سکتا تھا، جس سے پڑھنے والا الجھن محسوس کرتا۔ اسی لیے تمام مضامین کو اسی صورت میں چھوڑ دیا گیا ہے، جس طرح یہ پہلے لکھے گئے تھے۔

نئی دلی
یکم فروری ۱۹۷۴ء

مالک رام

فہرست

میرزا غالب

میرزا غالب سے ان کی زندگی میں مجھے بارہا ملنے کا اتفاق ہوا۔ ہمارے خاندان کے اُن سے بہت پرانے تعلقات تھے۔ بلکہ دور نزدیک سے کچھ عزیزداری بھی تھی۔ میرے والد ان کے ہمعمر اور ہمجولی تھے۔ وہ دونوں بچپن میں شیخ معظم کے مکتب میں اکٹھے پڑھتے رہے تھے۔ لیکن میری ملاقات اُن سے بہت بعد کو ہوئی۔ میرزا صاحب میری پیدائش سے بہت پہلے ہی ۱۸۱۲ء یا ۱۸۱۳ء میں آگرہ چھوڑ کر دلی چلے آئے تھے۔ پھر اگرچہ اس کے بعد بھی وہ دو ایک مرتبہ آگرے تشریف لے گئے، لیکن صغرسنی کے سبب میں، ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔

ایک زمانے کے بعد جب کاروبار کے سلسلے میں پہلی بار میرا دلی آنا ہوا، تو چلتے وقت والد مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ دیکھو، میرزا غالب کی خدمت میں ضرور حاضر ہونا اور ان سے میرا اسلام شوق عرض کرنا۔ یہ غدر ۱۸۵۷ء سے چھ سات برس پہلے کا ذکر ہے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ میرزا صاحب ان دنوں لال کنواں میں حضرت مولانا نصیرالدین عرف میاں کالے کی حویلی میں رہتے تھے۔ ۱۸۴۷ء میں ان پر جوا خانہ قائم کرنے کے جرم میں مقدمہ چلا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ تین مہینے قید خانے میں رہے تھے جب قید سے رہا ہوئے تو میاں کالے صاحب انھیں اپنے ہاں لیوا لے گئے۔ میرزا صاحب نے بہت کہا کہ حضرت! آپ میرے بزرگ اور مخدوم ہیں۔ میں آزاد منش آدمی ہوں،

میرے یہاں رہنے سے آپ کو تکلیف اور پریشانی ہوگی، لیکن میاں کالے ایک نہیں مانے اور مجبوراً میرزا صاحب کو ان کے مکان پر قیام کرنا پڑا۔ یہیں وہ مشہور لطیفہ پیش آیا تھا کہ ایک دن ایک صاحب مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوئے اور مبارکباد دی کہ "شکر ہے، خدا کے فضل سے آپ قید سے آزاد ہوئے!" اس پر میرزا بولے "کون بھڑوا آزاد ہوا ہے! پہلے گورے کی قید میں تھا، اب کالے کی قید میں ہوں"۔ میرزا غالب اس مکان میں ستمبر ۱۸۴۷ء سے لے کر مارچ ۱۸۵۲ء تک رہے تھے۔

یہاں دلی میں کام سے مجھے اتنی فرصت نہ ملی کہ جلد ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ لیکن یہی فکر تھی کہ بن ملے واپس گیا، تو قبلہ والد صاحب ناراض ہوں گے۔ اس لیے جوں توں کو کے واپسی سے ایک دن پہلے مغرب کے قریب ان کے مکان پر گیا اور اطلاع کرائی۔ ملازم مجھے اندر لے گیا۔ باہر صحن میں مونڈھے بچھے تھے۔ ایک تخت بھی قریب میں پڑا تھا۔ میرزا صاحب ایک مونڈھے پر بیٹھے تھے۔ بعض اور اصحاب دوسرے مونڈھوں پر تشریف رکھتے تھے۔ میں ان میں سے کسی کو پہچانتا نہیں تھا، بعد کو معلوم ہوا کہ ان میں صاحب خانہ حضرت میاں کالے تھے۔ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خان تھے۔ نواب مصطفےٰ خان شیفتہ، نواب ضیاء الدین احمد خان تھے۔ اور بھی دو تین صاحب بیٹھے تھے۔ میں نے پہنچ کر آداب عرض کیا اور چپکے سے ایک طرف تخت کے سرے پر بیٹھ گیا۔ میرزا صاحب نے بے تکلفی کے لہجے میں فرمایا: "آیئے آیئے تشریف رکھیے۔ فرمایئے،" میں نے اپنا نام بتایا اور عرض کیا کہ میں اکبر آباد کا رہنے والا ہوں اور صرف سلام کو حاضر ہوا ہوں۔ اس پر وہ مسکرا کر کچھ کہنے کو تھے کہ نہ معلوم حاضرین میں سے کس نے کوئی سوال کر دیا اور وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔

میرزا صاحب کا سن پچاس سے اوپر تھا۔ چوڑا چکلا ہاڑ، ڈاڑھی صفاچٹ، نازک باریک مونچھیں جنھیں تاؤ دے رکھا تھا، بڑی بڑی غلافی آنکھیں، سُرخ و سپید رنگ، جس میں چمپئی دمک تھی، سر پر لمبے لمبے پٹھے، قلموں پر لٹکتے ہوئے بال، سر پر

ایک پلے کی ہلکی سی ٹوپی جس پر کشیدہ کا کام تھا، بدن پر تنزیب کا انگرکھا، اور نیچے ایک برکا سپید پاجامہ۔ پاؤں میں گھتلی جوتی۔ ہاتھ میں پیچوان کی نےَ تھی اور کش لگا رہے تھے۔ نواب شیفتہ چالیس سے اوپر تھے۔ ان کے چہرے سے متانت اور سنجیدگی ٹپکتی تھی۔ بات بہت ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے۔ نواب ضیاء الدین خان ان دنوں جوان تھے۔ تیس کے لگ بھگ ہو نگے: بارعب کتابی چہرہ، بھری بھری ڈاڑھی، شربتی آنکھیں حکیم احسن اللہ خان اور مولانا نصیر الدین دونوں بزرگ بڑی نورانی شکلوں کے مالک تھے۔ حال آنکہ حاضرین میں سب وجیہہ اور باوقار لوگ موجود تھے، پھر بھی اس سارے مجمع میں میرزا صاحب کی شخصیت خاص طور پر نمایاں تھی۔

دیر تک ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ کچھ شعروشاعری، کچھ تصوف، کچھ قلعے کے لطیفے؛ غرض کہ دو گھڑی بڑے لطف کی صحبت رہی۔ اس کے بعد احباب رخصت ہونے لگے۔ میں اس انتظار میں رہا کہ ذرا فراغت اور یکسوئی ہولے، تو اپنا تعارف کراؤں۔ چنانچہ جب سب صاحب رخصت ہو لیے تو میں نے جرأت کر کے گزارش کی کہ میں خاص طور پر حاضر خدمت ہوا ہوں۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں کون ہوں، تو بڑے تپاک سے ملے۔ دیر تک حضرت والد صاحب قبلہ اور آگرے کے دوسرے احباب کا حال پوچھتے رہے۔ پھر پوچھا کہ کہاں اُترے ہو، اور کب تک قیام ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ایک عزیز کے یہاں پہاڑ گنج میں ٹھہرا ہوا ہوں اور ان شاء اللہ کل دوپہر جا رہا ہوں۔ فرمایا کیا معنی کہ وہ عزیز ہیں اور میں دشمن تھا۔ میاں تمھیں اپنے اور ہمارے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم! تمھارے والد تو میرے لنگوٹیے یار ہیں۔ ہم مکتب میں، کریما اور مقیماں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ دن بھر ایک ساتھ کھیلتے تھے اور ایک کو دوسرے کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ تمھارے والد پڑھنے لکھنے اور آموختے میں بہت ہشیار تھے۔ آہ! کیا زمانہ تھا وہ بھی۔ میں نے باقاعدہ طور پر مکتب جانا اور پڑھنا لکھنا دس بارہ برس کی عمر سے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس پر بڑے خان صاحب (یعنی خواجہ غلام حسین کمیدان، میرزا صاحب کے نانا جان) بہت خفا ہوئے۔ والدہ بھی بہت

ناراض ہوئیں۔ ماموں نے بھی سمجھایا لیکن بیکار۔ معلوم نہیں، میرے سر پر آوارگی کا بھوت کچھ اس بُری طرح سوار تھا کہ کچھ اثر نہ ہوا اور میں نے دوبارہ مکتب کی طرف منہ نہیں کیا (پھر مسکرا کر کہنے لگے) اب سوچتا ہوں کہ شاید کچھ ایسا بڑا نقصان بھی نہیں ہوا۔ بھلا وہ تعلیم جاری رہتی تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ لوگ مجھے عالم اور مولوی کہنے لگتے۔ لیکن جتنا علم مجھے اب ہے اس سے کیا فائدہ حاصل ہوا کہ مزید کی آرزو ہو۔ چالیس برس کی تک تک مٹنے:

کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

اسی طرح تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے، کچھ مجھ سے، کچھ اپنے آپ۔ جب میں نے اجازت چاہی، تو فرمایا: بھائی کو سلام شوق کے بعد کہنا کہ دل ان کے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے اور یہ شعر سنانا:

مالذتِ دیدار، زپیغام گرفتیم
مشتاق تو، دیدن زشنیدن نشناسد

اور ہاں، دیکھو۔ اب کے جو دلّی آنا ہو، تو میرے ہی پاس ٹھہرنا۔ اس میں تکلف کی کوئی بات نہیں۔ اسے بھی اپنا ہی گھر سمجھو۔

۲

دوسری بار میں نو دس مہینے بعد ۱۸۵۳ء کی گرمیوں میں دلّی آیا اور جرأت کر کے میرزا صاحب کے مکان پر چلا گیا۔ میں نے اپنے آنے کی اطلاع انھیں پہلے سے دے رکھی تھی۔ وہ ان دنوں بلّی ماروں میں حکیم محمد حسن خان کی حویلی میں کرایے پر رہتے تھے یہ مکان بہت ہوادار اور مشرق سے کھلا تھا۔ اس لیے دریا کی طرف سے خوب ہوا آتی تھی۔ محلسرا اور دیوانخانہ بھی الگ الگ تھے۔ لیکن اس میں ایک نقص تھا کہ کمرے بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔

میں پہنچا، تو میرزا صاحب بڑی گرمجوشی سے ملے اور فرمایا کہ میں بہت خوش ہوا کہ تم نے

اسے اپنا گھر سمجھنا۔ تمہارے والد میرے بھائی ہیں، اور تم میرے بھتیجے اور بیٹے ہو۔ پھر فرمایا: دیکھو، کوئی شرم اور تکلّف کی بات نہیں۔ کسی شے کی ضرورت ہو، تو بے جھجک مانگ لینا۔ اگر کھانے میں کوئی خاص چیز پکوانے کی خواہش ہو، تو دادا سے کہہ دو، پک جائیگی۔ اب آؤ، تمھیں تمہاری چچی کے پاس لے چلوں۔

اس کے بعد وہ مجھے اندر بیگم صاحب کے پاس لے گئے۔ وہ اس وقت زین العابدین خان عارف مرحوم کے دونوں صاحبزادوں، باقر علی خان اور حسین علی خان کو کھانا کھلا رہی تھیں۔ باقر علی خان اس وقت پانچ چھ برس کا تھا اور حسین علی خان ڈھائی تین کا۔ باقر علی خان مستقل طور پر رہتا تو اپنی دادی اماں کے پاس تھا، لیکن اُس وقت یونہی کھیلتے کھیلتے ادھر آنکلا تھا؛ حسین علی خان البتہ میرزا صاحب ہی کے ساتھ رہتا تھا۔ میرزا صاحب نے میرا تعارف کرایا اور کہا کہ یہ میرے عزیز ہیں، اور رشتے میں بھتیجے ہوتے ہیں۔ کسی کام سے یہاں آئے ہیں۔ تمہارے پاس ٹھہریں گے؛ ذرا خیال رکھنا، انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ میں آداب بجالایا۔ بیگم صاحب نے دُعا دی اور فرمایا "بیٹا، تکلّف کا خانہ خراب۔ اگر تمھیں کوئی چیز چاہیے، تو کسی نوکر سے کہہ دو، یا مجھے اندر کہلوا بھیجو۔ مہیّا ہو جائیگی۔ اور اگر شرما شرمی میں رہے، تو تم جانو۔"

میں شام کے قریب پہنچا تھا اور سفر کی تکان کے سبب میری آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ اشتہا بھی نہیں تھی۔ میرزا صاحب نے کالے خان (عرف کلّو) داروغہ سے کہا: دیکھو، آپ کا پلنگ باہر کے دالان میں لگا دو اور پانی کا لوٹا پاس رکھ دو، تاکہ صبح مانگنے کی ضرورت نہ رہے۔ میں تھکا ماندہ تو تھا ہی، بستر پر پڑتے ہی سو گیا۔

اگلی صبح اٹھا، تو دیکھا کہ میرزا صاحب مجھ سے پہلے جاگ چکے ہیں، اور ابھی ابھی دیوان خانے میں آکر بیٹھے ہیں۔ میں بھی ہاتھ مُنہ دھو، آداب عرض کرکے، ان کے پاس جا بیٹھا۔ دیوان خانے میں سفید چاندنی کا فرش ہو رہا تھا۔ صدر میں قالین اور دو تین گاؤ تکیے لگے رکھے تھے۔ ایک طرف قرینے سے لگن میں پیچوان رکھا تھا۔ قالین کے کنارے، چاندی کا پاندان پڑا تھا۔ کمرے میں تین چار پیتل کے اگالدان تھے اور ایک کونے

میں بڑی سی چلمچی دھری تھی۔ تھوڑی دیر میں وفادار ملازمہ اندر سے سرپوش ڈھکا ہوا ایک لوٹا اور دو خالی گلاس لائی، اور انھیں قالین کے پاس رکھ کے چلی گئی۔ میرزا صاحب نے مجھ سے پوچھا: کیوں بھائی، حقّہ کر دگے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ کیا ہے۔ کہنے لگے: بادام اور مصری، کوئی حرام چیز نہیں۔ بات یہ ہے کہ ایک زمانہ سے مجھے گرمی کی شکایت ہے۔ حکیم صاحب نے کہہ رکھا ہے کہ رات کو پندرہ ایک بادام پانی میں بھگو دو۔ صبح چھلکا اتار کر انھیں خوب گھونٹ لو اور اس شیرہ میں گلاس بھر مصری کا شربت ملا کر پی جاؤ۔ چنانچہ گرمی ہو کہ جاڑا۔ روزانہ صبح نہار منہ، یہ ٹھنڈا پانی پیتا ہوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے دن بھر طبیعت میں تازگی اور فرحت محسوس کرتا ہوں۔ اس تبرید کے لیے مصری خاص طور پر بیکانیر سے منگواتا ہوں کہ وہاں کی مصری صاف اور خشک اور مٹھاس میں خوب ہوتی ہے۔ یہاں جو مصری بازار میں ملتی ہے اس میں نمی ہوتی ہے۔

ہم ابھی بیٹھے باتیں ہی کر رہے تھے کہ ڈاکیا آیا اور تین چار خط دے گیا۔ میرزا صاحب حقہ پینے اور خط پڑھنے لگے۔ ان میں ایک خط غالباً منشی ہرگوپال تفتہ کا تھا جنھیں وہ مرزا تفتہ کہتے تھے۔ دوسرا بریلی والے قاضی عبدالجمیل کا تھا۔ دو اور خط اب یاد نہیں رہا کہ کن کے بتائے تھے۔ جب خط پڑھ چکے، تو کہنے لگے: لو صاحب، میں تو اب قلعے جاتا ہوں، دس بجے تک واپسی ہو گی۔ تم چاہو یہاں بیٹھو، چاہو، گھومنے چلے جاؤ۔ قلعے سے واپسی پر کھانا کھائینگے۔ اگر جاؤ، تو اس وقت تک گھر پہنچ جانا۔ میں سیر کے لیے باہر جانے ہی والا تھا کہ میرزا صاحب کے دو تین ملاقاتی آ گئے۔ ایک تو میر افضل علی عرف میرن صاحب کے خسر بزرگوار جناب مولوی مظہر علی صاحب تھے۔ دوسرے پنڈت شیوجی رام ہونس میرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ ان کے ساتھ ان کا نوجوان بیٹا بال مکند بھی تھا۔ مولوی مظہر علی تو اسی محلّے میں میرزا قربان بیگ کے مکان میں رہتے تھے۔ میرزا صاحب کے مسکن اور ان کے گھر کے درمیان ایک میر خیرات علی کی حویلی تھی۔ پنڈت شیوجی رام کا مکان کچھ فاصلے پر کوچہ پنڈت میں تھا۔

تھوڑی دیر بعد میر احمد حسین میکش آ گئے۔ یہ بھی میرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ ان اصحاب کو دیکھ کر، کلّو حقّہ تازہ کر کے لے آیا۔ سب نے کلّو سے کہا کہ بیگم صاحب کی خدمت میں ہمارا آداب کہلوا دو۔ کلّو نے آواز دے کر وفادار لونڈی کو بلوایا۔ معلوم ہوا کہ وہ باہر سودا سلف لینے گئی ہے۔ نیاز علی چھوکرے نے جھانک کے پوچھا: کیوں، داروغہ جی، کیا چاہیے؟ کلّو نے جواب دیا، ابے، بیگم صاحب سے یہ کہو کہ مولوی مظہر علی صاحب اور میر احمد حسین اور پنڈت شیو جی رام آداب کہتے ہیں اور پنڈت جی کا صاحبزادہ بال مکند بندگی عرض کرتا ہے۔ جب اندر اطلاع ہوئی تو وفادار گلوریوں کی تھالی لیے آئی اور کہا کہ بیگم صاحب سب کو آداب اور بال مکند کو دعا کہتی ہیں اور یہ کہا ہے: میرزا صاحب اب آتے جاتے ہیں۔ آپ بیٹھیے اور حقّہ پیجیے اور پان کھائیے۔ ہم سب بیٹھے گپ کر رہے تھے کہ دس بجے کے لگ بھگ میرزا صاحب قلعے سے لوٹے۔ سب نے کھڑے ہو کر آداب عرض کیا۔ وہ صدر میں مولوی مظہر علی کے پاس بیٹھ گئے اور لگے ایک ایک سے گھر بار کا حال پوچھنے۔ مولوی صاحب سے پوچھا کہ میرن صاحب کہاں ہیں اور کیسے ہیں؟ پنڈت شیو جی رام سے دریافت کیا کہ کہو، تمھارے محلّے میں اب موسمی بخار کا کیا حال ہے؟ بال مکند سے اس کی تعلیم سے متعلق سوال کیا۔ میکش سے اس کے گھر والوں کا پوچھا کہ شہر میں ہیں یا اپنے میکے بہرام پور گئے ہوئے ہیں۔ باتیں ہو رہی تھیں کہ اندر سے نیاز علی نے آ کر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے، حکم ہو تو نکلوایا جائے۔ اس پر دوستوں نے اجازت چاہی اور میرزا صاحب اُن تینوں دوستوں کے ساتھ اندر گئے۔

اندر ایک دالان میں فرش پر دسترخوان بچھا تھا۔ کھانے میں بھنا ہوا گوشت تھا۔ قیمہ بھرے کریلے تھے۔ بریانی پلاؤ تھا اور ایک ترکاری تھی۔ رَوے کا حلوہ تھا۔ دو تین قسم کا مربّے اور تیل کا اچار تھا۔ لیکن ایک بات عجیب دیکھی کہ قیمے اور گوشت ترکاری سب میں چنے کی دال پڑی ہے، دلیے میں کم اور گوشت ترکاری میں زیادہ۔ میرزا صاحب نے ترکاری کو تو ہاتھ بھی نہیں لگایا، دو ایک نوالے کریلے کے ساتھ

کھائے، تھوڑے سے چاول بھی چکھے۔ البتہ گوشت بہت رغبت سے کھایا اور کافی مقدار میں کھایا۔

جب کھانا کھا چکے تو اٹھے۔ وفادار پانی کا لوٹا اور بیسن کی کٹوری لے آئی۔ آپ نے بیسن سے ہاتھ دھو لیے کہ ہاتھوں کی چکناہٹ چھوٹ جائے۔ باہر دیوانخانے میں آئے اور پلنگ پر دراز ہو گئے۔ فرمایا "نیند نہیں آتی لیکن لیٹنے کی عادت ہے جب تک دو ایک گھنٹے آرام نہ کر لوں، نہ کھانا ہی ہضم ہوتا ہے، نہ کوئی کام ہی کرنے کو جی چاہتا ہے۔ پلنگ پر لیٹے حقے کے کش لگاتے رہے۔ میں فرش پر بیٹھا تھا۔ پوچھنے لگے: "کہو، کہیں سیر کو گئے تھے؟ میں نے عرض کیا کہ نکلنے ہی والا تھا کہ یہ دوست آ گئے اور ان کی خاطر سے رک گیا۔ فرمایا! واہ، اس کی کیا ضرورت تھی؟، وہ بیٹھتے تم اپنے کام پر چلے جاتے۔ میں ایک زمانے سے بالعموم ہر روز صبح کے وقت قلعے جاتا ہوں، بالخصوص جب سے حضرت ظلِ سبحانی نے خاندانِ تمر کی تاریخ لکھنے پر مقرر کیا ہے، یہ بلاناغہ کا دستور رہا ہے۔ میری غیر حاضری میں بھی ہمیشہ دو ایک دوست یہاں موجود ہوتے ہیں۔ حقہ پیا، پان کھایا، کبھی کوئی خاص ملنے والے ہوں تو تمھاری بھی چاہیں، تو انھیں کچھ کھانے کو بھی بھیج دیتی ہیں۔ جب لوٹ کے آتا ہوں، تو ان سے دو گھڑی کی مجلس رہتی ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے، جب حضرت جنت مکانی بہادر شاہ ظفر بہت بیمار ہو گئے تھے اور ان کی جان تک کے لالے پڑ گئے تھے۔ اگرچہ اب بیماری کی وہ خطرناک صورت تو نہیں رہی تھی اور پہلے سے کچھ افاقت تھی، لیکن ابھی ان کی حالت تشویش سے خالی نہیں تھی۔ اس لیے میں نے پوچھا کہ حضرت بادشاہ سلامت کی صحت اب کیسی ہے؟ کہنے لگے: طبیب علاج معالجہ کر رہے ہیں اور حالت آگے سے بہتر بتائی جاتی ہے، لیکن خطرہ پوری طرح رفع نہیں ہوا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ ان کا دم غنیمت ہے۔ آج بھی جب میں گیا ہوں، تو خوابگاہ ہی میں حاضری ہوئی۔ ولیعہد بہادر، میرزا فخرو بھی وہاں بیٹھے تھے۔ میرزا سلیمان شکوہ کے پوتے میرزا نورالدین، لکھنو

سے آئے ہوئے ہیں، وہ بھی تھے۔ یہ رشتے میں اعلیٰ حضرت کے بھتیجے ہوتے ہیں اور اپنے والد میرزا کام بخش اور دادا کی طرح شیعیانِ اہلِ بیت میں سے ہیں۔ حکیم احسن اللہ خاں بھی موجود تھے۔ دو ایک مصاحب بھی دست بستہ کھڑے تھے۔ میں نے اطلاع کرائی، تو اندر جانے کی اجازت ملی۔ میں نے مجرا عرض کیا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ کمزوری کا کچھ نہ پوچھو۔ پہچانے نہیں جاتے۔ پہلے ہی کون سے ذرہ سامان تھے۔ پھر عمر کا تقاضا۔ یوں سمجھو کہ اس اگلے شعبان میں اسّی برس کے ہو جائینگے۔ رہی سہی کسر، اس بیماری نے پوری کر دی۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئے ہیں۔ بہت رک رک کر دو ایک باتیں کیں۔ ارشاد فرمایا۔ آج ایک عجیب بات ہوئی۔ فجر کی نماز کے بعد یونہی ذرا میری آنکھ جھپک گئی، تو میں نے دیکھا کہ حضرت عباس علمدار کی درگاہ پر علم چڑھا رہا ہوں۔ اس پر میرزا انور الدین نے عرض کیا کہ جہاں پناہ، یہ رویائے صادقہ اور اشارۂ غیبی ہے۔ اس خواب کو ظاہر میں پورا کرنا چاہیے۔ فرمایا بہت اچھا۔ خدا نے ہمیں صحت دی، تو ہم حضرت کی درگاہ پر سونے کا علم چڑھائینگے۔ سب حاضرین نے خوشی کا اظہار کیا اور دعا کی کہ شافیِ مطلق جلد صحت بحال کرے اور حضورِ والا اپنی منّت پوری کریں۔

پھر فرمایا: ایک بات میری یاد رکھو۔ خدا ان پر فضل کریگا اور اب یہ اچھے ہو جائینگے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ جو شخص بھی اہلِ بیت سے محبت کریگا، خدا اس سے محبت کریگا۔ وہ دو ڈھائی بجے اٹھے۔ ہاتھ منہ دھویا اور قالین پر آن بیٹھے۔ پہلے تھوڑی دیر حقہ پیتے رہے۔ پھر دوستوں کے خطوط کے جواب لکھے۔ لیکن گرمی اس بلا کی تھی کہ اس دوران میں انھوں نے تین چار بار پانی پیا ہو گا۔ ٹھنڈے پانی کی صراحی، جس پر صافی لپٹی ہوئی تھی، پاس رکھی تھی۔ اسے اٹھاتے اور تھوڑا سا آبخورے میں انڈیل کر پی لیتے۔ پانچ بجے کے قریب داروغہ جی کو بلایا اور حکم دیا کہ دیکھو، میاں کلّو اب گرمی بہت ہو گئی ہے۔ دوپہر کو یہاں بیٹھنا مشکل ہے۔ کل سے ہماری اندر کی کوٹھری تیار کر وا دو اور خس کی ٹٹی کا بھی انتظام کر دو۔ ذرا خیال رکھنا خس تازہ

اور چھوٹی چھوٹی ہو۔ جس میں پانی دیر تک ٹھہر سکے اور خوشبو بھی ہو۔ اور اب برف کا ذخیرہ رکھنا چاہیے۔ میرزا صاحب اپنے حکم احکام ختم بھی نہیں کر چکے تھے کہ کلیان کہار نے آ کر اطلاع دی کہ ابھی ابھی باہر صدر الصدور کی پالکی سے اترے ہیں۔ یہ سنتے ہی میرزا صاحب جھٹ سے کھڑے ہو گئے اور صدر دروازے تک جا کر مفتی صدر الدین خان آزردہ کی پذیرائی کی۔ باہر صحن میں مونڈھے بچھے تھے۔ پہلے مفتی صاحب کو ایک مونڈھے پر بٹھایا، پھر خود بیٹھے۔ میں بھی ایک تخت پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں یکے بعد دیگرے شیفتہ، صہبائی، نیر رخشاں، داغ اور ظہیر بھی آ گئے۔ داغ اور ظہیر چونکہ عمر میں سب سے چھوٹے تھے، اس لیے مؤدبانہ میرے پاس تخت پر آ بیٹھے۔ سب قادر الکلام تو تھے ہی۔ اچھی خاصی مجلس شاعرہ گرم ہو گئی۔ حضرت مفتی صاحب نے فرمائش کی کہ کوئی تازہ کلام ہوا ہو تو سنائیے۔ میرزا صاحب نے پہلے تو عذر کیا؛ لیکن جب مفتی صاحب کے ساتھ صہبائی بھی اصرار کرنے لگے تو فرمایا کہ شعر کام دل و دماغ کا ہے۔ دنیا داری کے جھمیلوں ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ قلعے کی حاضری اور دوست احباب کی خدمت سے فرصت ملے، تو انسان کچھ فکر بھی کرے اس پر آج کل آسمان سے آگ برس رہی ہے۔ گرمی کے مارے حواس ٹھکانے نہیں۔ ایک غزل تھوڑے دن ہوئے کہی تھی، اس کے چند شعر عرض کرتا ہوں:

چاک از جیبم بہ داماں می رود — تا چہ بر چاک از گریباں می رود

جوہر طبعم درخشان ست، لیک — روزم اندر ابر پنہاں می رود

گر بود مشکل، مرنج اے دل، کہ کار — چوں رود از دست، آساں می رود

جز سخن، کفرے و ایمانے کجاست — خود سخن در کفر و ایماں می رود

آید و از ذوق نشناسم کہ کیست — تا رود، پنداشتی جاں می رود

می برد، اما نہ یک جا می رود — می رود، اما پریشاں می رود

اوّلِ ماہ است واز شرمِ تو ماہ آخرِ شب، از شبستاں می رود
کیست تا گوید، بداں ایواں نشیں
آنچہ بر غالبؔ ز دوراں می رود

حکیم مومن خاں کے انتقال کو مشکل سے سال بھر ہوا تھا۔ معلوم نہیں، کیسے اُن کا ذکر چل پڑا۔ اس پر میرزا صاحب فرمانے لگے "صاحب، بڑی آن بان کا آدمی تھا۔ ایسا رنگین مزاج اور زندہ دل اور خوددار شخص بھی کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا، بلکہ غزل میں ایک نئی روش کا مخترع تھا۔ جب تک اس کا شعر ایک خاص لب و لہجہ سے نہ پڑھا جائے، اس کا پورا لطف نہیں اٹھایا جا سکتا۔ مجھے تو اس کا یہ شعر نہیں بھولتا:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

نفسِ مضمون، لطفِ زبان، اسلوبِ بیان، غرض اس کی کس کس بات کی تعریف کی جائے۔ جب تک کسی شخص نے عشق بازی کی نہ ہو، اور کسی کے فراق کا مزہ چکھا نہ ہو، اسے یہ مضمون سوجھ ہی نہیں سکتا۔ زبان کا کیا کہنا اور "گویا" میں جو پہلو ہے، وہ تو کہنے کی بات ہی نہیں۔ سب پر طرہ یہ کہ سہلِ ممتنع۔ یہ "ماورائے شاعری" کچھ اور چیز ہے اور محض خدا کی دین۔ ریختہ میں اس پایے کے شعر بہت کم ہیں۔ میں نے تو مرحوم سے ایک بار کہا تھا کہ بھائی، میرا سارا دیوان لے لے اور یہ شعر مجھے دے دے۔ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد پھر کہنے لگے ۔ صاحب، مومن کے مر جانے سے زندگی کا

لطف آدھا رہ گیا۔ قافلہ خالی ہوتا جاتا ہے۔ مرحوم میرا یار اور ہمعصر تھا۔ میں جب آگرے سے یہاں آیا ہوں، تو یہی پندرہ سولہ برس کی میری عمر تھی۔ شاید وہ مجھ سے دو ایک سال چھوٹا ہو۔ لیکن ذہن کا شروع سے بہت تیز تھا۔ اس نے ابتدا میں چند غزلیں نصیر کو دکھائی تھیں۔ لیکن دونوں کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نصیر کی قادر الکلامی میں شک نہیں، مگر ان کے استعارے اور تشبیہیں ایسی ہی ہیں جیسے پیاز کہ چھلکے ہی چھلکے ہیں، گودے کا نام نہیں۔ اس کے برخلاف مومن نے طبیعت معنی آفریں پائی تھی۔ بھلا کیسے نبھتی۔ بس جلد ہی یہ گھبرا کر ان کے جال سے نکل بھاگے؛ اور پھر کسی کو اپنا کلام نہیں دکھایا؛ اور میرا خیال ہے کہ یہ اچھا ہی ہوا۔ ہم دونوں کی خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ اس چالیس بیالیس برس کے عرصے میں کبھی کوئی رنج یا ملال ہمارے درمیان نہیں آیا۔ حضرت، اتنی لمبی مدت کا تو دشمن بھی میسر نہیں آتا۔ دوست کہاں سے ہاتھ آتا ہے! میں نے اس کے مرنے پر ایک رباعی کہی تھی:

شرطست کہ روے دل خراشم، ہمہ عمر
خونابہ بُرخ ز دیدہ پاشم، ہمہ عمر
کافر باشم، اگر بہ مرگِ مومن
چوں کعبہ، سیہ پوش نہ باشم، ہمہ عمر

باتوں اور شعر خوانی میں کسی کو وقت کا خیال نہ آیا۔ آخر مفتی آزردہ مرحوم چونکے اور کہا کہ معاف فرمایئے گا، آپ کی پُر لطف باتوں اور کلام میں وقت کا اندازہ نہ رہا۔ اب اجازت دیجیے۔ اگلے جمعہ کے دن غریب خانے پر مشاعرہ ہے۔ چند دوست جمع ہو رہے ہیں۔ آپ بھی ضرور رنجہ قدم فرمایئے گا۔ نواب محمد مصطفٰے خان اور نواب ضیاء الدین خان آنے کا وعدہ کر چکے ہیں، طرح، اگر بیا نم نمی آید، دا مانم کی آید، طے ہوئی ہے۔ لیکن اس کی قید نہیں، آپ جو چاہیں پڑھیں۔ میرزا صاحب نے جواب دیا کہ میں ضرور حاضر ہونے کی کوشش کرونگا۔ بیزرخشاں برابر سے بولے، تو پھر، وعدہ کرتا

ہوں کہ جمعے کو انھیں ساتھ لیتا آؤنگا۔

تھوڑی دیر میں سب صاحب ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔ جب میدان صاف ہوگیا تو کلو نے آن کر پوچھا کہ آپ اسی جگہ کھانا کھائینگے یا اندر چل کر۔ بولے، میرے لیے تو یہیں لے آؤ۔ یہ چاہیں تو بیشک اندر چلے جائیں۔ میں نے کہا: نہیں میں بھی یہیں کھاؤنگا۔ چنانچہ کلو اور ایاز دونوں، ہمارا کھانا وہیں مردانے میں لے آئے۔ میرزا صاحب نے صرف تین چار شامی کباب، کھٹی میٹھی چٹنی کے ساتھ، نوش جان فرمائے اور اس کے بعد مٹی کے آبخورے سے شراب پینے لگے۔ معلوم ہوا کہ گرمیوں کا معمول ہے کہ ہر شام کلو شراب بوتل سے آبخورے میں ڈال دیتا ہے۔ اگر برف موجود ہوئی تو آبخورہ اس میں رکھ دیا، تاکہ شراب ٹھنڈی رہے، ورنہ لال قند کی صافی، پانی میں تر کرکے آبخورے پر لپیٹ دی جائیگی اور آبخورہ ادھر ہوا میں لٹکتے ہوئے چھینکے پر رکھ دیا جائیگا۔ تاکہ ہوا لگنے سے صافی خشک ہو تو اس سے آبخورہ ٹھنڈا ہوجائے۔

شراب کے ساتھ گھی میں تلے ہوئے نمکین بادام، گزک کے طور پر کھاتے رہے۔ دس بارہ بادام کھائے ہونگے۔ شراب میں برابر کا عرق گلاب ملاتے گئے۔ فرمانے لگے: اس سے شراب کی حدت کم ہوجاتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے یا شام کے قریب، جب چاہا، دو تین گلاس پی لیے۔ بارش کا دن ہوا تو اور زیادہ۔ پھر رات کی معمولی شراب اس کے علاوہ۔ کڑوا کریلا اور نیم چڑھا، مزاج پہلے ہی سے سوداوی تھا، ان بے اعتدالیوں نے اسے اور آگ کا پتلا بنا دیا۔ اب یہ حالت ہے کہ صافی شراب گھونٹ بھر بھی نہیں پی سکتا۔ اس کے پینے سے سینہ جلنے لگتا ہے اور حلق میں کانٹے چبھنے لگتے ہیں۔ اس لیے اسے گوارا بنانے کو اس میں عرق گلاب ملاتا ہوں اور مقدار تو تم دیکھ ہی رہے ہو کہ برائے نام رہ گئی ہے۔ میں نے ایک مقطع میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی، گلاب را

میں نے جرأت کر کے کہا کہ اتنے پینے سے چھوڑ دینا اچھا، ایسے گناہ بے لذت سے حاصل؟ بولے، بھائی، ٹھیک کہتے ہو، لیکن میاں ذوق نے کیا سچ کہا ہے:

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

۳۵۔۴۰ برس کی عادت، اب چھٹے تو کیونکر، بہرحال شرمسار ہوں۔ اسے حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں، لیکن اُس کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ حضرت احمد مصطفےٰ اور امام علی مرتضیٰ کے صدقے میں بخش دے۔ اس کے بعد موضوع بدل گیا۔ دیر تک چہکتے رہے اور آدھی رات کے قریب سونے کے لیے پلنگ پر گئے۔

اگلے دن دوپہر کا کھانا کھا کے میرزا صاحب اندر کی کوٹھری میں چلے گئے۔ مجھ سے فرمایا: یہاں گرمی میں اکیلے بیٹھے کیا کرو گے۔ چاہو، تو تم بھی اندر آجاؤ۔ چنانچہ ہم دونوں کے لیے کلّو نے چارپائیاں بچھوا دیں، اور ہم ان پر دراز ہوگئے۔ فرش پر پانی کا خوب چھڑکاؤ کر دیا گیا تھا۔ کوٹھری کی شرقی سمت گلی میں ایک بڑی سی کھڑکی کھلتی تھی، اس پر خس کی ٹٹی لگی ہوئی تھی۔ کلّو نے ایاز چھوکرے کو مقرر کر دیا کہ وہ ہر آدھ پون گھنٹے کے بعد اس پر پانی ڈالتا رہے۔ میرزا صاحب نے بدن کے سارے کپڑے اتار دیے؛ صرف ایک پاجامہ رہ گیا۔ پلنگ پر لیٹ گئے اور حقہ پیتے رہے۔ کمرے میں پانی کی مرجی اور برف رکھی تھی۔ پیاس محسوس ہوتی، تو اٹھ کر پی لیتے۔ جب عصر کا وقت ہوا اور سایے لمبے ہونے لگے، تو کوٹھری سے نکلے۔

آج فرمایا: دیکھو میاں، دلی کی خصوصیات میں سے ایک مسجد جامع کا شام کا بازار بھی ہے۔ چلو آج تمھیں تماشا دکھا لائیں۔ چنانچہ کلّو کو حکم ہوا کہ پالکی کا انتظام کر دیا جائے۔ کلیان ہمارے ساتھ جائیگا۔ اگر ہماری غیر حاضری میں کوئی صاحب تشریف لائیں، تو انھیں بٹھایا جائے۔ مغرب کے بعد مکان پر پہنچ جائینگے۔

میرزا صاحب نے جامع مسجد کی سیڑھیوں سے پالکی واپس کر دی اور ہم پیدل سیر کرنے لگے۔ ایک ہنگامہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ کہیں بازیگر اپنے کرتب دکھا رہا ہے، یا لوگ اُس کے گرد دیرا باندھے کھڑے ہیں۔ کہیں بھان متی کا تماشہ ہو رہا ہے، اور یہاں بھی ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف، خوانچہ والے طرح طرح کی بولیاں بول رہے ہیں۔ سیڑھیوں پر ہر طرح کی دکانیں سج رہی ہیں۔ چلتے چلتے میرزا صاحب ایک جگہ رُک گئے، اور کلیان سے کہا جاؤ گھمن کی دکان سے رات کے لیے چار آنے کے سیخ کے کباب لے آؤ۔ وہ دونے میں کباب رکھوا لایا۔ میں نے راستے میں ایک جگہ سے دو تین کتابیں خریدیں اور میرزا صاحب نے بچّوں کے لیے کچھ کھلونے اور مٹھائی خریدی۔ واپسی میں چاندنی چوک کے راستے سے ٹہلتے ہوئے آئے۔ سعادت خان کی نہر سڑک کے بیچوں بیچ تھی۔ دورویہ درختوں کی قطار اور دکانوں کی روشنی کا پانی میں عکس، عجیب پرلطف نظارہ تھا۔ دن بھر کی گرمی سے طبیعت جتنی گھبرائی ہوئی تھی، اتنی ہی اس وقت شام کی سُہانی فضا میں محظوظ ہوئی۔ سینکڑوں آدمی نہر کے کنارے بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ میں بھی اگر اکیلا ہوتا، تو شاید وہیں کسی جگہ بیٹھ جاتا۔ لیکن میرزا صاحب کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی کہ نہ معلوم، کون کون ان صاحب انتظار کر رہے ہونگے۔ اس لیے ان کے ساتھ واپس آ گیا۔

جمعے کے دن شام کے کھانے کے بعد نواب ضیاء الدین خان کہ قریب ہی قاسم جان کی گلی میں رہتے تھے۔ اپنے ہاتھی پر سوار ہو کر آ گئے۔ اور کہا کہ چلیے حضور، صدرُ الصدور کے مشاعرے میں۔ چنانچہ ہم دونوں بھی سوار ہو گئے۔ راہ میں سے نواب شیفتہ کو کوچہ چیلان سے ساتھ لیا اور یوں لدے پھندے ہم سب مفتی صاحب کے مسکن محلہ چتلی قبر میں پہنچے۔ دیکھا کہ وہاں اچھا خاصا مجمع ہو چکا ہے۔ قلعے سے بعض شہزادے بھی آئے ہوئے تھے۔ جن میں سے میرزا خضر سلطان، میرزا الٰہی بخش اور شاہ شاگی، میرزا محمد قویش واقف، میرزا نورالدین شاہی اور میرزا عالی بخت عالی کے نام خاص طور پر

قابل ذکر ہیں۔ ایک عجیب بات دیکھی کہ سب شہزادوں کا ایک سا حلیہ اور ایک سی وضع اور ہر ایک کے ہاتھ میں بٹیر تھی۔ ان میں سے بیشتر "حافظ جیو" عبدالرحمن احسان مرحوم اور شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے۔ خود استاذ ذوق بھی موجود تھے۔ داغ اور ظہیر اور محمد حسین آزاد تھے صہبائی اپنے شاگردوں کے ساتھ آئے تھے۔ میرزا غالب کے شاگردوں میں سے قربان علی بیگ خان سالک، جواہر سنگھ جوہر، غلام حسن خان محو، یوسف علی خان عزیز اور بعض دوسرے اصحاب موجود تھے۔ ایک ولایت آمدہ شاعر سحابی بھی شریک مجلس تھے۔

مشاعرہ دس ساڑھے دس بجے کے قریب شروع ہوا۔ پہلے اردو کے شاعروں نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ ان میں سے بعض کا کلام واقعی بہت پختہ اور دلنشین تھا۔ اساتذہ نے بھی بخل سے کام نہ لیا اور ان کا دل بڑھانے کو خوب داد دی۔ خصوصاً داغ اور سالک اور ظہیر کی غزلوں کی بہت تعریف ہوئی۔ اخیر میں اساتذہ کی باری آئی۔ اب نوجوان اور نو آموز طبقہ خوشی سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے آزردہ نے کہ میزبان اور صاحب خانہ تھے، اپنی غزل سنائی۔ غالب اور صہبائی اور ذوق سب نے بہت تعریف کی اور آزردہ نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ ان کے بعد نیر رخشاں، شیفتہ، صہبائی وغیرہ نے اپنا کلام سنایا۔ آخر میں شمع میرزا غالب کے سامنے آئی۔ انھوں نے پہلے ایک غیر طرحی غزل سنائی۔ اس کے تین چار شعروں کی بہت تعریف ہوئی تھی:

ہر چہ فلک نخواستست ہیچ کس از فلک نخواست
ظرف فقیہ مے نجست، بادہ ما گزک نخواست

جاہ ز علم بیخبر، علم ز جاہ بے نیاز
ہم محک تو زر ندید، ہم زر من محک نخواست

رند ہزار شیوہ را، طاعت حق گراں نہ بود
لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

آخری شعر پر آزردہ تڑپ اُٹھے۔ اس کی خاص طور پر داد دی اور اسے دو تین بار پڑھوایا۔ اس کے بعد میرزا صاحب نے طرحی غزل سنائی، جس کے چند شعر میرے حافظے میں محفوظ رہ گئے ہیں:

چہ عیش از وعدہ، چوں باور ز عنوانم نمی آید
بنوعے گفت: می آیم، کہ می دانم، نمی آید

گزشتم، نالاں کہ بر زخم دل صد پارہ خوں گرید
خود اُو را خندہ بر چاک گریبانم، نمی آید

روش بشکستہ و در سایۂ دیوار نشستہ
بکویش، رشک بر مہر درخشانم، نمی آید

دعاے خیر شد، در حق من، نفریں بجا کردن
ز نفریں بس کہ می رنجد، بہ بیجانم، نمی آید

دلش خواہد، کہ تنہا سوے من روئے آورد، لیکن
فریب ہمرہاں، دانم، ز نادانم، نمی آید

دبیرم، شاعرم، رندم، ندیمم، شیوہ ہا دارم
گرفتم رحم بر فریاد و افغانم نمی آید

ندارم بادہ غالب گر سحرگاہش، میسراہے
بہ بینی مست، دانی، کز شبستانم نمی آید

سب شعروں کی خوب خوب داد ملی۔ پڑھنے کا انداز یہ تھا کہ انھوں نے ساری غزل ہلکے ترنم سے پڑھی۔ پہلی بار مصرع اولیٰ ایک بارگی پڑھ جاتے پھر اسے آہستہ آہستہ دہراتے اور ایک لمحہ کے توقف کے بعد اسی لہجے میں دوسرا مصرع سناتے۔ جب کوئی صاحب داد دیتے یا مصرع اٹھاتے تو میرزا صاحب کا داہنا ہاتھ بے اختیارانہ تھوڑا تھوڑا سا اٹھ جاتا اور بس، ورنہ یوں وہ نہایت دلجمعی سے اپنی جگہ پر بیٹھے رہے اور پہلو تک نہیں بدلے۔

میرزا غالب کی غزل کے ساتھ مشاعرہ ختم ہوا اور اس کے بعد حاضرین ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ آزردہ نے سب صاحبوں کا شکریہ ادا کیا۔ ہم بھی چار ساڑھے چار بجے کے قریب واپس مکان پر آئے۔

یہ آٹھ دس دن جو میں مرزا صاحب کے مکان پر رہا مجھے کبھی نہیں بھولینگے۔ چونکہ میں جس کام سے آیا تھا وہ ختم ہو چکا تھا اس لیے میرزا صاحب سے اجازت لے کر آگرے چلا گیا۔

۳

اس کے بعد میں لگ بھگ دو برس تک دلّی نہ آسکا۔ اب کے میرا ۱۸۵۵ء میں آنا ہوا۔ میرزا صاحب ابھی تک اسی بلی ماروں والے مکان میں رہتے تھے۔ میں شام کے قریب پہنچا تھا۔ وہ بہت لطف اور مہربانی سے ملے۔ ان سے مل کر میں اندر گیا جناب بیگم صاحب کی خدمت میں بندگی عرض کی۔ انھوں نے دعا دی۔ سفر کا پوچھتی رہیں کہ کہو، راہ میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ اس کے بعد میں باہر آیا۔ میرزا صاحب دیر تک حضرت والد صاحب قبلہ اور اپنے دوسرے ملنے والوں کی باتیں کرتے رہے۔ پھر پوچھا، سناؤ کاروبار کا کیا حال ہے؟ میں نے کہا کہ مندا تو ہے لیکن شکر ہے، بھلی بری گزران ہوتی جاتی ہے۔ کسی کا کچھ دیتا نہیں، یہی غنیمت ہے۔

اس تین چار برس میں میرزا صاحب کی ظاہری شکل و صورت میں بہت فرق آگیا تھا۔ پہلی بار جب لے میں تو داڑھی گھٹی ہوئی تھی۔ اب چھوڑ رکھی تھی۔ لیکن اس کے بالعکس سر منڈا ہوا تھا۔ سامنے کے دو دانت ندارد، اس لیے آواز ہلکی ہو گئی تھی۔ کمر میں بھی خفیف سا خم آگیا تھا۔ غرض میں نے انھیں جسمانی لحاظ سے بہت کمزور پایا۔ البتہ طبیعت میں وہی پہلی سی چستی اور گفتگو میں شوخی موجود تھی۔

ان دنوں موسم کچھ عجیب طرح کا تھا۔ اگرچہ دن گرمیوں کا زمانہ ختم ہو چکا تھا، لیکن پھر بھی دن کو سخت گرمی پڑتی تھی۔ البتہ رات کو اچھی خاصی سردی ہو جاتی تھی۔ اس لیے وہ حسب معمول دوپہر کے بعد اندر کی کوٹھری میں گزارتے تھے۔ ایک دن کا واقعہ ہے، یہی کوئی تین کا عمل ہوگا۔ ہم ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے لطف لے رہے تھے کہ باہر دروازے پر کچھ شور ہوا۔ اس کے ساتھ ہی کھٹ سے دروازہ کھلا۔ آگے آگے حسین علی خان اور اس کے پیچھے باقر علی خان اور ان دونوں کے پیچھے مغلانی۔ حسین علی خان بھاگا چلا آرہا تھا اور ساتھ ساتھ چیختا بھی جاتا تھا۔ اس کے ہاتھ

میں کوئی لکڑی کا کھلونا تھا۔ معلوم ہوا کہ باقر علی خان چاہتا ہے کہ حسین علی خان اسے یہ کھلونا دے دے اور وہ دینا نہیں چاہتا۔ بس اس پر کٹا چھنی ہو گئی۔ بیگم صاحب گھر پر نہیں تھیں، اس لیے حسین علی خان، پناہ مانگنے کو دادا جان کے پاس دوڑا آیا تھا۔ ہمارے پلنگ کچھ ایسے اونچے نہیں تھے۔ حسین علی خان دوڑا دوڑ آیا اور میرزا صاحب کے پلنگ پر چڑھ گیا۔ وہ باہر مٹی اور گرد و غبار میں کھیلتا آیا تھا، کمرے میں پانی کا چھڑکاؤ ہو رہا تھا۔ اس سے اس کے پاؤں گیلے ہو گئے۔ اس کے اوپر چڑھنے سے سفید چادر پر جو گلکاری ہوئی، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ میرزا صاحب نے جو ڈانٹا، تو بڑا لڑکا باقر علی خان تو غائب ہو گیا، لیکن حسین علی خان وہیں پلنگ پر بیٹھا مچلنے اور بسورنے لگا۔ چونکہ جو ہونا تھا، وہ تو ہو ہی چکا تھا، اس لیے میرزا صاحب نے خیال کیا کہ اب خفا ہونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ چنانچہ انھوں نے بچّے کو چمکارا اور پیار کیا۔ پھر مغلانی کو آواز دی اور اسے اس کے حوالے کیا۔ کلّو سے بستر کی چادر بدلوائی اور دوبارہ لیٹ گئے۔

چند لمحے بعد کہنے لگے: تم سے ایک دل کی بات کہوں۔ میں اس خانہ داری سے کبھی خوش نہیں رہا جب میری شادی ہوئی ہے تو مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ شادی کہتے کسے ہیں اور اس کے جھنجھٹ اور ذمّہ داریاں کیا ہیں۔ خیر اس کا کیا غم، کیونکہ اگر معلوم بھی ہوتا، تو میں کیا کر سکتا تھا۔ ہمارے بزرگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اولاد کا اپنی شادی بیاہ کے بارے میں بولنا پرلے سرے کی بے حیائی ہے۔ میں ٹھہرا قلندرانہ وضع کا آدمی۔ میری یہ آرزو کہ ایک شطرنجی اور لوٹا کندھے پر ڈالوں۔ لکڑی ہاتھ میں لوں اور پیادہ پا چل نکلوں۔ آج یہاں، کل وہاں، ملکِ خدا تنگ نیست، پائے گدا لنگ نیست۔ اور یہ قبیلہ داری کے تمام اصولوں کے خلاف۔ خدا نے اولاد دی اور لے لی۔ غم کسے نہیں ہو گا کہ یہ قدرتی امر ہے لیکن دم مارنے کی مجال نہیں تھی، میں نے اس پہ صبر شکر کیا کہ یوں بھی تنہائی میری آزاد طبیعت کے منافی نہیں تھی۔ غرض لشتم پشتم

گذرتی جا رہی تھی۔ لیکن قدرت بڑی ستم ظریف ہے۔ اس نے کہا، ذرا ٹھہر تو جا، تو کیا سمجھے بیٹھا ہے۔ تین برس ہوئے، پہلے زین العابدین خان کی بیوی مری۔ اور پھر وہ آپ بھی چل بسا۔ حسین علی خان کو میری بیوی یہاں لے آئی۔ بڑا بھائی اپنی دادی کے پاس چلا گیا۔ چند مہینے ہوئے وہ نیک بخت بھی جنت سدھاری اور باقر علی خان بھی یہاں آگیا۔ اسے کہتے ہیں، غم بداری ابز بجز۔ کہو بے مروتی کر کے کسی سے کہوں کہ تو ان بچوں کو لے لے۔ میں اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا، حالانکہ یہ حقیقت ہے۔ بس چپ چاپ، قضا و قدر کی شعبدہ بازی کا تماشا دیکھ رہا ہوں۔ غرض اسی طرح دلسوزی کی باتیں کرتے کرتے چپ ہو گئے۔ میں نے غور کر کے سنا تو زیرِ لب یہ شعر گنگنا رہے تھے:

نہ شامِ ما را سحر نوید ے نہ صبحِ ما را دم سپید ے
چو حاصلِ ماست نا امیدی، غبارِ دنیا بفرقِ عقبےٰ

اگلے دن صبح کے وقت بریلی سے قاضی عبد الجلیل جنون کے بھیجے ہوئے آموں کے دو ٹوکرے پہنچے۔ میرزا صاحب نے قاضی صاحب کے ملازم کو جو ٹوکرے لایا تھا، انعام دیا اور ٹوکرے اپنے سامنے کھلوائے۔ کچھ آم راستے میں خراب ہو گئے تھے وہ پھکوا دیے۔ دس دس آم دو جگہ نواب مصطفےٰ خان اور نواب ضیاء الدین خان کے ہاں بھجوائے۔ اور باقی کو ٹھنڈے پانی کی ناند میں رکھوا دیا۔ تیسرے پہر، گھر کے سب لوگ آم کھانے کے لیے جمع ہو گئے۔ سب نے خوب سیر ہو کر کھائے۔ میرزا صاحب نے جلد ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ میں نے کہا: حضرت، یہ کیا؟ کہنے لگے: سچ کہوں، نیت نہیں بھری، مگر بھائی کیا کروں۔ معدے میں ہضم کی وہ پہلی سی طاقت نہیں رہی۔ ہائے کیا دن تھے جوانی کے عالم میں کہ طبیعت میں جوش تھا اور صحت برقرار تھی۔ عصر کے قریب آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ اپھر جاتا تھا۔ اور دم پیٹ میں نہیں سماتا تھا۔ اب آم کھانے کا کیا مزا۔ نہ منہ میں داشت، نہ پیٹ میں آنت۔ کھاؤں، تو ہضم کیسے کروں۔ جوانی کیا گئی کہ زندگی کا لطف جاتا رہا۔

ایک دن بڑا دلچسپ لطیفہ ہوا جب ہم دونوں دیوان خانے میں جا کے بیٹھے، تو میں نے دیکھا کہ ان کے کمر بند میں نو دس گرہیں لگی ہوئی ہیں۔ میں حیران کہ الٰہی، یہ کیا ماجرا ہے۔ پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ شاید رات بیخبری کے عالم میں انھوں نے یہ گرہیں لگائی ہوں، کیونکہ بعض لوگوں کو ایک قسم کی بیماری ہوتی ہے کہ وہ سوتے میں کوئی کام کرتے ہیں اور انھیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ لیکن مجھے مذاق کی سوجھی۔ میں نے ان سے کہا "قبلہ، کیا رات کو تسبیح پھیرتے رہے ہیں؟" کہنے لگے "نہیں تو لیکن کاغذ قلم لو اور لکھتے جاؤ" میں نے حکم کی تعمیل کی اور انھوں نے کمر بند کی پہلی گرہ ٹٹولنا شروع کی۔ پھر فرمایا لکھو مطلع:

اے ذوقِ نوا سنجی، بازم بخروش آور
غوغائے شبیخونے، بر بنگہِ ہوش آور

اور اس کے بعد گرہ کھول دی۔ اس طرح انھوں نے مجھے پوری غزل لکھوائی۔ ہر ایک شعر کے بعد وہ ایک گرہ کھول دیتے، حتیٰ کہ نو کی نو گرہیں کھل گئیں اور غزل مکمل ہوگئی۔ خیر، غزل تو میں نے لکھ لی، لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں تھی کہ یہ کیا طلسم ہے۔ وہ بھی میری کیفیت کو بھانپ گئے۔ پہلے تو ہنستے اور میری بدحواسی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ پھر بولے: بات اصل میں یہ ہے کہ رات جب بستر پر جاتا ہوں تو کبھی کبھی طبیعت شعر گوئی پر مائل ہو جاتی ہے۔ اب تو ایک مدت سے یہ شوق ہی چھوٹ گیا ہے، ورنہ ایک زمانہ تھا کہ میں دن میں شعر کہتا ہی نہیں تھا۔ عام طور پر رات کو سرخوشی کے عالم میں فکر کیا کرتا تھا۔ اب بھلا اس وقت کون اٹھ کر روشنی کا انتظام کرے اور لکھنے کا سامان ڈھونڈے۔ میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب شعر ہو جاتا، تو کمر بند میں ایک گرہ لگا لیتا۔ اس طرح دس دس، بارہ بارہ گرہیں تک لگا کے سو رہتا۔ صبح کو اٹھتا اور ٹٹول ٹٹول کر حافظے سے نکال کے شعر قلمبند کر لیتا۔ اب تو مہینوں اور برسوں گذر جاتے ہیں، کوئی تازہ فکر ہوتی ہی نہیں۔ رات یونہی یہ زمین خیال

میں آگئی۔ طبیعت نے راہ دی اور میں نے غزل پوری کرلی۔ پرانی عادت کے مطابق گر بنہ کا سہارا لیا۔ اگرچہ مجھے اندیشہ تو تھا کہ کہیں یہ نسیان کی نذر نہ ہو جائے، لیکن اور کر بھی کیا سکتا تھا! تاہم تم نے دیکھا کہ پورے نو کے نو شعر یاد آگئے اس سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ جوانی کے دنوں میں کیا کیفیت تھی۔ اچھا اب قلم دوات اور کاغذ میری طرف بڑھاؤ۔ نواب انوار الدولہ بہادر اور منشی نبی بخش کو خط لکھوں اور یہ غزل ان کی خدمت میں تحفہ بھیجوں۔ آج ان دونوں صاحبوں سے زیادہ کوئی اور، اس کلام کا مستحق نہیں۔

وائے بر جانِ سخن، گر بہ سخن داں نرسد!

خاص طور پر منشی نبی بخش کہ سخن فہمی اس بزرگوار کا حق ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ جب تک میں نے انھیں نہیں دیکھا، مجھے ٹھیک طور پر یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ شعر گوئی اور شعر فہمی میں کتنا بعید فرق ہے۔ جب تک یہ غزل ان دونوں صاحبوں کے پاس نہیں پہنچ جائے، مجھے چین نہیں آئیگا۔

اس کے بعد انھوں نے خط لکھے اور لفافوں پر پتے لکھ کر رکھ دیے۔ تھوڑی دیر میں کلّو آیا۔ اس نے خط لفافوں میں ڈالے، بند کر کے ٹکٹ لگائے اور ڈاکخانہ چلا گیا۔

شیخ ابراہیم ذوق، نومبر ۱۸۵۴ء میں خدا کو پیارے ہوئے۔ حضرت ظلِ سبحانی ۴۶، ۴۷ برس ان سے اصلاح لیتے رہے تھے۔ اتنی لمبی مدّت کی دوستی اور محبت۔ صدمہ ہوا ہی چاہیے۔ انھوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا۔ لیکن بنھ نہ سکی۔ شاہی خاندان میں شعر و شاعری اور علم و ادب کا مذاق شروع سے تھا، لیکن اوّل اوّل یہ ذوق کچھ دیا دبا سا رہا۔ وہ لوگ تلوار کے بھی دھنی تھے، نری باتیں ہی بنانا نہیں جانتے تھے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، تلوار کو نیام میں زنگ لگنے لگا، اور اس کی جگہ قلم نے لے لی۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ آخری زمانے میں قلم ہی قلم رہ گیا اور تلوار اٹھا کے طاق پر رکھ دی گئی۔ ظفر کی بھی یہی حالت تھی۔ شاعری تو گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ملک ہندستان

کی بادشاہی تو برائے نام رہ گئی تھی، لیکن ملک سخن کی تاجوری بیشک ان کے حصے میں آئی۔ اتنے زمانے کا شوق، ممکن نہ تھا کہ وہ زیادہ دن خاموش رہ سکتے۔ چنانچہ انھوں نے پھر شعرگوئی شروع کر دی اور اب کے اصلاح کا فرض میرزا غالب کے سپرد ہوا۔ میرزا صاحب کا دستور یہ تھا کہ قیلولے کے بعد عصر کے وقت، جہاں پناہ کی غزلیں بناتے تھے۔ ایک دن جب کام سے فارغ ہو چکے تو میں نے کہا: قبلہ، میں نے آج تک حضرت ظل اللہ کو قریب سے نہیں دیکھا، دیکھنے کی بڑی تمنا ہے۔ کہنے لگے، یہ کیا مشکل ہے۔ میں نے پوچھا، وہ کیسے؟ فرمایا: آج کل روزانہ شام کو نور گڈھ کے پاس، جمنا کی ریتی میں، پتنگ بازی ہوتی ہے۔ ایک طرف قلعۂ معلیٰ کے بادشاہی پتنگ باز ہوتے ہیں، دوسری طرف ناظر حسین مرزا کے ساتھی۔ آج جہاں پناہ نے حکم دیا تھا کہ تم بھی وہاں آیا کرو۔ اب کہو، حکم حاکم، جانا ہی پڑیگا۔ لیکن آج تو نہیں، البتہ کل سے جاؤنگا۔ تم بھی چلنا، میرے ساتھ ساتھ رہنا، اور جی بھر کے دیکھ لینا۔

اگلے دن سہ پہر کو میرزا صاحب سو کر اٹھے۔ منہ ہاتھ دھویا اور پالکی میں سوار ہو گئے، میں پیدل ساتھ ہو لیا۔ نور گڈھ کچھ دور تو تھا ہی نہیں، تھوڑی دیر میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ دیکھا تو بلامبالغہ سینکڑوں پتنگ باز جمع ہو رہے ہیں اور ہزاروں تماشائی اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ جہاں مجمع ہو، وہاں بھلا خوانچے، پھیری والے کیسے نہ پہنچیں اور پھر منگتوں کو کون روک سکتا ہے۔ گُرے اور اچُریاں، چھوٹے چھوٹے بچوں کو انگلی سے لگائے، ہر آیندہ و روند سے بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ غرض کہ یہاں ایک نئی دنیا آباد ہو گئی تھی۔ قسم قسم اور رنگ برنگ کے پتنگ اور تکل آسمان میں ایسے معلوم ہوتے تھے، جیسے کوئی بہت بڑا رنگین اور پھولدار قالین ہوا میں اِدھر سے اُدھر اُڑ رہا ہو۔

اعلیٰ حضرت کو میں نے پہلی بار اتنی نزدیک سے دیکھا۔ لمبوترا چہرہ، پتلی ستواں ناک، چوڑی پیشانی، چھوٹی چھوٹی بھویں، نہایت تیز اور بڑی بڑی بھوری آنکھیں، چوڑا دہانہ،

نیچے کا ہونٹ نسبتہً نمایاں اور اس پر پان کا لاکھا جما ہوا۔ کلے صاف اور ٹھوڑی پر دو ڈھائی انگل کی سفید براق ڈاڑھی۔ شرعی خشخاشی لبیں۔ قد میانہ اور سینہ چوڑا تھا۔ لیکن شانے تنگ اور ڈھلوان تھے۔ رنگ خاصا سانولا تھا۔ حالانکہ سن مبارک اس وقت اسی سے اوپر تھا، اس کے باوجود چہرے مہرے سے چستی کا اظہار ہوتا تھا۔ انھیں دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں کسرت کا شوق رہا ہے۔ چنانچہ ان کی جوانی میں مشہور تھا کہ ہندستان بھر میں ڈھائی شہسوار ہیں۔ ایک یہ، ایک ان کے چھوٹے بھائی میرزا جہانگیر اور آدھے کوئی اور بزرگوار۔ لباس میں نیچے قبا تھی۔ اور اس کے اوپر چار قب۔ سر پر دستار اور دستار کے اوپر گوشوارہ، جیغہ، سرپیچ اور تاج شاہی۔ اس پر تین طرے، گلے میں موتیوں کا کنٹھا اور ایک سو ایک موتی کا مالا، بازوؤں پر جھبجھ بند اور نورتن۔ ہاتھ میں موتیوں کی سمرن۔ زرنگار چوکی پر آلتی پالتی مارے تشریف فرما تھے۔ اس وقار اور متانت کی مورت دیکھنے سے مجھ پر جو دہشت طاری ہوئی تھی، اب میں اس کا بیان نہیں کر سکتا۔

آگے پیچھے شہزادوں اور سلاطینوں اور امیروں وزیروں کا جمگھٹا تھا۔ چند سر برآوردہ حضرات بیٹھے تھے، باقی سب مرتبے سے اپنی اپنی جگہ پر کھڑے تھے۔ بعض شہزادے بھی پتنگ اڑا رہے تھے اور حضور والا سیر دیکھ رہے تھے۔ میرزا خضر سلطان بھی انہی لوگوں میں تھے، جو پتنگ اڑا رہے تھے۔ اتنے میں ان کا پتنگ کسی سے پیچ لڑ گیا۔ وہ گھبرا کر کھینچ کرنے لگے۔ میرزا صاحب نے ان سے کہا: صاحب عالم! یہ موقعہ کھینچ کا نہیں، بلکہ ڈھیل کا ہے۔ اس پر انھوں نے ڈھیل چلائی۔ جب دیکھا کہ ڈوبتے ڈوبتے پتنگ بہت دور نکل گئے ہیں، تو میرزا صاحب نے ان سے کہا کہ دو چار ٹھمکیاں دے کر دیکھیے تو کہ مخالف کا کیا ارادہ ہے۔ انھوں نے ایک آدھ ہی ٹھمکی دی ہو گی کہ دوسرا پتنگ چکرانے لگا۔ میرزا صاحب نے شہزادے سے کہا کہ اب اگر آپ پھرتی سے جھٹکا دیں، تو مخالف سنبھل نہیں سکیگا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ انھوں نے ایک ہی جھٹکا دیا تھا کہ

دوسرا پتنگ کٹ گیا۔

اعلیٰ حضرت اس پر بہت مسرور ہوئے۔ لطف سے فرمایا: اماں، میرزا صاحب! ہم نہیں جانتے تھے کہ آپ اس فن میں بھی طاق ہیں۔ یہ ادب سے بولے: پیر و مرشد! خود ستائی ہوتی ہے، ورنہ کہوں کہ یہ خانہ زاد کیا نہیں جانتا! مجھے بھی کسی زمانے میں پتنگ اڑانے کا بہت شوق تھا! بلکہ میں نے نہایت ابتدائی زمانے میں پتنگ کے تلازمے سے مثنوی کے طور پر چند شعر بھی کہے تھے۔ حضورِ والا بولے: اچھا، اچھا، ہمیں بھی سنائیے تو۔ میرزا صاحب نے گزارش کی۔ عالم پناہ، جان کی امان پاؤں، صرف چند شعر ہیں اور وہ بھی نہایت ابتدائی مشق، سُننے سنانے کے لائق نہیں۔ حضور نے مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا کچھ پروا نہیں، ہم سنینگے۔ اس پر میرزا صاحب کہنے لگے۔ الامر فوق الادب: بنظرِ اصلاح ملاحظہ ہوں۔ پھر یہ چند شعر تحت اللفظ سُنائے:

ایک دن مثلِ پتنگِ کاغذی — لے کے دل سر رشتۂ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کَنیانے لگا — اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
میں کہا، اے دل! ہوائے دلبراں — بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زیاں
پیچ میں ان کے نہ آنا زینہار — یہ نہیں ہینگے، کسو کے یارِ غار
گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر — کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائیگی تیری ان سے سانٹھ — لیکن آخر کو پڑیگی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہوگا سُلجھانا تجھے — قہر ہے، دل ان سے اُلجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے — بھول مت اس پر اُڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو لڑا دینگے کہیں — مفت میں ناحق کٹا دینگے کہیں
دل نے سن کر کانپ کر کھا پیچ و تاب — غوطے میں جا کر دیا کٹ کر جواب
"رشتۂ در گردنم افگندہ دوست — می برد، ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست"

اعلیٰ حضرت بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ پتنگ کے لیے اس شعر کی تضمین بھی کسی کو نہیں سوجھی ہوگی۔ میرزا صاحب نے جھک کر شکریہ ادا کیا۔ چونکہ دیر ہو چلی تھی اور شام کی ہوا میں خنکی ہوتی جا رہی تھی، اس لیے حضرت بادشاہ سلامت، واپسی کے لیے مغرب کے قریب تخت رواں پر سوار ہو گئے اور سب کو واپس جانے کی اجازت دی۔ ہم بھی چراغ جلے مکان پر پہنچے۔ میرزا صاحب بہت تھک گئے تھے۔ گھر پہنچتے ہی انھوں نے تین چار شامی کباب نوش فرمائے، شراب پی اور پڑ رہے۔

اس کے دو دن بعد میں آگرے چلا گیا۔

۴

اس کے دو برس بعد غدر کا ہنگامہ ہوا۔ کچھ معلوم نہ ہوا کہ دلی اور دلی کے احباب پر کیا گزر گئی۔ جب فساد کی آگ فرو ہوئی، تو والد صاحب قبلہ نے مجھ سے کہا کہ بیٹا جاؤ اور میرزا صاحب کی خیر و عافیت کی خبر لے آؤ۔ چنانچہ میں دلی آیا۔ یہ ۱۸۵۸ء کے شروع کا ذکر ہے۔ ابھی تک شہر میں پورا امن نہیں ہوا تھا۔ گرفتاریوں کا سلسلہ جاری تھا۔ آئے دن کسی نہ کسی ہندوستانی امیر کی گرفتاری یا نظر بندی، ضبطیِ جائداد یا پھانسی کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ شہر میں باہر سے آنے جانے پر بھی پابندیاں تھیں اور باہر سے آنے والوں کو شہر کے فوجی حکام سے خاص ٹکٹ لینا پڑتا تھا۔ میں نے بھی دو دن ٹھہرنے کا ٹکٹ لیا۔ سہ پہر کو دلی پہنچا اور سیدھا بلی ماراں میں مرزا صاحب کے مکان پر چلا گیا۔

شام کو مرزا یوسف علی خان عزیز اور منشی ہیرا سنگھ درد اور پنڈت شیوجی رام آن پہنچے۔ مرزا یوسف علی خاں اپنے والد میرزا نجف علی خان کی وفات کے بعد مستقل طور پر دلی آ رہے تھے اور ان دنوں اسی محلے میں میرزا صاحب کے مکان کے قریب ہی ایک ہندو امیر کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ وہیں محلے کے کچھ اور بچے بھی ان سے تعلیم پاتے تھے۔ اس طرح گویا مکتب کا سا طور ہو گیا تھا۔ منشی ہیرا سنگھ درد، میرزا صاحب کے پرانے دوست اور مہربان، ماسٹر پیارے لال کے چھوٹے بیٹے تھے۔ حوض قاضی کے پاس

گندی گلی میں رہتے تھے۔ یہ اور ان کے بڑے بھائی منشی جواہر سنگھ جوہر (تحصیلدار صاحب) دونوں میرزا صاحب کے شاگرد تھے۔

اسی زمانے میں آگرے سے میرزا حاتم علی مہر نے اپنی مثنوی "شعاع مہر" میرزا صاحب کی خدمت میں بھیجی تھی۔ میرزا اسے بلند آواز سے پڑھتے رہے اور ہم سب سنتے اور لطف اندوز ہوتے رہے۔ غرض رات گئے تک ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں۔

اگلے دن شام کے قریب ہم دیوانخانے میں بیٹھے تھے کہ ڈاک کا ہرکارہ ایک رجسٹری خط لایا۔ میرزا صاحب نے کھولا تو معلوم ہوا کہ میرزا تفتہ نے سو روپے کی ہنڈوی اپنے استاد کی خدمت میں بھیجی ہے۔ میرزا صاحب نے ہنڈوی صحیح کر کے کلیان کے حوالے کی اور اسے بنیئے کے کٹڑے میں کسی مہاجن کے ہاں بھیجا۔ جانے آنے کی دیر ہوئی وہ جا کے روپیہ لے آیا۔ انھوں نے پچاس روپے اندر محل میں بھیج دیے۔ کلو داروغہ نے پچیس روپے کے لگ بھگ، دست گردان ادھار لیا تھا، وہ اسے دیے اور باقی ہم اپنے بکس میں رکھ لی۔ فرمانے لگے: رات تم نے دیکھا، منشی ہیرا سنگھ اور پنڈت شیوجی رام آئے ہوئے تھے۔ اب جب سے میرزا یوسف علی خاں یہاں آگئے ہیں، یہ بھی دن رات کا اکثر حصہ یہیں گزارتے ہیں، ورنہ صرف یہ دونوں صاحب باقاعدہ آتے رہتے ہیں۔ کتنا کثیر الاحباب شخص تھا، کوئی وقت نہیں جاتا تھا، جب دو چار دوست میرے پاس موجود نہ ہوں، بلکہ اکثر میری غیر حاضری میں بھی دیوانخانہ خالی نہیں ہوتا تھا۔ یا اب یہ حال ہو گیا ہے کہ اس ہنگامے میں اگر یہ دو تین صاحب بھی یہاں نہ ہوتے تو میں گویا شہر میں نہیں، کسی ویرانے میں رہتا تھا۔ شہر میرے ملنے والوں سے خالی ہو گیا، نہ کوئی میرے پاس آنے والا یہاں موجود، نہ میں کسی کے پاس جا سکوں۔ زندہ ہوں، مگر زندگی دوبھر ہو گئی۔ نو دس مہینے سے پنشن بند ہے! کہو یہ سارا زمانہ کیسے گزرا ہوگا۔ خدا جیتا رکھے، برخوردار تفتہ کو، اس نے یہ سو روپے بھیج کر جلا لیا ہے۔ ابھی نہیں معلوم، اور کیا کچھ دیکھنا نصیبوں میں لکھا ہے۔ خیر یہ بھی جو ل

تو ں کٹ جائیگی:

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب!
خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیے

اس زمانے میں ان کی سرکاری پنشن بند تھی۔ قلعے کی تنخواہ تو بند ہونا ہی چاہیے تھی۔ اس لیے بہت تنگی ترشی سے گزارا ہوتا تھا۔ حضرت والد صاحب قبلہ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ موقع دیکھ کے انھیں آگرے آنے کی دعوت دینا۔ میں نے سوچا کہ اس سے بہتر موقع نہیں ملنے کا۔ اس لیے میں نے عرض کیا کہ ابھی یہاں کی حالت خطرے سے خالی نہیں۔ آپ چند دن کے لیے آگرے تشریف لے چلیے۔ وہاں خدا کے فضل سے آپ کا اپنا گھر ہے۔ عزیز اقارب، دوست احباب موجود ہیں۔ آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ پھر جب امن وامان ہوگیا، تو واپس چلے آئیے۔ فرمانے لگے: یہ ٹھیک ہے کہ حالت یہاں کی تشویشناک ہے، لیکن مجھے اپنی بیگناہی پر بھروسا ہے۔ میں فراری یا روپوش نہیں۔ میرے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہوا۔ کسی نے میری مخبری نہیں کی۔ انگریزی حکام میری شہر میں موجودگی سے واقف ہیں۔ اکتوبر سال گزشتہ کرنیل براؤن صاحب کے سامنے حاضر ہوا تھا اور انھیں کی اجازت سے یہاں مقیم ہوں۔ اس لیے اگر خطرے کی بات ہوتی، تو اب تک معلوم ہوگیا ہوتا۔ بیشک قلعے کے ملازموں پر شدت ہے، لیکن خاص طور پر انہی لوگوں پر، جو اس ہنگامے کے دوران میں نئے نئے وابستہ ہوئے تھے۔ میں تو آٹھ دس برس سے تاریخ لکھنے پر مقرر تھا اور تین چار برس سے شعروں کی اصلاح کی خدمت بھی بجالاتا رہا۔ یہ ٹھیک ہو کہ میں نے ان دنوں میں قلعے سے اپنے تعلقات بالکل قطع نہیں کرلیے، لیکن بھائی سوچو تو، یہ کر بھی کیسے سکتا تھا! اگر تلنگوں کو میرے بارے میں کسی قسم کا شبہہ بھی ہوجاتا، تو میری اور میرے اہل وعیال کی تکا بوٹی کرڈالتے۔ اس لیے وہاں جاتا بھی رہا اور اصلاح کا کام بھی بدستور کرتا رہا۔ لیکن یہ کوئی نئی بات تو نہیں تھی، بلکہ خیال کرو تو یہ مزدوری تھی،

پیٹ پالنے کے لیے اور حیلہ تھا جان بچانے کے لیے۔ اس میں شک نہیں کہ میں نے انگریزی کوئی خاص خیرخواہی نہیں کی، لیکن میرا مقدور ہی کیا تھا کہ میں کچھ کر سکتا۔ بس خاموش بیٹھا انتظار کر رہا ہوں۔ دیکھیے غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ نظر اپنی بیگناہی پر، خیال کرتا ہوں کہ اب شاید امن ہونے کے ساتھ ہی پنشن بحال ہو جائے۔ رہا یہاں سے کسی دوسری جگہ جانا، تو یہ کیسے ممکن ہو! اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ مجھے بازپرس اور دار و گیر کا خوف ہے اور میں قصوروار ہوں۔ اس صورت میں اگر پنشن کے کھلنے کا کوئی امکان ہے، تو وہ بھی جاتا رہیگا۔ نا صاحب، اس وقت یہاں سے نکلنا مصلحت کے خلاف ہو۔ بھائی سے کہنا، گھبرائیں نہیں، وہ بھی ہمارے ہی بزرگ تھے جنھوں نے بھوکے پیاسے خدا کی راہ میں جان دے دی۔ دن ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ یہ وقت بھی گذر جائیگا۔ اگر حالات موافق ہوئے تو میں پھر کسی وقت آگرے کا چکر لگاؤنگا۔

۵

۱۸۶۰ء میں والد مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ تمھاری تجارت کے لیے بہتر ہوگا کہ تم مستقل طور پر دلّی میں سکونت اختیار کر لو۔ وہاں یوں بھی کاروبار زیادہ ہے؛ پھر اس پر بڑا شہر اور حکومت کا مرکز ہونے کے باعث وہاں ترقی کی زیادہ گنجایش ہے۔ میں نے بعض مقامی دوستوں سے مشورہ کیا۔ میرزا صاحب سے بھی خط کے ذریعے پوچھا۔ سب نے اس رائے پر صاد کیا۔ اس پر میں خدا کا نام لے کر ۱۸۶۱ء کے شروع میں یہاں دلی آ گیا۔

میرزا صاحب نے حکیم محمد حسن خان والا مکان جولائی ۱۸۶۰ء میں چھوڑ دیا تھا اور اب اسی بلی ماراں میں ایک دوسرے مکان میں رہتے تھے۔ یہ اگرچہ پہلے مکان سے وسیع تر تھا، لیکن اس میں تکلیف یہ تھی کہ محلسرا اور دیوانخانہ ایک جگہ نہیں تھے؛ زنانہ حصہ ایک جگہ تھا، اور مردانہ اس سے کچھ فاصلے پر تھا، اگرچہ تھا اسی گلی میں۔ یہ مکان وہ ہے

جو بلی ماراں سے گلی قاسم جان میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے الٹے ہاتھ کو پڑتا ہے۔ اس کے برابر نکڑ پر ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ اسی مکان سے متعلق میرزا صاحب نے کہا تھا:

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے
اک بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

میں نے پوچھا: قبلہ، وہ پہلا مکان کیوں چھوڑ دیا، اچھا خاصا آرام دہ مکان تھا۔ فرمانے لگے۔ اس میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ بہت تنگ تھا۔ بھائی، سچ مانتا، میرا اس میں دم گھٹتا تھا۔ لیکن چونکہ کوئی اور ڈھنگ کا مکان ملتا نہیں تھا، اس لیے آٹھ برس تک اس میں پڑا رہا۔ مئی ۱۸۵۷ء تک جب فساد شروع ہوا ہے، برابر چار روپے مہینا اس کا کرایہ دیتا رہا۔ جب فساد ہوا، تو حالات سے مجبور ہو کر میں کرایہ نہ دے سکا۔ تین برس تک پنشن بند رہی۔ کھانے کو روٹی اور پینے کو شراب تک میسّر نہیں تھی، چار روپے مہینا کرایہ کہاں سے دیتا! نتیجہ یہ ہوا کہ تین برس کا کرایہ، کم و بیش ڈیڑھ سو روپیہ چڑھ گیا۔ بارے خدا خدا کر کے مئی ۱۸۶۰ء میں پنشن جاری ہوئی اور پچھلا بقایا بھی وصول ہوا، تو میں نے تین سال کا کرایہ یکمشت ادا کر دیا۔ لیکن اب ایک اور مصیبت پیش آئی۔ اگلے ہی مہینے جون کے آخر میں مالک مکان نے اسے حکیم غلام اللہ خان کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ حکیم صاحب نے مجھ سے مکان خالی کر دینے کو کہا، وہ اس میں ردّوبدل کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ اس کے بعض حصّوں کو نئے سرے سے بنوانا چاہتے تھے؛ تم نے اسے دیکھا ہی ہے، تھا بھی بہت پرانا۔ بڑی مشکل سے یہ جگہ ملی۔ اگرچہ اس میں محلسرا اور دیوانخانہ الگ الگ ہونے کی تکلیف تو ہے، لیکن اس سے کہیں کھلا ہے۔ بہرحال اب پایانِ عمر ان باتوں کی شکایت کیا۔ اب باقی ہی کتنی رہ گئی ہے کہ ان باتوں کی فکر ہو۔ آہ

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ!
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس زمانے میں روزانہ عصر کے وقت ان کے عزیزوں میں سے بعض لڑکے ان کے دیوانخانے میں جمع ہو کے فارسی پڑھتے تھے۔ باقر علی خان اور حسین علی خان تو گھر ہی پر تھے۔ ان کے علاوہ نواب ضیاءالدین احمد خان کے چھوٹے صاحبزادے سعیدالدین احمد خان اور عارف کے بھتیجے (یعنی میرزا احید رحسن خان کے چھوٹے بیٹے) محمد حسن خان (عرف خضر مرزا) زیادہ حاضر باش تھے۔ کبھی کبھی میرزا علی بخش خان کے صاحبزادے غلام فخرالدین بھی آ نکلتے تھے۔ پڑھانے والے معلّم کا بھلا سا نام تھا، مجھے ٹھیک طور پر یاد نہیں رہا۔ میرزا صاحب پاس بیٹھے سنتے رہتے۔ کبھی کبھی خود بھی تشریح و توضیح کرنے لگتے۔ ساتھ ساتھ لطیفے بھی ہوتے جاتے۔ چلتے وقت بچّوں کو مٹھائی یا کوئی اور چیز کھانے کو ضرور دیتے۔ یوں بچّوں کی نگرانی کے ساتھ ان کی بھی گھڑی بھر کی تفریح ہو جاتی۔ مجھے یاد ہے کہ ان دنوں سب بچّے گلستاں کا سبق لیتے تھے۔ جب میرزا تفتہ کی مثنوی "سنبلستان" چھپ کر آئی، تو میرزا صاحب نے باقر علی خان اور حسین علی خان کو تفتہ کے بھیجے ہوئے دونوں نسخے دے دیے۔ اور معلّم کو ہدایت کی کہ آیندہ انھیں یہ کتاب پڑھائی جائے۔

باقر علی خان بہت متین اور خاموش طبع تھا۔ اس کے برخلاف حسین علی خان حد درجہ شوخ اور کھلنڈرا۔ پڑھنے کے نام سے بھاگتا تھا۔ میرزا صاحب بلاتے، اور حسین علی سبق پڑھ لیا وہ ایک دفعہ تو کہتا "آیا دادا جان"۔ اور پھر غائب غلّہ، کسی طرف کھسک جاتا۔ کھیل کود کا اسے لپکا تھا۔ زبان کا بھی چٹورا تھا۔ میرزا صاحب کہتے تھے۔ لڑکے بادشاہ ہیں، جب اپنے سر پڑے گی، تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔

۱۸۶۳ء کے برس انھوں نے بڑی مصیبت دیکھی۔ انھیں تھوڑی بہت چرک دھاتس تو ہمیشہ ہی رہتی تھی۔ اور کچھ نہ ہوا تو سلسل بول اور قبض کے دونوں مرض تو موجود ہی تھے کہ جان کے ساتھ لگے تھے۔ لیکن اس سال مزید یہ ہوا کہ جنوری کے مہینے میں ان کو پھوڑوں کی تکلیف شروع ہوئی۔ اوّل ایک معمولی سی پھنسی داہنے ہاتھ پر نکلی۔ ان کی

بے احتیاطی سے یہ بڑھ کر پھوڑا بن گئی۔ اس کے بعد بائیں پانو میں ورم ہوا اور ساتھ ہی پانو اور ایڑی سے ہوتا ہوا پنڈلی تک آ ماس ہو گیا۔ پھر دوسرا ہاتھ اور پانو پکڑے گئے۔ اور آخر میں تو جسم کا یہ حال ہو گیا جیسے سرو چراغاں ہو۔ سارے بدن پر چھوٹے بڑے دس بھر پھوڑے اور ہر ایک پھوڑا اچھا خاصا گہرا۔ حکیم محمود خان اور حکیم احسن اللہ خان دونوں صاحبوں نے تشخیص کی کہ احتراق خون کا شدید حملہ ہوا ہے، جو عمر بھر کی شراب نوشی اور بے اعتدالیوں کا نتیجہ ہے۔ آخر باہمی مشورے سے یہ ٹھہری کہ سب سے پہلے پانو کے پھوڑے کو پکا کر گندا مادہ خارج کیا جائے تاکہ کہیں اس کا زہر سارے جسم میں سرایت نہ کر جائے۔ چنانچہ دو تین دن نیم کے پتوں کا بھرتا بندھتا رہا۔ جب ورم پک گیا اور اس کا منہ بن گیا، تو نشتر سے سوراخ دے کر گندہ مادہ نکالا گیا۔ حکیم صاحب نے پھوڑوں پر لگانے کے لیے ایک مرہم کا نسخہ لکھ دیا۔

ان کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی تھی۔ حکیم محمود خان ہی کا آدمی روزانہ صبح کے وقت آتا، وہ زخموں کو صاف کر کے مرہم لگاتا اور پھاہے رکھ کر باندھ دیتا تھا۔ جب وہ سلائی سے زخم صاف کرتا اور پیپ نکالتا تو ہم دیکھنے والے کانپ کانپ اٹھتے تھے، لیکن آفرین ہے اُن پر، ماتھے پر بل تک نہیں لاتے تھے۔ اور یہ تکلیف چند دن یا چند ہفتے نہیں بلکہ مسلسل کئی مہینے تک رہی۔ وہ روزانہ نہایت اطمینان اور تحمل سے مرہم پٹی کرواتے رہے، بلکہ پاس دیکھنے والوں کو حوصلہ دیتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اس حالت میں اُن کے لیے اٹھنا بیٹھنا محال تھا۔ چنانچہ دن رات بستر پر پڑے رہتے۔ بھوک پیاس بالکل زائل ہو گئی تھی، کھانا گھر سے آتا، تو وہ لیٹے لیٹے ہاتھ دھو کر، دو چار لقمے حلق سے اتار لیتے۔ رات کو نیند بھی کم آتی تھی، بلکہ اسے نیند کہنا ہی نہیں چاہیے، ایک غفلت کی سی کیفیت ہوتی تھی۔ اگر کہیں خوش قسمتی سے پل بھر کے لیے آنکھ لگ گئی، تو کسی پھوڑے میں ٹیس اٹھتی اور وہ بلبلا کے جاگ اٹھتے۔ اسی طرح سوتے جاگتے رات گذر جاتی۔ اٹھ نہیں سکتے تھے۔ کھڑے ہونے سے پنڈلیاں

لرزنے لگتی تھیں۔ وہیں پلنگ کے پاس اوٹ میں حاجتی دھری تھی۔ ضرورت ہوئی، تو کھسل پڑے اور اسی طرح کھسکتے کھسکتے واپس پلنگ پر آکر پڑ گئے۔ مصیبت بالائے مصیبت، اسی دوران میں انھیں فتق کی شکایت بھی ہو گئی۔

اس تکلیف کے باوجود اس زمانے میں بھی، احباب کی فرمایشیں بدستور جاری تھیں۔ شاگرد اصلاح کے لیے کلام بھیجتے۔ دوست اور ملنے والے شوقیہ خطوط لکھتے۔ وہ کسی کی دل شکنی نہ کرتے۔ سب کو لیٹے لیٹے جواب لکھتے۔ ایک دن فرمانے لگے۔ حیران ہوں، لوگ مجھے ابھی تک زندہ سمجھتے ہیں، حال آنکہ میں مردے سے بدتر ہوں۔ بہر حال یہ دونوں باتیں آدھی سچ ہیں اور آدھی جھوٹ۔ موت کی صورت میں نیم مردہ ہوں، اور زندگی کی حالت میں نیم زندہ!

آہ جی جاؤں، نکل جائے اگر جان کہیں

نومبر کے آخر میں تندرستی اتنی عود کر آئی تھی کہ مرہم پٹی موقوف ہو گئی تھی۔ لیکن اس لمبی بیماری کا یہ نشان رہ گیا کہ دونوں پاؤں کی دو دو انگلیاں مستقل طور پر اینٹھ کے مونڈھ اور ٹیڑھی ہو کر رہ گئیں۔ جوتا پہننے میں تکلیف ہوتی تھی، اور زیادہ چل پھر بھی نہیں سکتے تھے۔ کمزوری کا تو ذکر ہی کیا! خود کہتے تھے کہ جسم میں جتنا خون تھا، وہ پیپ بن کر نکل گیا۔ اب تھوڑا سا جو جگر میں باقی ہے، وہ کھا کھا کر جیتا ہوں۔ کبھی اسے کھاتا ہوں، کبھی پیتا ہوں۔

میں ۱۸۶۴ء کے نوروز کے دن سہ پہر کے وقت مزاج پرسی کو گیا۔ اندر صحن میں ایک دالان تھا، جہاں شام تک دھوپ رہتی تھی۔ یہیں پلنگ پر لیٹے تھے۔ اب جاڑوں کے موسم میں ان کا یہ عام معمول ہو گیا تھا کہ کھانا کھا کے دھوپ میں لیٹ جاتے اور جب تک ہوا میں خنکی نہ محسوس ہونے لگتی، وہیں پڑے رہتے۔ میں آداب عرض کر کے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

معلوم ہوا کہ ان کے برادرِ نسبتی میرزا علی بخش خان فوت ہو گئے ہیں۔ وہ کتنے برس سے

سلطان جی کے قریب کی بستی عرب سرائے میں رہتے تھے۔ مدت سے صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ وہیں پچھلی رات کو فجر کی نماز سے تھوڑی دیر پہلے جنت سدھارے۔ فرمانے لگے، مرحوم میرا بہت ہمدرد اور دلی یار تھا۔ مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ میں چلنے پھرنے سے معذور ہوں، ورنہ جنازے کے ساتھ جاتا۔ بھائی ضیاء الدین خان گئے ہیں کفن دفن کا سارا انتظام وہی کرینگے۔

اسی سلسلے میں ایک اور بات یاد آگئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ نواب علاء الدین احمد خان اور میرزا علی بخش خان میں آپس میں کچھ کشیدگی تھی۔ اگرچہ نواب صاحب نے مرحوم کی وفات پر دو تین تاریخ کے مادّے نکالے تھے، لیکن نہ خود انھیں نظم میں لکھا، نہ کسی دوسرے ہی کو یہ کام کرنے کی اجازت دی۔ بلکہ انھوں نے کسی مجلس میں مرحوم کے خلاف بعض ایسے کلمات کہے، جن سے ان کی دلی رنجش کا اظہار ہوتا تھا۔ اس پر میرزا صاحب نے انھیں لکھا کہ میت کو نیکی سے یاد کرنا چاہیے۔ اب تمھارا اپنی ناراضی کا اظہار کرنا نامناسب ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلیگا کہ دوسرے عزیزوں کے دل ملول ہونگے۔ بتاؤ، اس سے بھلا تمھیں کیا حاصل ہوگا! پس اب خاموشی بہتر ہے۔

اسی سال (۱۸۶۴ء) عارف کے بڑے صاحبزادے باقر علی خان کی شادی نواب ضیاءالدین خان کی اکلوتی صاحبزادی معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم سے ہوئی۔ دولھا ۱۷ برس کے تھے اور دلھن ۱۲-۱۳ برس کی۔ دونوں میرزا کے ہاتھوں میں پلے تھے اور انھیں اپنی اولاد کی طرح عزیز تھے۔ ایک دن کا لطیفہ مجھے آج تک یاد ہے۔

میں اس دن کسی کام سے صبح سویرے ہی میرزا صاحب کے پاس گیا تھا۔ وہاں باتوں میں دیر ہوگئی۔ اتنے میں گھر سے عنایت اللہ ملازم نے آکے اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے، حکم ہو تو نکالا جائے۔ میرزا صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ آؤ کھانا یہیں ہمارے ساتھ کھالو، کہاں اتنی دور جاؤ گے۔ میں ان کی محبت کے پیش نظر انکار نہ کرسکا۔ چنانچہ انھوں نے عنایت سے کہا کہ بیگم صاحب سے کہو کر کھانا نکلوائیں، ہم دونوں آرہے ہیں۔ ادھر ملازم

گیا، ادھر ہم دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ حد درجہ کمزور ہو گئے تھے۔ لکڑی کے سہارے بہت آہستہ آہستہ چلتے تھے۔ حالانکہ محلسرا دور نہ تھی؛ پچاس قدم کا فاصلہ نہیں ہوگا، لیکن وہاں تک پہنچتے پہنچتے ان کی سانس پھول گئی۔ بہر حال، جب تھوڑا آرام کر لیا، تو دسترخوان پر بیٹھے۔ نوکر نے اُن کے سامنے شوربے کا پیالہ رکھا۔ میں نے دیکھا کہ خلافِ معمول کسی چیز میں بھی چنے کی دال نہیں۔ میرزا صاحب کو بھی اس پر بہت تعجب ہوا۔ پوچھا، کیوں بھئی، دال گھر میں نہیں تھی، تو بازار سے منگوائی ہوتی، یا مجھ سے کہا ہوتا، میں منگوا دیتا۔ بیگم صاحب دوسرے دالان میں بیٹھی تھیں؛ وہیں سے جواب دیا، نہیں دال تو گھر میں موجود ہے لیکن بہو چنے کی دال نہیں کھاتی، اس لیے کسی چیز میں نہیں ڈالی گئی۔ خدا دے، ایسا موقع میرزا صاحب کو جھٹ سے بولے۔ واہ، پھر تو بہو خدا سے بھی بڑھ گئی۔ ارے اچھا تو وہ چیز ہے کہ اس پر خود اللہ میاں کی رال ٹپک پڑی تھی۔ اب بہو چنے کی دال نہیں کھاتیں، تو یہ گویا خدا سے بھی بڑھ گئیں۔ سب ہنسنے لگے۔ بیگم صاحب خفگی سے بولیں۔ بس انھیں تو باتیں بنانا آتی ہیں۔ بچاری بچی ہے۔ ہوا کیا، اگر وہ ایک چیز پسند نہیں کرتی، تو اس کی مرضی۔ ٹھیکہ تھوڑی ہے کہ جی چاہے نہ چاہے، ضرور کھائیے۔

زندگی کے آخری تین چار برس میں اُن کی تندرستی بہت خراب ہو گئی تھی۔ دن دن بھر پڑے رہتے تھے۔ کوئی تکلف کا ملنے والا آجاتا، تو اُٹھ کے بیٹھ جاتے، ورنہ سارا وقت چارپائی پر لیٹے رہتے۔ گرمیوں میں دن بھر کوٹھری میں گذر جاتا؛ رات کو دو آدمی اُٹھا کر صحن میں لے آتے۔ جاڑوں میں دن کے وقت دھوپ میں لیٹے رہتے، رات کو سونے کا کمرہ انگیٹھی سے خوب گرم کروا لیتے تھے۔ خوراک نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ صبح کی تبرید بدستور تھی۔ دوپہر کو صرف ایک پیالہ بھر گوشت کا پانی۔ بوٹی، روٹی، چاول، سب کچھ بالکل مفقود۔ سرِ شام تولہ دو تولہ بھر شراب، اسی قدر گلاب میں ملا کر، پیتے تھے اور بس۔ دوستوں کے خط آتے تھے۔ اُن کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں دن کٹ جاتا۔ خود زیادہ

لکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ لکھتے، تو انگلیاں اکڑ جاتیں، اور درد کرنے لگتیں۔ کوئی دوست، ملاقاتی آجاتا، تو اس سے خطوط کے جواب لکھوا لیتے تھے۔ آپ بولتے جاتے تھے اور وہ لکھتا جاتا تھا۔

جاننے والے جانتے تھے کہ اب یہ چراغِ سحری ہیں۔ ۱۴ فروری ۱۸۶۹ء کو وہ حسبِ معمول لیٹے ہوئے تھے۔ اگرچہ کوئی خاص تکلیف نہیں تھی، لیکن ایک نیم غشی کی کیفیت ضرور تھی۔ ہوش میں آئے تو کلو نے پوچھا کہ حضور کھانا لاؤں۔ بولے، آج ہم کھانا میرزا جیون بیگ کے ساتھ کھائیں گے، جاؤ، اسے بلا لاؤ (اس سے اشارہ باقر علی خان کامل کی سب سے بڑی صاحبزادی محمد سلطان کی طرف تھا ـــــ انھیں میرزا پیار سے مرزا جیون بیگ یا جینا بیگم کہا کرتے تھے۔ وہ اس وقت چار برس کی تھیں)۔ کلو انھیں بلانے محلسرا میں گیا۔ وہ سو رہی تھیں۔ بگا بیگم، ان کی والدہ نے کہا: ابھی کھیلتے کھیلتے سو گئی ہے۔ جونہی جاگتی ہے، بھیجتی ہوں۔ کلو نے آ کے کہا کہ حضور، وہ آرام کر رہی ہے۔ بیگم صاحبہ جاگنے پر بھیج دینگی۔ یہ سن کر بولے، اچھا، تو جب وہ آئیگی، ہم اسی وقت کھانا کھائینگے۔ اتنا کہہ کر تکیے پر سر رکھا اور لیٹ گئے۔ لیٹنے کے ساتھ ہی بیہوش ہو گئے۔ فوراً حکیم محمود خان اور حکیم احسن اللہ خان کو اطلاع کی گئی۔ دونوں صاحبوں نے رائے دی کہ دماغ پر فالج گرا ہے۔ یہ خبر سارے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ جس جس نے سنا، دوڑ آیا۔ عیادت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ آٹھ پہر اسی بیہوشی میں گزر رے، نہ طبیبوں کی پیش گئی، نہ کسی اور کی۔ نہ دوا کارگر ہوئی، نہ دعا۔ اور ہوتی بھی کیسے؟ ان کا وقت آن لگا تھا۔ اسی حالت میں اگلے دن ۱۵ فروری کو دوپہر ڈھلے جان، جان آفریں کے سپرد کر دی ـــــ

حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا

سائل دہلوی

نواب سراج الدین احمد خان سائل ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو شنبہ کے دن اللہ کو پیارے ہوئے تھے۔ چونکہ سالِ ولادت ۱۸۶۷ء تھا، اس طرح عمرِ عزیز ۷۸ برس کی ہوئی۔ اللہ کریم انھیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے! مرحوم مجھ پر بہت مہربانی فرماتے تھے۔ بہت دن سے خیال کر رہا تھا کہ اپنے تاثرات قلم بند کر دوں، لیکن ہائے کمبخت مردہات۔

تجھ کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

میں تعلیم ختم کرنے کے بعد دو تین برس تک روزگار کے لیے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ لیکن اسے میری نالائقی سمجھیے، یا بدقسمتی کہ کسی جگہ قدم نہ جم سکے۔ ان ایام میں یہاں دلّی میں میرے ایک مہربان تھے جنھیں اس بات کی فکر تھی کہ کسی جگہ میرے لیے مستقل ٹھکانا ہو جائے۔ انھوں نے ۱۹۳۵ء کی سرگرمیوں میں مجھے لکھا کہ تم یہاں آ جاؤ، تو شاید ریڈیو کے محکمے میں تمھارا انتظام ہو جائے۔ چنانچہ اس بلاوے پر میں یہاں آ گیا۔ یہ دلّی میں میری پہلی آمد تھی۔ میں اس سے پہلے یہاں کبھی نہیں آیا تھا۔ اپنے رجحانات کے باعث، مجھے اس عروس البلاد سے جو دلچسپی ہو سکتی تھی، اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہاں پہنچ کے

مجھے کتنی خوشی ہوئی ہوگی۔

اس زمانے میں یہاں میرے ایک ہموطن دوست جگت سنگھ رہتے تھے۔ ساتھ کے کھیلے ہوئے، ساتھ کے پڑھے ہوئے، یوں سمجھیے، دانت کاٹی روٹی والا معاملہ تھا۔ وہ آج کی طرح جب بھی ایک اسکول میں مدرّس تھے۔ میں انہی کے ہاں اترا۔ دو تین دن بعد ایک صبح وہ مجھ سے کہنے لگے۔ تمھیں اردو لکھنے پڑھنے کا شوق ہے، کسی دن فرصت ملے تو لال کنویں میں ایک بوڑھے نواب صاحب رہتے ہیں، سراج الدین خان نام ہے، ان سے جا کر ضرور ملو۔ میں نے پوچھا، کون نواب سراج الدین احمد خان! وہی تو نہیں، جو سائل تخلص کرتے ہیں؟ کہا، ہاں، وہی، دیوانہ را ہوئے بس است۔ اگلے دن اتوار تھا۔ میں نے ناشتے کے بعد لال کنویں کی راہ لی،

بوقتِ صبح چو مردم بکاروبار روند
بلاکشانِ محبت بکوئے یار روند

جگت سنگھ کو سائل صاحب کے مکان کا ٹھیک علم نہیں تھا۔ وہ بس اتنا ہی جانتے تھے کہ کہیں لال کنویں کے محلّے میں رہتے ہیں۔ البتہ مجھے معلوم تھا، کہ ان کا لوہارو خاندان سے تعلق ہے۔ اس لیے میرے دل میں اطمینان تھا کہ ایسی معروف ہستی کا مکان تلاش کرنے میں کوئی دقّت پیش نہیں آسکتی۔ چنانچہ میں پوچھتا پاچھتا گلی قاسم جان میں جا پہنچا، جہاں اس خاندان کے مکانات تھے۔ یہاں میں نے ایک آدمی سے پوچھا کہ میں نواب میرزا سراج الدین احمد خان کے ہاں جانا چاہتا ہوں۔ میں اس وقت نواب ضمیر الدین احمد خان عرف ضمیر مرزا (خلف نواب علاء الدین احمد خان علائی) کے مکان کے سامنے تھا۔ اس شخص نے جواب دیا کہ یہاں سے دریافت فرمائیے۔ میں نے مڑ کر دیکھا، تو میرے سامنے ضمیر مرزا کا ملازم کھڑا تھا۔ میں نے اپنا سوال اس سے دہرایا، اس نے کہا، جناب! وہ اس گلی میں نہیں رہتے۔ ان کا مکان لال دروازے میں ہے۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید اسے نام سننے میں کچھ غلطی ہوئی ہے۔ اس لیے میں نے دوبارہ تاکید سے کہا کہ میں نواب

سراج الدین احمد خان صاحب کے ہاں جانا چاہتا ہوں۔" جی ہاں! میں سمجھ گیا، وہی نا، جو شاعر ہیں اور جن کے گھر میں باہر کی بیگم ہیں۔ وہ لال دروازے میں رہتے ہیں۔ آیئے، میں آپ کو پہنچائے آتا ہوں۔" چنانچہ ہم دونوں گلی قاسم جان سے نکل کے لال کنوئیں میں آگئے۔ لال دروازہ کچھ دور تو ہے نہیں، یہی چند قدم کا فاصلہ ہے۔ اس کے اندر تھوڑی دور چل کے وہ سیدھے ہاتھ پر ایک اونچی کرسی کے مکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "لیجیے حضور، یہ ہے نواب صاحب کا مکان،" اس کے بعد اس نے ملازم کو آواز دی۔ اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔ "آپ نواب صاحب سے ملنا چاہتے ہیں" اور مجھے اس کے سپرد کر کے خود واپس چلا گیا۔

میں ملازم کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ کے ڈیوڑھی میں آیا۔ یہاں اندر گھستے ہی دائیں طرف ایک چھوٹی سی کوٹھری یقیناً ملازم کے لیے تھی۔ اسی طرف کے کونے میں اوپر جانے کا زینہ تھا۔ سامنے کے رخ پر ایک دروازہ تھا جس پر پردہ پڑا تھا۔ یہ گھر کے صحن میں کھلتا تھا۔ پیش طاق پر ایک تختی لگی تھی، جس پر لکھا تھا: مکان لاڈلی بیگم۔ اسے دیکھ کر مجھے معاً "حویلی علی نقی خاں بہادر کی" والا لطیفہ یاد آگیا۔

الٹے ہاتھ کی بغل میں بیٹھنے کا کمرہ تھا۔ جس میں داخل ہونے کے لیے دو سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں۔ ملازم نے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے یہاں بٹھا کے خود نواب صاحب کی خدمت میں اطلاع دینے چلا گیا۔

میں نے اپنے اردگرد نگاہ ڈالی، تو دیکھا کہ وہاں اچھا خاصا مشرقی اور مغربی تمدن کا امتزاج ہو رہا ہے۔ یعنی کمرے میں دری کا فرش تھا، اس کے اوپر نصف کمرے کے لگ بھگ سفید براق چاندنی بچھی تھی۔ صدر میں ایک چھوٹا سا ایرانی قالین اور دو بڑے بڑے گاؤ تکیے لگے رکھے تھے۔ نشست کے قریب چاندی کا پاندان، پیچوان اور لگن، دو تین اگالدان اور سگرٹ کی راکھ جھاڑنے کی پیالیاں دھری تھیں —— اور جہاں چاندنی نہیں تھی، وہاں چند کرسیاں اور ایک چھوٹی سی تپائی رکھی تھی۔ میں

یہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔
زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک نورانی صورت بزرگ داخل ہوئے۔ تقریباً ستر برس کا سن، کوئی پونے چھ فٹ کا قد، کمر میں خفیف ساخم۔ میدہ و شہاب کی ملی جلی رنگت، الموترا کتابی چہرہ، کشادہ پیشانی، اونچی کاٹھی کی لمبی عقابی قسم کی نوکدار ناک، کلّے کی ہڈیاں نمایاں طور پر ابھری ہوئی۔ سڈول جسم، سنہری جھلک مارتی ہوئی سپید ڈاڑھی، جو یک مشت تو یقیناً تھی، دو انگشت کی خدا جانے۔ شرعی لبیں، آنکھیں نسبتاً چھوٹی، لمبے لمبے بازو اور ہاتھ پاؤں۔ سر پر ہلکی سی پلّے کی ٹوپی، جس کے نیچے سے لمبے لمبے لچھے دار بال نکلے پڑتے تھے۔ گلے میں کاج بٹی گریبان اور کھلی آستینوں کا ململ کا کرتہ، کندھے پر رومال، نیچے لٹھے کا آڑا پاجامہ۔ پاؤں میں خوردنوک کا جوتا۔ دائیں ہاتھ میں لکڑی اور بائیں میں سگرٹ کا بکس اور دیا سلائی کی ڈبیا۔
یہ تھے نواب سراج الدین احمد خان سائل دہلوی بن نواب شہاب الدین احمد خان ثاقب بن نواب ضیاء الدین خان بہادر نیّر رخشاں بن فخر الدولہ نواب احمد بخش خان بہادر (والیِ فیروز پور جھرکہ و لوہارو) بن مرزا عارف جان بخارائی۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک جگہ کہا ہے:

سائل کو تم نہ چشمِ حقارت سے دیکھنا
نواب پانچ پشت سے اس کا خطاب ہے

میں اٹھ کے آداب بجا لایا۔ بہت لطف سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ پہلے مجھے بٹھایا، پھر خود دوسری کرسی پر تشریف فرما ہوگئے۔ نام پوچھا، مقام پوچھا۔ تعلیم اور روزگار کا حال پوچھا۔ چونکہ خود شاعر تھے، خیال کیا ہوگا کہ جو ملنے کے لیے آیا ہے، تو ضرور شعر بھی کہتا ہوگا۔ پوچھنے پر میں نے عرض کی کہ عمر بھر شعر کہنے کا اتفاق نہیں ہوا، تو پہلے کچھ تعجب کا اظہار کیا۔ پھر فرمایا: لیکن اس میں بھی شبہہ نہیں کہ یہ ہے بیکاری کا مشغلہ۔
ہم جس کمرے میں بیٹھے تھے، یہ گلی کے رُخ پر تھا اور یہاں کی تینوں کھڑکیاں کھلی

تھیں۔ نیچے گلی میں ایک ٹھٹھیرا برتنوں کی مرمت کر رہا تھا۔ قدرتاً شور ہونا ہی چاہیے:
اس متواتر بے ہنگم آواز سے میں بہت پریشان تھا، یہاں تک کہ بعض اوقات ہمیں ایک
دوسرے کی بات سننے میں بھی تکلّف ہوتا تھا۔ لیکن کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ سائل
صاحب بھی اس کھٹاکھٹ سے منغض ہوئے۔ گھبرا کے آواز دی: ارے کوئی ہے؟
دروازے پر سے ملازم نے جواب دیا۔ حضور، حاضر ہوں۔ میاں، جاؤ، اس نیک بخت
سے کہو، کہ یہ شور بند کرے اور اگر اس کے بغیر نہیں رہ سکتا، تو اس سے کہہ دو کہ
یہ محلہ چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے۔ یہ کیا مصیبت نازل ہوگئی ہے! ملازم نے جا کے
سمجھا دیا ہوگا۔ بہرحال آواز بند ہوگئی اور ہم اطمینان سے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔
تھوڑی دیر بعد میں نے اجازت چاہی۔ فرمایا: جب طبیعت چاہے، چلے آؤ! میں
دوپہر تک بالعموم مکان ہی پر رہتا ہوں، سرِشام کبھی کبھی گھومنے نکلتا ہوں۔
یہ تھی جناب سائل صاحب سے میری پہلی ملاقات۔
اتفاق سے میری ریڈیو سے بھی نہ نبھ سکی۔ اس زمانے میں جو حضرات اس محکمے کے
کرتا دھرتا تھے، میں انھیں خوش نہ کرسکا۔ چنانچہ مہینا بھر یہاں رہ کے واپس لاہور
چلا گیا۔

اگلے برس مجھے پھر انھی مہربان کے ذریعے ایک اور دفتر میں جگہ مل گئی۔ میں شملے گیا
اور عارضی طور پر ملازم ہوگیا۔ مشاہرہ قلیل تھا۔ لیکن کام بھی کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔
حکومت کے دفاتر کے ساتھ یہ لوگ بھی گرمیوں میں شملے اور سردیوں میں دلّی آتے
جاتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب نومبر میں دفتر دلّی آئے، تو میں بھی یہاں پہنچ گیا۔ یہاں
آنے کے بعد میں پہلی فرصت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور ۱۹۳۶ء، ۱۹۳۷ء
کے دونوں جاڑوں میں متواتر ان کے ہاں آتا جاتا رہا۔ دراصل یہی وہ زمانہ ہے،
جب مجھے انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔
اب تفصیل میں کیا جاؤں کہ کیسے کیسے ہمارے تعلقات میں گہرائی پیدا ہوتی گئی۔

بہر حال نتیجہ یہ نکلا کہ ہم بہت جلد ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ حکم ہوا، کہ جب تک دلی میں رہو، یوں جب جی چاہے، یا ضرورت ہو، آ سکتے ہو؛ لیکن اتوار کے دن کہ تمھیں دفتر سے چھٹی ہوتی ہے، لازماً صبح کا ناشتہ میرے ساتھ کرو۔ میں نے اقرار کر لیا۔ جو لوگ دلی کی سردیوں کو جانتے ہیں، انھیں خوب معلوم ہے کہ مجھے اس وعدے کے ایفا میں کیا کیا مشکل پیش آئی ہوگی۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ آندھی ہو یا طوفان بارش ہو کہ کڑاکے کی سردی، میں تعمیل حکم میں ان دونوں جاڑوں میں بلا ناغہ ہر اتوار کو حاضر ہوتا رہا، اور اس دن عام طور پر دوپہر تک ان کے ساتھ رہتا۔

کھانے پینے میں مزاج بہت نفاست پسند تھا۔ حتی الوسع اس بات کی کوشش کرتے کہ سالن ترکاری ہاتھ سے نہ کھائیں۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ چکناہٹ یا سالن کی زردی انگلیوں پر رہ جائے۔ اس لیے بے دریغ چمچے اور کانٹے کا استعمال کرتے تھے۔ انھیں دہی کا پنیر بہت پسند تھا۔ یعنی دہی، پتلے ململ کے ٹکڑے میں ڈال کر لٹکا دیا جاتا تھا۔ جب تمام پانی رس کے نکل جاتا، تو بقیہ پنیر دو پتھروں یا کسی اور بھاری اور سخت چیز کے درمیان رکھ کے ہموار کر لیتے۔ پھر جیسے چاہتے، اس کے تکونے، بلوترے، چوکور ٹکڑے کاٹ لیتے۔ ناشتے میں یہ پنیر ضرور ہوتا تھا اور وہ اسے ہمیشہ کانٹے سے کھاتے تھے۔

کھانے میں مچھلی بہت پسند تھی، لیکن کانٹے سے بہت ڈرتے تھے۔ اخیر عمر میں بینائی میں بھی فرق آگیا تھا، چھوٹا کانٹا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس لیے عام طور پر بیگم صاحب ان کے لیے علیحدہ پہلے سے کانٹا نکال کے دسترخوان پر رکھ دیا کرتی تھیں۔ خوراک بہت کم تھی۔

ایک دن ناشتے پہ فرمایا، خوب پیٹ بھر کر کھا لو، ممکن ہے کہ ہم لوگوں کو دوپہر کا کھانا نہ ملے۔ آج ہمیں سیر کے لیے باہر جانا ہے۔ اب میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ جب وہ مجھ سے کچھ کرنے کو کہتے؛ تو میں کوئی حیل حجت نہیں کرتا تھا۔ وہ میری عادتوں

سے خوب واقف تھے اور انھیں معلوم تھا کہ مجھے کونسی چیز پسند ہے اور کونسی ناپسند۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے کوئی ایسا کام کرنے کو نہیں کہینگے، جو میرے خلاف طبع ہو۔ اس دن بھی یہی ہوا۔ میں نے نہیں پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے۔ صرف اتنا کہہ دیا کہ "بہت اچھا"۔ انھوں نے کسی دوست سے گاڑی مانگ رکھی تھی۔ ملازم کو حکم ہوا کہ گاڑی لے آؤ۔ ہم نیچے اترے اور نئی دلّی کے راستے حضرت نظام الدینؒ کے مزار پر پہنچ گئے۔

نواب سائل مرحوم کے خاندان کو بزرگان دین سے بہت عقیدت رہی ہے، بلکہ خود ان کے اجداد میں بھی اولیاء اللہ کی کمی نہیں۔ قریبی زمانے میں بھی ان کے پردادا نواب احمد بخش خان کے چھوٹے بھائی الٰہی بخش خان جتنے شاعری میں معروف ہیں، تصوف اور اہل باطن کے حلقوں میں اس سے شاید ہی کچھ کم مشہور ہوں، وہ حضرت مولانا فخر الدینؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ خود نواب احمد بخش خان اگرچہ شروع میں کچھ باغی سے رہے لیکن آخر میں اپنے چھوٹے بھائی کے ذریعے سے انھوں نے بھی مولانا فخر الدینؒ سے بیعت کر لی تھی۔ یہ اسی ارادت اور خوش عقیدگی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کا نام حضرت خواجہ ضیاء الدینؒ اجمیری کے نام کی رعایت سے غلام ضیاء الدین رکھا۔ جو آسمان علم و ادب پر ضیاء الدین احمد خان نیّر رخشاں بن کر چمکا۔ سائل صاحب بھی حضرت مولانا شاہ دلدار علی بدایونی کے ہاتھ پر بیعت تھے۔ یہ بزرگوار شاعر بھی تھے، مذاق تخلص تھا اور اس فن میں ذوق کے شاگرد تھے۔ دیوان مطبوعہ موجود ہے۔

میرا سلطان جی میں یہ پہلا پھیرا تھا۔ سب سے پہلے ہم نے حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزار مقدس پر حاضری دی۔ یہاں فاتحہ پڑھ کے ہم باہر صحن میں پڑی ہوئی لکڑی کی چوکیوں پر آکر بیٹھ گئے۔ چند مجاور بھی ہمارے پاس آن بیٹھے۔ وہ نواب صاحب کو اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ بھی ایک ایک سے اس کے گھر بار کا حال پوچھتے رہے۔

ایک مجاور اندر مزار پر سے سبز کپڑے کے دو پھینٹے لے آیا۔ ایک ایک ہماری ٹوپیوں کے گرد لپیٹ دیا گیا سائل صاحب نے اس سے کچھ سلوک کیا۔ پھر مجھ سے فرمانے لگے۔ بزرگان دین کے مزاروں پر اکثر آتے رہنا چاہیے۔ اس سے برکت حاصل ہوتی ہے۔ اور دل میں انابت الی اللہ پیدا ہوتی ہے۔ افسوس اب ان مقامات پر اکثر مجاور ایسے ہیں جنھوں نے محض دکانداری بنا رکھی ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ انہی میں ایسے لوگ بھی ہیں، جن کے دل صاحب مزار کے انوار سے منور ہیں۔ اور اگر تم واقعی یہاں کی برکات حاصل کرنا چاہو تو لازم ہے کہ انھیں واسطہ بناؤ۔ پہلے تو میرے جی میں آئی کہ ان سے کٹھ حجتی کر بیٹھوں۔ لیکن موقع بے ڈھب تھا؛ ہمارے ارد گرد بہت لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اس لیے میں نے طرح دے جانے اور خموشی ہی میں عافیت دیکھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسے پوری نہیں، تو نیم رضا تو ضرور ہی سمجھے ہونگے۔

مبادا اس سے کچھ غلط فہمی ہو جائے، اس لیے میں ایک اور واقعہ بھی لکھ دیتا ہوں جس سے ان کے مذہب اور اصحاب مذہب سے متعلق خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔

میں اس زمانے میں قرول باغ میں رہتا تھا۔ ان دنوں جامعۂ ملیہ کے صدر دفاتر بھی وہیں تھے۔ "مسجد کے زیر سایہ خرابات" کا تلازمہ پورا کرنے کو میں نے یہاں کے اکابر کے پڑوس میں مکان لے رکھا تھا۔ اور ان اصحاب کے ہاں اکثر آتا جاتا رہتا تھا۔ ایک شام میں مکتبۂ جامعہ کے مہتمم، جناب حامد علی خان مرحوم سے ملنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں اچھا خاصا مجمع ہو رہا ہے۔ بیشتر مقامی حضرات کے علاوہ باہر کے ایک بہت بڑے عالم اور مصنف بھی موجود تھے۔ میں نے انھیں ذاتی طور پر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ البتہ ان کی دو ایک جوانی کی تصویریں دیکھی تھیں۔ میں نے انھیں پہلی نظر میں پہچان لیا کہ جس کی وہ جوانی تھی، یہ اس کا بڑھاپا ہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ تقریب انہی کے اعزاز میں ہوئی ہے اور یہ لوگ ابھی شام کا کھانا

ختم کر کے بیٹھے ہیں۔ میرے قریب جو صاحب تشریف فرما تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ مشارٌالیہ بزرگوار ایک مقدمے کے سلسلے میں یہاں تشریف لاتے ہیں۔ قصّہ سنیے: موصوف ایک ادارے کے مدیرِ اعلیٰ اور بہت بڑے عالمِ دین ہونے کے علاوہ، ایک مشہور علمی و ادبی مجلّے کے ایڈیٹر بھی تھے۔ کچھ مدّت پہلے دلّی کے ایک من چلے اور جوشیلے نوجوان نے ان کی ایک مایۂ ناز کتاب پر مخالفانہ تنقید لکھ کے ایک مختصر رسالے کی صورت میں شائع کی تھی۔ اس میں وہ ان کی غلطیاں دکھا کے ان کی علمی حیثیت معرضِ بحث میں لے آئے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ بعض مقامات پر وہ جوانی کی ترنگ میں جادۂ اعتدال سے تجاوز کر گئے تھے۔ لیکن اگر معاملہ یہیں تک رہتا، تو کوئی بات نہیں تھی۔ غلطی کس سے نہیں ہو جاتی۔ پھر تحقیق و تصنیف کا میدان تو بہت وسیع ہے، خصوصاً جہاں تعلق استنباط اور استنتاج سے ہو، وہاں تو اختلاف کا بہت زیادہ امکان ہے۔ اگر ہمارے ممدوح معاملے کو اسی نظر سے دیکھتے، تو کوئی قباحت نہیں تھی۔ لیکن خدا معلوم انھیں کیسے شبہہ ہوا کہ اس رسالے کی تصنیف میں ان کے ایک مخالف عالمِ دین کا ہاتھ ہے، جو یہیں دلّی میں رہتے تھے۔ بقولِ امام شمس الدین ذہبی، 'دو صاحبِ علم شخصیتوں کے لیے معصری بہت بڑی ابتلا ہے۔ وہ نہ صرف ایک دوسرے کی صحیح قدر و قیمت شناخت نہیں کر سکتے، بلکہ لبا اوقات رشک و حسد کے باعث ان میں چشمک بھی ہو جاتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے مخالف بن جاتے ہیں۔' یہاں بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ پیش آیا۔ یہ دونوں صاحب ہمارے چوٹی کے عالموں اور مصنفوں میں سے تھے، لیکن نقطۂ نظر کے اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے کے اشد مخالف۔ چنانچہ جب یہ رسالہ موصوف کے پاس تبصرے کی غرض سے پہنچا، تو انھوں نے اپنے مجلّہ میں اس پر رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھ دیا کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ اس پردۂ زنگاری میں کون معشوق ہے اور کس نے یہ کتاب لکھی ہے اور کیوں چھپوائی ہے۔ یہ بھی متفرع ہوتا تھا کہ رسالے

کے مصنّف کا نام جعلی ہے۔

جونہی یہ پرچہ دلّی پہنچا، جس میں یہ تنقید چھپی تھی، اس نوجوان مصنف نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، عدالت میں ہتکِ عزّت کا اور ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا کہ فلاں مجلہ کے ایڈیٹر نے میری تصنیفی قابلیت پر حملہ کر کے میری ہتک کی ہے۔ نیز یہ شبہہ کر کے کہ میں نے یہ کتاب کسی اور سے لکھوا کے اپنے نام سے چھاپ دی ہے، میری شہرت اور عزّت پر حملہ کیا ہے۔ ٹھیک طور پر یاد نہیں رہا، ہرجانہ غالباً دس ہزار روپیہ طلب کیا گیا تھا۔

جو حضرات قانون سے واقف ہیں، وہ جان سکتے ہیں کہ معاملہ کس قدر سنگین تھا قرائن ایسے تھے کہ جرم ثابت ہو جائیگا اور موصوف کو سزا ہو جائیگی اور ہرجانہ ادا کرنا پڑیگا۔ اس لیئے قدرتی طور پر سب لوگ تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔ اگلے دن اسی مقدمے کی پیشی تھی، اور وہ اسی سلسلے میں یہاں آئے تھے۔

اتفاق کی بات کہ میں اس نوجوان مصنف سے چند دن پہلے نواب سائل صاحب کے مکان پر مل چکا تھا اور ان کا یہ رسالہ بھی دیکھ چکا تھا۔ نواب صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے، ان کی تعریف کی تھی، اور ان کے والد مرحوم سے اپنے قدیم دوستانہ تعلّقات کا ذکر کیا تھا۔ یہ نوجوان بھی، ان سے اسی طرح مؤدّبانہ ملے تھے، جیسے ایک خرد، اپنے بزرگ سے ملتا ہے۔ میں نے جب اس مقدمے کی رُوداد سنی، تو معاً میرے ذہن میں خیال گزرا کہ اگر نواب صاحب کوشش کریں، تو شاید ان کی وساطت سے کچھ سمجھوتا ہو جائے۔ چونکہ مقدمے کی پیشی اگلے دن تھی اور وقت تنگ تھا اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ ابھی جا کے ان سے ملنا چاہیے، تاکہ اگلی صبح عدالت کے وقت سے پہلے اس نوجوان سے بات چیت کی جا سکے۔ میں نے جب اپنے اس خیال کا اظہار وہاں دوستوں سے کیا، تو انھوں نے بھی میری اس تجویز پر صاد کیا، اور زور دیا کہ اگر تم کچھ کر سکتے ہو، تو اس سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔ غرض کہ

میں باہر نکلا اور بائیسکل پر سوار ہو کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں جب سائل صاحب کے ہاں پہنچا ہوں، تو ساڑھے دس سے زیادہ ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود جونہی انھیں میرے آنے کی اطلاع ہوئی، فوراً نیچے اتر آئے اور چھوٹتے ہی پوچھا، کیوں خیر تو ہے؟ میں نے کہا، نہیں تو، کوئی ایسی بات نہیں۔ کہنے لگے۔ اب میں یہ تو ماننے سے رہا۔ اس سردی کے وقت، اتنی رات گئے، قرول باغ سے تمھارا آنا بے سبب تو ہو نہیں سکتا۔ القصہ میں نے بے آرامی کی معافی چاہتے ہوئے سارا قصہ بیان کیا۔ تو انھوں نے جو کچھ جواب میں کہا، وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا: بیٹا! تم بہت بھولے ہو۔ تم ان مولویوں کو نہیں جانتے۔ انھیں اپنے علم کا غرور ہے، انھیں اپنی نمازوں کا غرور ہے، اپنے روزوں کا غرور ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے علم اور عبادت کی وجہ سے لوگ ان کے آگے سجدہ کریں اور اُن کے ہاتھ چومیں۔ ان کی ہر بات پر آمنّا و صدّقنا کہیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب تو لڑکا اپنے سگے باپ کی اندھا دھند ماننے کو تیار نہیں اور کہ دیتا ہے، ابا جان! یہ بات تو کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ بھلا یہ قل اعوذی مُلّا کیسے توقع رکھتے ہیں کہ دنیا ان کی ہر بات بے چون و چرا تسلیم کر لیگی! تم اس نوجوان سے مل چکے ہو۔ وہ گھر کا اچھا کھاتا پیتا ہے۔ اس کے باوا میرے اچھے دوست تھے۔ یہ ان کا اکلوتا لڑکا ہے اور وہ اس کے لیے اچھی خاصی پونجی چھوڑ مرے ہیں۔ اس کی عربی اور مذہبی علوم کی باقاعدہ تعلیم ہوئی ہے، اور وہ بودا نہیں۔ مجھے اس مقدمے کا علم نہیں تھا۔ لیکن اگر انھوں نے اس کے خلاف کچھ لکھا ہے، تو اسے بجا طور پر رنج ہونا ہی چاہیے اور اگر انھوں نے اس دوسرے عالم کی مخالفت کے جوش میں کوئی ایسی بات لکھ دی ہے، جس پر قانونی گرفت ہو سکتی ہے، تو انھیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہی چاہیے۔ جو آگ کھائیگا، انگارے ہگیگا۔ اگر کوئی اور مجھ سے اس معاملے میں دخل دینے کو کہتا، تو میں کبھی نہیں مانتا۔ لیکن تمھاری خاطر سے میں اپنی سی کوشش کرونگا۔ آگے جو خدا

چاہیے۔ کل علی الصباح دفتر جانے سے پہلے آجانا۔ میں تمھارے ساتھ خود اس کے پاس چلونگا۔

میں نے یہ لمبی داستان صرف اس لیے بیان کی ہے کہ اس سے سائل صاحب کے علمائے دین سے متعلق خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ خود کوئی بڑے عالم نہیں تھے۔ اپنے جدِ بزرگوار کے بعد انھوں نے شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد مرحوم سے کچھ عربی پڑھی تھی۔ حدیث کی چند کتابیں مشہور عالم مولوی سید نذیر حسین محدث دہلوی سے پڑھیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم کسی طرح یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھیں عربی علوم یا مذاہب سے کچھ ایسی بڑی وابستگی تھی کہ انھیں ان مولویوں کا مدِمقابل خیال کیا جائے۔ بلکہ اپنی خاندانی روایات کے مطابق وہ بہت خوش عقیدہ تھے اور سب علماء اور اصحابِ فضل کا نام احترام سے لیتے تھے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جہاں وہ حقیقی بزرگی اور علم کے قدرشناس اور پرستار تھے، وہیں بناوٹ اور ملمع کے سخت دشمن بھی تھے۔ کسی بڑے سے بڑے نام کی شوکت اور شہرت انھیں مرعوب نہیں کر سکتی تھی اور وہ اپنے خیالات کے اظہار میں کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔

دیکھیے، بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ میں ذکر کر رہا تھا حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزارِ مقدس کا۔ تو زیارت سے مشرف ہو کر ہم باہر نکلے اور پھرتے پھراتے خواجہ حسن نظامی مرحوم کے دولتکدے پر پہنچ گئے۔ سائل صاحب اور خواجہ صاحب میں پرانی ملّت تھی۔ مجھے ٹھیک سا یاد نہیں، لیکن غالباً یہ بھی فرمایا تھا کہ میری کنیت ابوالمعظم، جناب خواجہ صاحب کی دی ہوئی ہے۔ خواجہ صاحب موجود نہیں تھے۔ ان کے بڑے صاحبزادے حسین نظامی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہاں تھوڑی دیر ان سے بات چیت ہوتی رہی اور چائے پانی سے کچھ تواضع بھی ہوئی۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب موصوف فاسفورس کے تیل اور سویابین کا بہت اشتہار دے رہے تھے۔ جانے کیسے، ان چیزوں کا ذکر چل پڑا۔

سین نظامی صاحب نے ان دونوں چیزوں کا ایک ایک نمونہ ہمیں پیش کیا اور ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے رخصت ہوئے۔

باہر نکلے، تو میں نے کہا کہ اب آئے ہیں تو چلیے، آپ کے دادا جان کے مزار پر بھی فاتحہ پڑھ لیں۔ چنانچہ ہم گھومتے گھامتے چونسٹھ کھمبے کے پاس اس احاطے میں پہنچ گئے، جہاں غالب ابدی نیند سو رہے ہیں۔ یہاں فاتحہ کے بعد مختلف قبروں کی نشان دہی کرتے رہے۔ چنانچہ بتایا تھا کہ غالب کے پاس والی قبر معروف کی ہے۔ اس کے بعد معروف کی بیوی ہیں۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے علی بخش خان کی قبر ہے۔ معروف کی پائینتی ان کے ایک مرید محمد حیات خان ولد احمد یار خاں (رامپوری؟) ہیں اور ان کے برابر میں ان ہی کے صاحبزادے خان بہادر محمد نظام الدین خان ہیں۔

دلّی کی ایک ایک اینٹ کے نیچے ایک داستان اور ایک تاریخ دفن ہے۔ ہم یہ اینٹیں الٹتے پلٹتے، باتیں کرتے اور مختلف بزرگوں اور بادشاہوں کی آرامگاہوں سے درس عبرت لیتے ہوئے وہاں پہنچے جہاں گاڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ اب جو چلے، تو ڈیڑھ ایک بجے کے لگ بھگ قطب میں بھول بھلیوں پر آکر دم لیا۔ یہاں کے انتظام دیکھ کر میں کچھ متعجب سا ہوا۔ شمالی برآمدے میں دریاں بچھی تھیں، ایک طرف چولہا گرم ہو رہا تھا۔ ایک ملازم چائے کا سامان ایک چھوٹے سے تخت پر قرینے سے لگا رہا تھا۔ جب ہم داخل ہوئے، تو نواب صاحب نے ملازم سے پوچھا: کہو میاں، بھائی کے آنے میں کتنی دیر ہے۔ حضور، وہ اب آنے ہی والے ہیں۔ آپ تشریف رکھیے۔ حکم ہو تو چائے تیار کر دوں۔ نہیں میاں ہم بھائی کے آنے سے پہلے کیسے پی لیں، یہ تو ٹھیک نہیں۔ حضرت اتنے تکلف کی کیا ضرورت ہے، وہ آئیں گے تو دوسرا دور ہو جائیگا۔ بس چٹکی میں تیار کیے دیتا ہوں۔ پانی تو آگ پر رکھا ہی تھا، اس نے پل مارتے میں چائے کی دو پیالیاں بنا کے ہمارے سامنے رکھ دیں۔ نواب صاحب کا حال تو مجھے معلوم نہیں، لیکن میں اس دو تین گھنٹے کی کھنڈر

گردی سے خاصی بھوک سی محسوس کرنے لگا تھا۔ ہم ابھی چائے ختم بھی نہیں کر چکے تھے، کہ نیچے سڑک پر ایک گاڑی آکے رکی اور اس میں سے ایک بزرگ برآمد ہوئے۔ ۵۵۔۶۰ برس کا سن، سانولا رنگ، لانبا قد، اکہرا جسم، کھچڑی داڑھی، تھوڑی پر زیادہ کلوں پر کم، جسم پر بند گلے کا شیروانی نما لمبا گرم کوٹ، اور نیچے گرم پاجامہ، سر پر بادامی رنگ کی ٹوپی۔ وہ آئے اور آداب عرض کر کے، نواب صاحب کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ جب ایک دوسرے کا حال احوال پوچھ چکے، تو نواب صاحب نے کہا: بھائی! میں تم سے اس عزیز کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ پھر میرے متعلق چند کلمے کہہ کر مجھ سے فرمایا۔ آپ خان بہادر حکیم امجد علی خان صاحب ہیں، میرے بچپن کے لنگوٹیے: بھائی نہیں مگر بھائی سے عزیز تر۔

جن اصحاب نے ذوق کا تذکرہ پڑھا ہے، ممکن نہیں کہ وہ حافظ غلام رسول ویران کا نام نہ جانتے ہوں۔ ویران ذوق کے شاگرد تھے۔ شاگرد ہی نہیں، عاشق تھے۔ کیا مجال جو ان کی موجودگی میں کوئی استاد کے خلاف کچھ کہہ جائے۔ زبان ہی تک نہیں لاٹھی سے بھی اس کی خبر لینے سے نہیں چوکتے تھے۔ قدرت بڑی منصف مزاج ہے۔ اگر کہیں ایک طرف سے کمی رہ جاتی ہے تو اس کی کسر کہیں اور سے پورا کر دیتی ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ ویران نابینا تھے مگر بلا کے ذہین؛ اور حافظے کا کیا کہنا۔ قرآن حفظ تھا، ہزاروں شعر نوک زبان تھے۔ کسی نے کوئی اعتراض کیا اور انھوں نے ترت سے سند میں کسی استاد کا شعر پڑھا، جیسے اعتراض کے انتظار ہی میں تو بیٹھے تھے۔

ذوق ۱۸۵۴ء میں فوت ہوئے۔ وفات سے پہلے وہ اپنا دیوان جمع نہیں کر سکے تھے ان کی وفات کے بعد ان کے اکلوتے صاحبزادے خلیفہ محمد اسمٰعیل اور مولانا محمد حسین آزاد نے یہ کام ہاتھ میں لیا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ برپا ہو گیا۔ خلیفہ محمد اسمٰعیل بھی جنت سدھارے۔ بھرے گھر میں جھاڑو پھر گئی اور اس کے ساتھ ہی ذوق کا کلام بھی ضائع ہو گیا۔ جو بچا کھچا تھا اسے مولانا آزاد لے کر نکل بھاگے۔

ذوق کے شاگردوں کو قدرتی طور پر فکر ہوئی کہ اگر کلام جلد شائع نہ ہوا تو کل کو کوئی استاد کا نام لینے والا بھی نہیں ملیگا۔ ظہیر اور انور دونوں بھائیوں نے باہم مشورہ کیا اور حافظ ویران کے پاس پہنچے کہ یہ استاد کے سب سے زیادہ حاضر باش شاگرد تھے، اور اُن کا کلام بھی سب سے زیادہ انہی کو یاد تھا چنانچہ وہ بولتے گئے اور ظہیر اور انور لکھتے گئے اور اس طرح ان تینوں صاحبوں کی کوشش سے ۱۲۷۰ھ میں دیوان ذوق کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس کے ایک مدت بعد مولانا آزاد نے بہت کچھ کتر بیونت کر کے، بلکہ اپنی طرف سے اضافے کر کے ایک اور دیوان شائع کیا، جو اب متداول ہے۔

حافظ ویران استاد کی زندگی بھر قلعۂ معلےٰ میں رہے۔ ان کی وفات کے بعد محلہ کشن گنج (دلی) میں رہنے لگے۔ ۱۳۰۵ھ میں فوت ہوئے۔ "خاک شدہ خواجہ" تاریخِ وفات ہے جو انہوں نے خود ہی اپنی وفات سے دو برس پہلے نکالی تھی۔ حضرت خواجہ باقی اللہ کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ بیرونی احاطے کے دروازے سے ملی ہوئی ان کی قبر ہے۔ لوحِ مزار پر یہ شعر کندہ ہے:

فاتحہ مرقدِ ویراں پہ بھی پڑھتے جانا
ان سے کہہ دو جو ہیں اس رہ سے گزرنے والے

اولاد میں صرف ایک صاحبزادی چھوڑی۔ یہ حکیم امجد علی خان صاحب اسی صاحبزادی کی یادگار تھے۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ حکیم صاحب موصوف ویران کے نواسے ہیں تو مجھے ایک پرانا مسئلہ یاد آ گیا۔

میرے دلی آنے سے کچھ دن پہلے لاہور کے ایک نوجوان ادیب نے "خاقانیِ ہند" کے نام سے ذوق کی سوانح عمری لکھی تھی۔ اس میں انھوں نے اور الم غلم باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھ دیا کہ ذوق مذہباً شیعی تھے۔ میرے نزدیک یہ بات درست نہیں تھی۔ اس پر میں نے اس کی تغلیط میں ایک مختصر تحریر نگار میں شائع کی تھی۔ میں نے

استدلال خود ذوق کے کلام سے کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کچھ ایسا قابلِ اطمینان ذریعۂ تحقیق نہیں۔ اب یہ سن کر کہ حکیم صاحب ایک ایسے شخص کے عزیز ہیں، جو ذوق کا دن رات کا مصاحب تھا، میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ سے کبھی اپنے نانا جان سے ذوق کے معتقدات سے متعلق بھی کوئی بات چیت ہوئی تھی؟ فرمایا، پہلے تو میں ان کی وفات کے وقت بہت چھوٹا تھا، اس لیے مجھے ایسی باتوں سے کچھ دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی؛ لیکن اگر ہوتی، تو بھی میرا سر پھرا تھا کہ میں ان سے کوئی بحث ذوق سے متعلق کرتا۔ اگر انھیں کہیں ہلکا سا شبہہ بھی ہو جاتا کہ میرے سوال سے استاد کی تنقیص یا اعتراض کا پہلو نکلتا ہے، تو وہ میری کھوپڑی نہ ادھیڑ ڈالتے۔ لیکن اس کا میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ ذوق شیعی نہیں تھے؛ بلکہ اہل سنت والجماعت میں سے تھے۔

معلوم ہوا کہ حکیم صاحب کا معمول ہے کہ اکتوبر سے لے کر مارچ تک، جاڑوں کے چھ مہینے، ہر اتوار دوپہر کو یہاں بھول بھلیاں پر آجاتے ہیں۔ سردی ہو، پانی برسے، آندھی ہو یا طوفان آئے، ان کے اس معمول میں فرق نہیں آسکتا۔ اگر آپ کسی اتوار کو حکیم صاحب کو یہاں موجود نہ پائیں، تو سمجھ لیجیے کہ یا تو وہ دلی میں نہیں، یا اتنے بیمار ہیں کہ بستر پر سے ہلنے کی تاب نہیں۔ دلی میں ہوتے ہوئے اور صحت کی حالت میں، ناممکن ہے کہ وہ یہاں نہ آئیں۔

کوئی گھنٹے بھر میں دوست احباب جمع ہونا شروع ہو گئے۔ بیشتر شاعر حضرات تھے۔ ان میں دو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو خضر میرزا مرحوم تھے، دوسرے ظہیر دہلوی کے نواسے سید اشتیاق حسین شوق۔ خضر میرزا، میرزا زین العابدین خان عارف کے بھتیجے اور جناب سائل صاحب کے قریبی عزیزوں میں سے تھے، بلکہ رشتے میں بھائی ہوتے تھے۔ سائل نواب احمد بخش خان کے پرپوتے تھے، اور خضر میرزا ان کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خان معروف کے نواسے کے

بیٹے، گویا چار پیڑھی اوپر دونوں کا جدِ اعلیٰ ایک تھا۔ خضر میرزا انگریزی حکومت کے زمانے میں مختلف معزز عہدوں پر فائز رہے۔ نوکری سے پنشن پانے کے بعد اب یہیں مہرولی میں اپنے خاندانی مکان میں رہتے اور سارا وقت عبادت میں گزارتے تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ برس سے زیادہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود جسم نہایت چاق و چوبند، طبیعت حد درجہ حاضر اور حافظہ غیر معمولی طور پر تیز تھا۔ انھوں نے بیسیوں ایسے ایسے لطیفے سنائے کہ ہنستے ہنستے ہمارے آنسو نکل آئے۔ آپ یہ سن کر تعجب کرینگے کہ باوجود پیرانہ سالی اور تدیّن کے انھیں غیر ثقہ بلکہ عریاں لطیفے تک کہنے میں باک نہیں تھا ـــــ ان میں سے ایک لطیفہ نقل کرتا ہوں، جو نسبتاً کم عریاں ہے:

ایک مولوی صاحب تھے، نماز کا وقت آیا تو مسجد میں تشریف لائے۔ پہلے مسواک کی، پھر لوٹا ہاتھ میں لیے جائے ضرور میں گئے اور واپس آکے وضو کرنے لگے۔ ابھی وضو ختم نہیں کر پائے تھے کہ ان کی ہوا خارج ہوگئی اور وہ بھی آواز سے۔ اس پر جو صاحب ان کے قریب حوض پر بیٹھے وضو کر رہے تھے، بولے کہ "یہ باواز بلند احتجاج کر رہی ہے کہ آپ نے منہ میں تو مسواک کی، لیکن مجھ غریب کو پوچھا تک نہیں" (اب بھی میں نے بعض لفظ حذف کر دیے ہیں اور بعض بدل ڈالے ہیں)

معلوم ہوا کہ جوانی کے عالم میں شعر بھی کہتے اور خضر تخلص کرتے تھے۔ ان کا ایک شعر مجھے آج تک یاد ہے:

خضرؔ! یہ بھی خدا کی قدرت ہے
بُت ہمیں راستہ بتاتے ہیں

اس کے ساتھ انھوں نے مومن کا یہ شعر پڑھا تھا:

کل جو مسجد میں جا پھنسا مومن
رات کاٹی خدا خدا کر کے

سید اشتیاق حسین کا نام اس لیے یاد رہ گیا کہ اس دن انھوں نے مختلف شاعروں کے پڑھنے کی ایسی ہو بہو نقل اتاری تھی کہ نقل پر اصل کا گمان ہوتا تھا خوش قسمتی سے میں دورِ حاضر کے اکثر مشہور شاعروں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں اور میں نے ان کا کلام ان کی زبان سے سنا ہو۔ اس لیے میں نے ان سے فرمایش کرکے بعض شاعروں کی نقل اتارنے کو کہا اور وہ ہر مرتبہ امتحان میں پورے اترے۔ سائل صاحب اپنا کلام بہت ترنم سے پڑھتے تھے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ داغ کے آخری زمانے میں، جب یہ حیدرآباد میں مقیم تھے، مشاعروں میں اکثر حضور نظام اور استاد داغ کی غزلیں یہ پڑھا کرتے تھے۔ آج کل تو مشاعروں کا حال تباہ ہو گیا ہے۔ جو شاعر گلے بازی سے قاصر ہے، لوگ اُسے سننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ لیکن سائل صاحب کے پڑھنے میں اور ہمارے موجودہ شاعروں کے پڑھنے میں بہت فرق تھا۔ وہ گاتے نہیں تھے (بتانے کا تو کیا ذکر) اس کے باوجود ان کے پڑھنے میں ایک خاص لذت اور دلکشی تھی، جو بس سننے سے تعلق رکھتی تھی۔ افسوس، یہ انداز ہی ختم ہو گیا۔ جب شوق صاحب بیشتر شاعروں کی نقل اتار چکے، تو میں نے ان سے کہا کہ اب سائل صاحب کی نقل فرمائیے۔ کہنے لگے، یہاں میری ترکی تمام ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے صرف ایک مصرع تک ان کی نقل اتاری ہے، اور اس پر بھی مجھے کچھ اطمینان نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے وہ مصرع دہرایا۔ اگرچہ انیس بیس کا فرق تھا، تاہم بڑی حد تک وہ سائل صاحب کی آواز معلوم ہوتی تھی۔ سائل صاحب نے سن کر صرف اتنا کہا: تم بڑے شریر ہو۔

اس کے بعد کتنی ہی مرتبہ مجھے ان ہفتہ واری جلسوں میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ اور ہر بار میں ان اصحاب کی مہربانی اور خلوص، محبت اور وضعداری سے نیا اثر لے کر واپس آیا۔ ہماری آخری دور کی تہذیب میں وضعداری کو بہت دخل تھا۔ اس کی گرفت ملکی قانون اور مذہبی احکام سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ کیا مجال

جو آپ ان بزرگوں کو اس ڈگر سے ادھر ادھر ہٹا سکیں، جو انھوں نے پہلے دن اپنے لیے پسند کر لی تھی۔ حکیم صاحب کی وضعداری کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:
ان کے ہاں رمضان کے مہینے میں ہر جمعے کو افطاری کی تقریب ہوتی تھی۔ اس میں وہ اپنے خاص احباب کو تو مدعو کرتے ہی تھے، لیکن اس کے علاوہ بھی صلائے عام تھی۔ اس دن جس کا جی چاہے، ان کے ہاں پہنچ جائے اور روزہ افطار کرے۔ ہر ایک کی مناسب آؤ بھگت ہوتی۔ کھانے کو مٹھائی اور پینے کو موسم کے مطابق چائے، شربت وغیرہ سے تواضع کی جاتی۔ میں نے صرف ایک جمعے کو حاضری دی تھی۔ بلامبالغہ سوسوا سو آدمی سے کم نہیں ہوگا۔ افطاری کے بعد بےتکلف احباب ٹھہر جاتے۔ کچھ دیر تفریح رہتی۔ شعروشاعری ہوتی۔

حکیم صاحب موصوف نے ۲۳ ستمبر ۱۹۳۸ء کو نواسیر کے مرض سے وفات پائی اور اپنے نانا دیران مرحوم کی طرح درگاہ خواجہ باقی اللہؒ میں دفن ہوئے۔ سائل صاحب نے اپنے دیرینہ دوست کی تاریخِ وفات کہی جو لوحِ قبر پر کندہ ہے:

بود مرد از نسلِ افغاں چارہ سازِ بیکساں — حاجیِ بیت الحرام و زائرِ دار النبیؐ
کرد رحلت از جہان و داد رنجِ بیکراں — از فراقِ جاودانی وز وداعِ دائمی
سالِ تاریخِ وفاتش، سائلِ دہلی نوشت
"فردِ عالم، خان صاحب حاجی امجد علی"
(۱۳۵۷)

ان کے بعد وہ قطب صاحب کے ہفتہ واری اجتماع بھی ختم ہو گئے۔

وہ جلسے ہو چکے خلد آشیاں تک

سچ ہے، ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

سائل صاحب کی پہلی بیوی نواب ممتاز حسین خان والیِ پٹودی کی ہمشیر تھیں، لیکن میاں بیوی میں بنھ نہ سکی اور علاحدگی ہو گئی۔ اس بیوی سے ان کے ایک بیٹا ہوا تھا جو صغرسنی میں فوت ہو گیا۔ اس کا نام معظم مرزا تھا۔ یہی لڑکا ان کی کنیت

—— ابوالمعظم کا باعث ہوا۔ اس کے بعد ان کا دوسرا نکاح استاد داغ کی منہ بولی بیٹی لاڈلی بیگم سے ہوا، جو ان کے چھوٹے بھائی میرزا ممتاز الدین احمد خان کی بیوہ تھیں۔ داغ کی اپنی صُلبی اولاد صرف ایک بیٹا احمد تھا، جو انھیں کمسری میں داغ دے گیا۔ انھوں نے ایک شعر میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

احمد کے غم میں، دیدہ و دل کیوں نہ ہوں تباہ
آنکھوں کا نور تھا، مرے دل کا سرور تھا

اس کے بعد داغ نے لاڈلی بیگم کو گود لے لیا، جو ان کی سالی اودیا بیگم کی نواسی تھیں۔ اس سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ کیوں ضمیر مرزا مرحوم کے ملازم نے مجھ سے کہا تھا کہ وہی نواب سراج الدین احمد خان، جن کے گھر میں باہر کی بیگم ہیں۔ نیز میں نے جو شروع میں ذکر کیا ہے کہ ڈیوڑھی کے اندر صدر دالان کے دروازے کے اوپر ایک تختی پر لکھا تھا "مکان لاڈلی بیگم" تو اس کا کیا مطلب تھا۔

لاڈلی بیگم صاحب عمر میں سائل صاحب سے کوئی بیس برس چھوٹی تھیں۔ یعنی جب سائل صاحب سے ان کا نکاح ہوا ہے، تو وہ کوئی ۱۸، ۱۹ برس کی تھیں اور یہ ۳۸، ۳۹ برس کے۔ ایک تو اس وجہ سے اور دوسرے یہ کہ وہ استاد زادی تھیں، نواب صاحب بہت حد تک ان سے دبتے تھے۔ ان کے خلافِ طبع بات نہیں کرتے تھے اور یہ اُن سے نرم گرم بات کر لیتی تھیں۔ مثلاً ۱۹۳۷ء کے جاڑوں میں سائل صاحب حیدرآباد گئے، وہاں ایک افسوسناک حادثہ پیش آیا، جس سے ان کے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد وہ بہت معذور ہو گئے اور بیساکھیوں کے بغیر چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ بیشک اس عمر میں ایسی سخت چوٹ مشکل ہی سے بالکل ٹھیک ہو سکتی ہے، لیکن اگر مناسب علاج ہوتا اور نواب صاحب احتیاط کرتے، تو ممکن تھا کہ وہ تھوڑا بہت چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتے۔ لیکن ان کے مزاج میں

ایک طرح کا چھیلاپن اور سہل انگاری تھی۔ انھوں نے نہ صرف خود اس طرف مناسب توجہ نہ کی، بلکہ اس معاملے میں وہ کسی اور کی بھی نہیں سنتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ بعض اوقات بیگم صاحب بہت خفا ہوتیں ـــــ اور زچ ہو کے کہا کرتی تھیں: یہ تو مرض کو پال رہے ہیں۔ بھلا جب تک اس کا مناسب علاج نہیں ہوگا، یہ کیسے تندرست ہو جائینگے۔

سائل صاحب اپنے استاد کا بہت ادب کرتے تھے۔ دن میں کسی نہ کسی سلسلے میں دسیوں ہی مرتبہ ان کا ذکر آجاتا، داغ صاحب کی یہ بات، داغ صاحب کی وہ بات۔ اپنے استاد بھائیوں کے ساتھ بھی ان کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ احسن مارہروی، نوح ناروی، بیخود دہلوی، ان حضرات سے میری پہلی ملاقات سائل صاحب ہی کے ہاں ہوئی۔ استاد داغ کے خاندان کی کتنی باتیں مجھے سائل صاحب سے معلوم ہوئی تھیں، جن میں سے بعض گفتنی ہیں، بعض ناگفتنی۔

ایک دن ان سے متعلق گفتگو ہو رہی تھی، میں نے کہا: آپ کے خاندان نے انھیں نواب شمس الدین احمد خان کا بیٹا تسلیم نہیں کیا۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟ یاد نہیں، ہمارے قریب کونسی کتاب رکھی تھی، اس میں داغ کی تصویر بھی تھی۔ اسے کھول کے یہ تصویر مجھے دکھاتے ہوئے بولے: تم نے ہمارے خاندان کے کئی آدمیوں کو دیکھا ہے اور ہمارے بزرگوں میں سے بعض کی تصویریں بھی دیکھی ہیں۔ اب یہ تصویر دیکھو اور خود فیصلہ کر لو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ داغ اور لوہارو خاندان کے افراد میں حیرت انگیز مشابہت ہے، وہی وضع قطع، وہی نقشا، وہی خدوخال۔ اگر قیافہ کوئی چیز ہے، تو اسے مدِ نظر رکھتے ہوئے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس خاندان میں سے نہیں تھے۔

میں نے جب اس رائے کا اظہار کیا، تو فرمایا: بلاشبہ جو کچھ تم نے کہا، بالکل سچ ہے۔ بس ایک فرق تھا۔ ہمارے گھرانے میں سب کا رنگ بہت گورا چٹا رہا ہے۔ داغ صاحب

اس کے برعکس اچھی خاصی سانولی رنگت کے تھے۔ لیکن تم پڑھے لکھے آدمی ہو، جانتے ہو کہ یہ بات ایسی نہیں کہ محض اس وجہ سے ہم انھیں اپنے خاندان سے خارج کر دیں۔ مجھے تو کبھی ایک لمحے کے لیے بھی شبہہ نہیں ہوا کہ وہ غیر ہیں؛ میں تو انھیں چچا جان کہا کرتا تھا۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ جب نواب شمس الدین احمد خان کو پھانسی ہوئی ہے، تو لوہارو خاندان والوں نے داغ کو اس لیے ان کا بیٹا تسلیم نہیں کیا کہ کہیں انگریز انھیں ریاست کا وارث نہ قرار دے دیں۔ سارا خاندان شمس الدین احمد خان کے خلاف تھا، اور ننھیال کی طرف سے داغ کی پشت پر کوئی تھا نہیں، اس لیے وہ لوگ آسانی سے اس میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن بعد کو جب نواب امین الدین احمد خان گدی پر بیٹھ گئے، اور اب اس کا اندیشہ نہیں رہا تھا، تو آہستہ آہستہ ان کی مخالفت میں کمی آ گئی تھی۔

ایک اور بات کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

داغ کی شاعری کو دیکھ کے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ شخص شراب ضرور پیتا ہوگا۔ ایک مرتبہ نیاز فتحپوری نے داغ کے غالباً اس شعر پر

کچھ زہر نہ تھی شرابِ انگور
کیا چیز حرام ہو گئی ہے

لکھا تھا کہ جس شخص نے کبھی پی نہ ہو، وہ ایسا شعر کہہ ہی نہیں سکتا۔ میں نے ایک دن سائل صاحب سے اس کے متعلق پوچھا۔ انھوں نے نہایت وثوق سے فرمایا: داغ صاحب نے کبھی شراب نہیں پی؛ لوگوں کا یہ بالکل غلط خیال ہے کہ وہ پیتے تھے۔

مجھے سائل تخلص ہمیشہ کھٹکتا تھا۔ شعر و شاعری کی باتیں ہو رہی تھیں کہ میں نے کہا: قبلہ! آپ کے جدِ امجد ضیاء الدین نیرؔ رخشاں، والد شہاب ثاقب، آپ کا تخلص سراج منیر

کی رعایت سے متغیر ہونا چاہیے تھا، یہ سائل کیا ہوا؟ فرمایا: تم نے کیا بات یاد دلادی۔ میری شاعری کا آغاز تھا۔ ان دنوں میں نواب غلام حسن خاں محو سے اصلاح لیتا اور سراج تخلص کرتا تھا۔ چچا باوا نواب احمد سعید خان کو یہ تخلص پسند نہیں تھا۔ لیکن کوئی اور موزوں تخلص بھی ان کے خیال میں نہیں آتا تھا۔ ایک دن وہ نواب غلام حسن خان کے کمرے پر تشریف فرما تھے۔ میں بھی خدمت میں حاضر تھا کہ پھر میرے تخلص کی بات چھڑ گئی۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک شریف صورت شخص دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ کسی نے پوچھا کون ہے؟ اس نے جواب میں صرف اتنا کہا، سائل ہوں۔ خیر، اسے تو کچھ دے دلا کر رخصت کیا، لیکن اس کے ٹلنے کی دیر تھی کہ محو صاحب کہنے لگے: لو بھائی تمہاری مشکل حل ہو گئی۔ اس صاحبزادے کا تخلص سائل رکھ دو۔ چچا ابا کو بھی یہ پسند آگیا۔ چنانچہ اس دن سے ہم سراج سے سائل ہو گئے۔

خدا نے ان کے اس تخلص میں برکت دی اور یہ ایسا مشہور ہوا کہ آپ سائل دہلوی کہیں، تو ذہن کسی اور طرف جا ہی نہیں سکتا۔ خود انھیں بھی اس کا خوب احساس تھا۔

گرمیوں میں جب حکومتِ ہند کے دفتر شملے جایا کرتے تھے، تو یار لوگ یہاں کی سردی کو شعر و سخن کی گرم بازاری سے کم کرنے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ ہر سال یہاں اچھے خاصے بڑے پیمانے پر ایک مشاعرہ منعقد ہوا کرتا تھا، جس میں شرکت کے لیے ہندستان کے مختلف حصوں سے مشاہیر کو دعوت دی جاتی تھی۔ سائل صاحب بھی ان مشاعروں میں آتے تھے۔ ۱۹۳۷ء کے مشاعرے کے بعد جب وہ ہال سے نکل رہے تھے، تو کسی نومشق نے پوچھا کہ دلّی میں آپ کا پتا کیا ہے، جس پر آپ کی خدمت میں خط لکھا جا سکے۔ یک دم کھڑے ہو گئے اور ہاتھ کی لکڑی کو زمین پر مارتے ہوئے چمک کے بولے: میاں صاحبزادے، خط پر صرف "سائل دلّی"

لکھ دینا، مجھے مل جائیگا۔ اسی طرح کا جواب ایک موقع پر غالب نے نواب علاؤالدین احمد خاں کو دیا تھا کہ بیشک صرف میرا نام اور دلّی لکھ دیا کرو، مجھے خط پہنچ جائیگا۔ لیکن اس کے باوجود طبیعت میں حد درجہ انکسار اور مروّت کا مادہ تھا۔ کوئی ان کے پاس چلا جائے، انھیں ملنے اور اس کی فرمائش پورا کرنے سے انکار نہیں ہوتا تھا۔ کوئی صاحب تشریف لے آتے اور کلام سنانے کی فرمائش کر دیتے۔ وہ اندر سے بیاض منگواتے، اور شعر سنانے لگتے۔ اب جب تک وہ شخص خود یہ نہ کہہ دے شکریہ، بس کیجیے یا کوئی اور ذکر نہ چھڑ جائے، سائل صاحب بیاض ہاتھ سے نہ رکھتے۔ اگر کوئی صاحب ذوق آدمی ہوتا، تو خیر ایک بات بھی تھی، لیکن بعض اوقات ایسے ایسے گاؤدیوں سے واسطہ پڑ جاتا، جو نظم اور نثر کا فرق تک نہیں جانتے تھے۔ اب جائے ماندن، نہ پائے رفتن۔ لیکن نواب صاحب بڑے اطمینان سے اسی طرح اُن سے بھی پیش آتے۔ میں بہت جز بز ہوتا۔ ایک آدھ مرتبہ میں نے شکایت بھی کی کہ آخر آپ کیوں ایسے کور ذوقوں کو ٹال نہیں دیتے! ہمیشہ یہی جواب ملا۔ بھائی، انکار کرنے کی جرأت نہیں پڑتی کہ اس سے اس کی دل شکنی ہو گی۔ تم نے سنا نہیں۔ دل بدست آور کہ حج اکبر است۔

ان کی زبان کی تعریف کرنا تحصیل حاصل ہے کہ ان کے خاندان کی زبان ہمیشہ مستند اور ٹکسالی سمجھی گئی ہے۔ اگر اُردوئے معلّےٰ کا لطف لینا ہو تو سائل کا کلام دیکھیے۔ باوجود داغ کا شاگرد ہونے کے، انھوں نے استاد کی حیدرآبادی شاعری کا تتبع نہیں کیا۔ یہ چیز داغ سے مخصوص تھی اور انھی کے ساتھ ختم ہو گئی۔ امیر مینائی نے اس میدان میں مقابلے کے لیے کیا کچھ کوشش نہیں کی، لیکن نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ امیر کے شاگردوں میں سے ریاض خیرآبادی، حفیظ جونپوری اور جلیل مانکپوری نے اس رنگ کو نباہنے کی کوشش کی اور بہ فرق مراتب اس میں کامیاب بھی ہوئے، مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔

خود داغ کے شاگردوں میں بعض بہت کامیاب ہوئے۔ احسن مارہروی، نوح ناروی، بیخود دہلوی اساتذۂ فن ہیں۔ مضطر خیرآبادی کی غزل میں استاد کا رنگ چوکھا ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ داغ اپنے رنگ کا بانی اور خاتم ہے۔ سائل نے شروع سے بھانپ لیا تھا کہ اس کوشش میں وقت ضائع کرنا بیسود ہے۔ انھوں نے اپنے لیے نئی راہ نکالی۔ زبان تو دلی کی ہونا ہی چاہیے تھی۔ انھوں نے اس میں خالص عاشقانہ خیالات اور محاکات کے علاوہ مضمون آفرینی کی طرف توجہ کی۔ اور بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ انھوں نے بعض اوقات بہت مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے اور ان میں ایسے ایسے شگفتہ اور پُر لطف شعر نکالے ہیں کہ یہ کچھ انہی سے ممکن تھا۔

ان کی شاعری کی عمر ساٹھ برس کے قریب تھی اور بلا مبالغہ ایک لاکھ شعر سے کم ان کا سرمایہ نہیں ہوگا۔ لیکن ان کا بہت بڑا کارنامہ ان کی مثنوی "نور علیٰ نور" ہے جس میں بنیادی طور پر اگرچہ نورالدین جہانگیر پادشاہ اور ملکہ نورجہان بیگم کی حیاتِ معاشقہ کا بیان ہے، لیکن اس میں اور بھی بیسیوں مسائل آگئے ہیں۔ افسوس کہ یہ نامکمل رہ گئی، ورنہ خاصے کی چیز ہوتی۔ اب بھی اس میں سات آٹھ ہزار شعر سے کم نہیں ہوگا۔

زمانے کا مذاق بدل گیا۔ ان کے پورے دیوان کو کون چھپوائیگا اور کون پڑھیگا۔ لیکن اگر کوئی اللہ کا بندہ چار پانچ ہزار شعر کا انتخاب ایک مجلد میں شائع کر دے، تو یہ زبان کی واقعی خدمت ہوگی۔ اور مثنوی تو ضرور چھپ جانا چاہیے۔ اگرچہ وہ نامکمل ہی ہے۔ بقول نظیری نیشاپوری

ہزار نقش درین کارگاہ در کار است
کمیر خوردہ، نظیری! ہمہ نکو بستند

نواب صدر یار جنگؒ

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

نواب صدر یار جنگ سے میری ملاقات محض حسنِ اتفاق کا نتیجہ تھی۔ وہ بالعموم علی گڈھ یا حبیب گنج میں رہا کرتے تھے، میں دلّی سے آگے کبھی گیا ہی نہیں تھا۔ ان کا حلقۂ احباب مجھ ہیچ میرز و ہیچ مداں سے بہت بلند تھا، اور عمر کا جو فرق تھا وہ ظاہر ہی ہے۔ پس عام حالات میں اس بات کا بہت کم امکان تھا کہ ہم کبھی ایک دوسرے سے مل سکتے؛ لیکن اس کے باوجود ہم ملے۔

ہوا یہ کہ، ۱۹۳۶ء میں مجھے غالب کی کتاب "سبدچین" دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ یہ مختصر سا مجموعہ جس میں مشکل سے چھ سات سو شعر ہوں گے، غالب نے اپنی زندگی کے آخری ایام یعنی ۱۸۶۷ء میں شائع کیا تھا۔ لیکن چونکہ اس کے بعد نہ یہ الگ کہیں سے چھپا، نہ کلیات ہی کے کسی ایڈیشن میں شامل کیا گیا، اس لیے مدت سے نایاب ہو چکا تھا۔ غالب کی بعض اپنی تحریروں اور یادگارِ غالب میں اس کا ذکر موجود ہے، اور یہیں سے مجھے اس کا پتا چلا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر بعض احباب کی خدمت میں لکھا کہ اگر آپ کے پاس یہ کتاب ہو تو چند دن کے لیے مستعار عنایت فرمائیے۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ نہ یہ ہمارے یہاں ہے،

نہ ہم نے اسے دیکھا ہے۔ البتہ مولانا سیّد سلیمان ندوی مرحوم نے اتنا اضافہ کیا کہ نواب صدر یار جنگ کی خدمت میں لکھ کے پوچھو، ممکن ہے ان کے کتابخانے میں اس کا کوئی نسخہ محفوظ ہو۔ چنانچہ میں نے ان کی خدمت میں لکھا۔ بارے اب کے تیر نشانے پر بیٹھا۔ ان کا جواب یہ مژدہ لایا کہ "سبد چین" کا ایک نسخہ میرے یہاں موجود ہے۔ یہ تھی تقریب تعارف۔

یہ گرمیوں کا ذکر ہے۔ میں ان ایّام میں اپنے کام کے سلسلے میں شملے میں مقیم تھا۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ اگر ممکن ہو، تو یہ کتاب مجھے مستعار بھیج دی جائے، میں اس کی نقل لے کر اسے بحفاظت واپس کر دونگا۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ آپ کہاں اتنی زحمت کرینگے، میں یہیں سے اس کی نقل لے کر چند دن میں بھجوا دونگا۔ چنانچہ پندرہ بیس دن کے بعد انھوں نے یہ نقل مجھے بھیج دی۔ آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں نے اس کی تلاش میں پانچ چھ مہینے صرف کیے تھے اور تقریباً مایوس ہو چلا تھا۔ اگرچہ یہ چیز میرے اندازے سے بہت کم حجم کی نکلی؛ تاہم کچھ بھی ہو غالب کا کلام تھا اور اتنا نایاب کہ بڑے بڑے صاحب ذوق حضرات کے کتابخانے اس سے خالی تھے، اور وہ خود اس سے ناواقف تھے۔ اس لیے میں جتنا بھی فخر کرتا کم تھا۔

انھوں نے جو نقل مجھے بھیجی، اس میں بہت غلطیاں تھیں۔ اب میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ آیا اصلی کتاب ہی اتنی غلط چھپی ہے، یا نواب صاحب کے کاتب نے روایتی اصلاحیں دی ہیں۔ ان میں سے کئی غلطیاں تو ایسی تھیں کہ میں نے خود ہی اٹکل سے انھیں درست کر لیا۔ پھر بھی کچھ ایسی رہ گئیں کہ ان کے سمجھنے سے قاصر رہا۔ ایک آدھ جگہ لفظ ہی لکھنے سے رہ گئے تھے۔ میں نے جب اس کا اظہار ان سے کیا تو جواب ملا کہ اگرچہ کاتب بہت محتاط آدمی ہے، لیکن ممکن ہے کہ اس سے غلطیاں ہو گئی ہوں۔ اس پر میں نے دل میں طے کیا کہ جب دلّی جانا ہوا، تو

ایک دن کے لیے علی گڑھ چلا جاؤنگا، اور اصلی نسخے سے اس کا مقابلہ کرکے درستی کرلونگا۔ نواب صاحب مرحوم نے بھی مجھے دعوت دی کہ جب پہاڑ سے اتریں، تو یہاں آیئے اور کتابخانہ دیکھ جایئے۔ یہ تو عین میری خواہش تھی میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے آنے کا وعدہ کرلیا۔

اس کے تھوڑے دن بعد میں دلّی آیا۔ یہاں ایک دن میں کوئی کتاب دیکھ رہا تھا کہ اس میں حکیم مومن خان کے فارسی دیوان کا ذکر پڑھا۔ میں نے پھر ان کی خدمت میں لکھا کہ کیا آپ کے ہاں حبیب گنج میں مومن کا فارسی دیوان ہے؟ انھوں نے فوراً جواب دیا کہ ہاں، دیوان کا ایک نسخہ موجود ہے، لیکن اب میں اُسے آپ کو بھیجونگا نہیں، اپنا وعدہ وفا کیجیے، یہاں آیئے اور جو چاہیں، لے جایئے۔ میں خود کتنے دن سے وہاں جانے کے لیے پر تول رہا تھا، لیکن مکروہات اجازت نہیں دیتے تھے، اسی حیص بیص میں دو تین مہینے نکل گئے۔ آخر ایک سہ پہر کو میں نے ہڑبڑا کے بستر باندھا اور بغیر اطلاع دیے علی گڑھ پہنچ گیا۔ گاڑی وہاں مغرب کے بعد پہنچی تھی اور اچھا خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ جب میں علی گڑھ کے اسٹیشن پر اترا ہوں، تو بوندیاں بھی پڑ رہی تھیں۔ اب مجھے احساس ہوا کہ یوں بے اطلاع آنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اگر وہ یہاں نہ ہوئے، تو پھر؟ لیکن یہ خیال ایک لمحے سے زیادہ میرے دماغ میں رہا نہیں۔ ہائے، کیا زمانہ تھا! دل نے کہا: اگر نہ ہوئے، تو کونسی قیامت آجائیگی، رات کی گاڑی سے واپس چلے جانا۔ بہرحال میں نے سواری لی اور چند منٹ میں میرس روڈ پر ان کی کوٹھی حبیب منزل میں جا پہنچا۔ وہ اس وقت موجود نہیں تھے۔ ملازم مجھے اندر جناب عبدالوحید خان صاحب کے پاس لے گیا۔ میں نے آداب عرض کیا اور اپنا تعارف کراکے خاموش ایک طرف بیٹھ گیا۔

نام آگیا ہے، اس لیے مناسب ہے کہ میں جناب عبدالوحید خان صاحب کا

تعارف کرا دوں۔

نواب صدر یار جنگ مرحوم نے اپنی عمر میں تین نکاح کیے۔ پہلی بیوی ان کے چچا حاجی عبدالشکور خان صاحب کی صاحبزادی تھیں، نواب صاحب مرحوم کے سب سے بڑے صاحبزادے، خان بہادر الحاج مولوی محمد عبیدالرحمٰن خان شروانی سلمہ اللہ تعالیٰ انہی بیگم کی اولاد ہیں۔ دوسری شادی بھی اپنے خاندان میں ہوئی۔ یہ بیگم جناب محمد عابد خان شروانی رئیس بھیکم پور کی ہمشیر تھیں۔ نواب صاحب کا تیسرا نکاح جناب مولانا عبدالغنی خان، مئو قائم گنج (ضلع فرخ آباد) کی دختر نیک اختر زینب بیگم سے ہوا۔ مولانا عبدالغنی خان مرحوم مشہور کتاب ارمغان آصفی کے مصنف ہیں، جس میں فارسی مصادر کے صلوں کی اسناد کلام اساتذہ سے جمع کردی گئی ہیں۔ یہ کتاب آٹھ حصوں میں چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ حوارِ عرب اور ایک تذکرۂ شعرائے فارسی بھی ان سے یادگار ہے۔ مولانا عبدالغنی خان، نواب صاحب کے استاد بھی تھے۔ انھوں نے فقہ اور حدیث اور تفسیر کی متعدد کتابیں ان سے پڑھی تھیں۔ یہی مولانا عبدالغنی صاحب، جناب عبدالوحید خان صاحب کے والد بزرگوار تھے اور جناب زینب بیگم ان کی سگی ہمشیر تھیں۔ وہ نفیس دلھن کے نام سے کبھی کبھی مضمون بھی لکھا کرتی تھیں۔

ایک اور بات یاد آگئی۔ غالب نے ایک غزل میں اپنے تمام فارسی گو معاصرین کا ذکر کیا ہے۔ قطعہ ہے:

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود   باد در خلوتِ شاں، مشک فشاں از دمِ شاں
مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ   حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظمِ شاں
غالبِ سوختہ جان، گرچہ نیرزد بہ شمار   ہست در بزم سخن، ہم نفس و ہمدمِ شاں

یہاں دوسرے شعر میں علوی سے مراد مولوی عبداللہ خان علوی ہیں۔ یہ علوی ہمارے مولانا عبدالغنی خان صاحب کے حقیقی ماموں تھے۔ وہ مولوی محمد اسمٰعیل

شہید دہلوی کے شاگرد تھے اور سید احمد شہید بریلوی سے بیعت تھے۔ طبابت میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ ۱۸۴۶ء میں اپنے وطن ہی میں تپ محرقہ سے وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ صہبائی انہی کے شاگرد تھے۔ تاریخ وفات ہے: "بنیادِ سخن نقاد"

بات سے بات یاد آتی ہے۔ غالب کے نانا مرزا غلام حسین خان آگرے کے رؤسا میں سے تھے۔ غالب نے اپنی والدہ جناب عزت النساء بیگم صاحبہ کا نام صرف ایک فارسی خط میں دیا ہے، جو انھوں نے آگرے ہی کے ایک صاحب خداداد خان اور ان کے بڑے صاحبزادے ولی داد خان کے نام لکھا تھا۔ اس خاندان کے غالب کی ننھیال سے لین دین کے تعلقات تھے اور اسی سلسلے میں غالب نے یہ خط بھی لکھا ہے۔ اصلی خط کتابخانۂ حبیب گنج میں موجود تھا (اور اب اسی کے ساتھ آزاد لائبریری علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں منتقل ہو گیا ہے) تو خیر، ان خداداد خان کے ایک اور صاحبزادے کریم داد خان بھی تھے۔ ان کریم داد خان کی اولاد میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ ان سب کے نام لکھنا تو غیر ضروری ہے۔ البتہ ان میں سے ایک صاحبزادی کا نام بسم اللہ بیگم تھا۔ وہ مولانا عبدالغنی خان سے منسوب تھیں، اور جناب عبدالوحید خان صاحب انہی بسم اللہ بیگم کے صاحبزادے ہیں۔ گویا یہ غالب کے مکتوب الیہ جناب خداداد خان کی پوتی کے بیٹے ہوئے۔ غالب کے جس خط کا اوپر ذکر ہوا، وہ انہی نے نواب صاحب مغفور کو دیا تھا، جو ان کے خاندانی کاغذات میں محفوظ تھا۔

یہ جملۂ معترضہ بحرِ طویل میں چلا گیا۔ بہر حال نواب صاحب نو بجے کے قریب مکان پر تشریف لائے۔ جونہی پہنچے، انھیں میرے آنے کی اطلاع ملی۔ فوراً اس کمرے میں آئے، جہاں ہم لوگ بیٹھے تھے۔ میں ایک طرف دیوار سے ٹیک لگائے دوزانو بیٹھا تھا۔ دروازہ کھلنے پر نظر اٹھا کے جو دیکھتا ہوں، تو وہ سامنے کھڑے تھے۔ اگرچہ

میں نے انھیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، لیکن میں نے قیافے سے فوراً پہچان لیا۔
پہلے حلیہ سنیے:

خاصا لانبا قد، کوئی پونے چھ فٹ کے قریب، کسرتی جسم، سرخ و سپید رنگت، بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی ستواں ناک، خضاب لگی ہوئی بھرواں ڈاڑھی۔ خضاب لگے کچھ دن ہو چکے تھے کیونکہ جڑوں سے سپیدی جھانکنے لگی تھی۔ چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، جس سے سامنے کے دانت نمایاں ہو گئے تھے، اور ان کے پان کے شوق کے غماز تھے۔ جسم پر بند گلے کا شیروانی نما گرم کوٹ اور نیچے غالباً اسی کپڑے کا پاجامہ تھا۔ سر پر ٹوپی تھی، اور اس کے اوپر منڈاسے کی شکل میں سپید شال اوڑھے تھے۔ ایسے خوبصورت اور جامہ زیب آدمی میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔

بہت تپاک سے ملے، اور اٹھا کے اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گئے۔ برآمدے میں سے گزرتے ہوئے فرمایا، آپ نے خط کیوں نہ لکھا؟ اسٹیشن سے یہاں تک آنے میں تکلیف ہوئی ہو گی آپ کو؟ مکان تو آسانی سے مل گیا تھا؟ آپ نے لکھا ہوتا تو میں کسی کو اسٹیشن پر بھیج دیتا۔ غرض اسی طرح تابڑ توڑ انھوں نے تین چار سوال کر دیے، لیکن لہجے میں کسی طرح کی عجلت اور گھبراہٹ نہیں تھی، بلکہ آواز بہت دھیمی اور نیچی تھی، اور ایک ایک لفظ انھوں نے الگ الگ کہا۔ کمرے میں پہنچے، تو چھوٹتے ہی فرمایا، میں تو آپ کو زیادہ عمر کا خیال کرتا تھا، آپ تو ماشاءاللہ بالکل جوان ہیں۔ میں نے عرض کیا، قبلہ، جوانی کی بھی ایک ہی کہی، ساری عمر جس ماحول میں بسر ہوئی ہے، وہاں یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ جوانی کس چیز کا نام ہے۔ "غمِ عشق" تو خیر نہیں، "غمِ روزگار" نے ہمیشہ پریشان رکھا، اس لیے دل جوانی ہی میں بوڑھا ہو گیا۔ کہنے لگے، میں تو آپ کے فارسی کے ذوق پر بہت حیران ہوا۔ ابھی "سبدِ چین" کی فرمائش سے جو تعجب ہوا تھا، وہی ختم نہیں ہوا تھا کہ آپ نے

مومن کے فارسی دیوان سے متعلق پوچھ بھیجا۔ پھر میری فارسی تعلیم کا حال پوچھا۔ فرمایا، میں مولانا سیّد سلیمان اشرف صاحب کے پاس گیا تھا، ایک مدّت سے یہ معمول ہے کہ جب یہاں علی گڑھ آتا ہوں، تو اگر وہ یہاں موجود ہوں، تو شام کا وقت ان کے ساتھ گزارتا ہوں، اور واپسی بالعموم عشا کی نماز کے بعد ہوتی ہے۔ آج معمول سے زرا دیر ہوگئی۔ پھر ان کی تعریف اور علم و فضل سے متعلق چند کلمات کہے۔ اس کے بعد موضوعِ سخن بدل گیا، فارسی اور اردو علم و ادب پر گفتگو ہونے لگی۔ اسی طرح رات گئے تک ہم بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میں دل میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ خواہ مخواہ ان کے آرام میں مخل ہو رہا ہوں، لیکن وہ اتنی محبت اور دل جمعی سے گفتگو فرما رہے تھے کہ اگر وہ اس میری بیوقت کی ہرزہ سرائی سے بے آرام بھی ہوئے، تو انھوں نے قطعی کسی طرح اسے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ آخر آدھی رات کے قریب میں نے باتوں باتوں میں اشارہ کیا، تو نہایت لطف سے فرمایا: ارے آپ کی دلچسپ باتوں میں مجھے اس کا تو خیال ہی نہیں رہا کہ آپ سفر سے آئے ہیں، تھکے ماندے ہونگے۔ اچھا اب آپ آرام کیجیے کل صبح انشاء اللہ حبیب گنج چلینگے۔ میں نے عرض کیا، یہ دو ڈھائی گھنٹے کا گاڑی کا سفر کونسا ایسا سفر تھا کہ میں تھک جاتا؛ آپ کی تکلیف کا خیال ہو رہا ہے۔ بہر حال ہم نے ایک دوسرے سے شب بخیر کہا اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اس دوران میں باہر بارش زیادہ شدید گی سے ہونے لگی تھی، اور ساتھ ہی ہوا بھی تیز چل رہی تھی۔ بدقسمتی سے میرے کمرے کے ایک روشندان میں کچھ خرابی تھی۔ یہ پوری طرح بند نہیں ہوا تھا اور ہوا سے اس کا پٹ کھٹکھٹاتا تھا۔ رات بھر اس بے ہنگم آواز کے باعث میں ٹھیک طرح سے سو نہیں سکا۔ اگلی صبح اٹھا، حمام میں پانی گرم ہو رہا تھا۔ نہایا دھویا، ناشتے کے بعد ہم نواب صاحب کی موٹر پر حبیب گنج کے لیے روانہ ہوئے۔ اگرچہ بارش ختم ہو چکی تھی، لیکن ہوا میں

خاصی نمی تھی۔ اور سردی بھی خوب چمک گئی تھی۔ ڈرائیور کے علاوہ ہم تین آدمی تھے نواب صاحب اور ان کے مصاحب ملا احمد اور میں۔ نواب صاحب اور میں پچھلی طرف بیٹھے اور ملا احمد صاحب ڈرائیور کے برابر میں آگے بیٹھ گئے۔ سڑک بہت خراب تھی۔ اس کا اکثر حصّہ پہلے ہی شکستہ سا تھا۔ رہی سہی کسر رات کی بارش نے پوری کر دی۔ گڑھوں میں پانی بھر گیا تھا اور جہاں پانی نہیں تھا وہاں کیچڑ ہو رہی تھی۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم افتاں خیزاں حبیب گنج پہنچے۔ علی گڑھ سے ناشتہ کر کے چلے تھے اور دوپہر کے کھانے میں ابھی بہت دیر تھی۔ اس لیے ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ پہنچتے ہی نواب صاحب نے کتابخانہ کھولنے کا حکم دیا۔ مہتمم صاحب آ گئے۔ ملازموں نے پہیوں کو جھاڑا پونچھا اور ہم داخل ہوئے۔

اللہ اللہ اب میں اپنے تاثرات کا حال کیا لکھوں۔ ہر طرف ہزاروں بیش قیمت کتابیں قرینے سے الماریوں میں چنی رکھی تھیں۔ غالب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر کسی پچھلے شاعر کے ہاں ایسا کوئی مضمون بندھ گیا ہے، جو میرے یہاں بھی پایا جاتا ہے، تو اس سے یہ خیال نہ کرو کہ مجھے اس سے توارد ہو گیا ہے، بلکہ یقین جانو کہ اس نے نہانخانۂ ازل سے میرا مضمون چوری کر لیا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال میرا اس وقت ہوتا ہے، جب میں کسی جگہ کوئی اچھی کتاب دیکھتا ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے، جیسے غلطی سے میرے حصّے کی چیز یہاں آ گئی ہے۔ اور یہاں تو ایک دو نہیں، ہزاروں کتابیں میرے اردگرد دھری تھیں:

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

نواب صاحب کا عجیب عالم تھا۔ وہ ایک کتاب منگواتے، مجھے دکھاتے اور پھر اس کی خصوصیات گنوانا شروع کرتے۔ یہ ملک الشعراء طالب آملی کا دیوان ہے۔ اس میں بہت سا کلام خود طالب کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ اس طرف میری توجہ

علامہ شبلی مرحوم نے دلائی تھی۔ میں نے جب یہ دیوان خریدا ہے، تو محض قدامت اور کتابت کی خوبی کے باعث۔ لیکن انھوں نے اسے دیکھ کر لکھا کہ اس میں بہت سی تحریریں خود طالب کے ہاتھ کی ہیں۔ دیکھیے یہ سرخ روشنائی کی تحریر طالب کی ہے۔

یہ مثنوی کا ایک قدیم نسخہ ہے۔ جہاں تک معلوم ہو سکا، اس سے قدیم تر نسخہ جرمنی کے شہر میونخ (صحیح تلفظ میونخ ہے) کے کتب خانے میں ہے، جو اس سے صرف چھ برس پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ یہ میرا نسخہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے کتب خانے میں رہا ہے، یہ رہیں ان کی مہریں۔ صاف پڑھا جاتا ہے: "محمد اورنگ زیب بادشاہ"

یہ شیخ سعدی کی بوستان ہے، اس پر اودھ کے تین تین بادشاہوں کی مہریں ہیں۔ نصیر الدین حیدر، اور امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ۔

چند دن پہلے ایک تازہ فتوح آئی تھی۔ ملا سعد الدین تفتازانی کی مطول۔ مہتمم سے کہہ کے اسے منگوایا۔ اس کے شروع میں پانچ چھ سطریں اس شان سے لکھی تھیں کہ آدھی عبارت بہت قدیم اور مغشوش تھی اور باقی آدھی تازہ۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ حصہ خود نواب صاحب نے پورا کیا تھا۔ پاس ہی میز پر مکبّر شیشہ پڑا تھا۔ اٹھایا اور اسے میرے ہاتھ میں دے کر فرمانے لگے۔ دیکھیے تو یہ عبارت پڑھ سکتے ہیں؟ میں رک رک کے پڑھنے لگا۔ آخر میں "نور الدین بن اکبر شاہ غازی" کے الفاظ تھے۔ گویا یہ خود جہانگیر کے ہاتھ کی تحریر تھی: اور اسی لیے انھوں نے مجھے اس کے پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ بابر بادشاہ کے بیٹے کامران کا دیوان اس سے تھوڑے دن پہلے شائع ہوا تھا۔ اس کے ساتھ چند ایسے صفحوں کے عکس دیے گئے ہیں، جن پر مغل بادشاہوں کی تحریریں یا دستخط ہیں۔ میں اسے دیکھ چکا تھا۔ مطول کی یہ عبارت پڑھنے کے بعد میں نے کہا کہ جہانگیر کا سوادِ خط بالکل وہی ہے، جو کامران کے دیوان میں ہے۔ یہ سن کر بہت مسرور ہوئے، اور کہا: تو

آپ نے کامران کا دیوان دیکھا ہے۔ پھر اسے بھی منگوایا اور ہم دونوں اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔

غرض ہم دیر تک اس جنتِ نگاہ کے نظارے میں مشغول رہے۔ وہ کتاب نکلواتے، اور اس کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے جاتے۔ اگر میں کوئی ایسی بات کہہ دیتا جس سے اس کی کسی طرح کی اہمیت واضح ہوتی تھی، تو خوشی کا اظہار فرماتے۔ وہ مجھے کتابیں اس طرح سے دکھا رہے تھے، جیسے میں کوئی بہت بڑا مبصر یا صاحب علم و فن ہوں۔ وہ ہر طرف سے بے پروا ہو کر یوں کتاب پر کتاب نکلوا رہے تھے، گویا آج پہلی مرتبہ انھیں کوئی کتابوں کا قدر دان ملا ہو، اور میں اپنی بیمایگی اور ان کی ذرہ نوازی پر عرق عرق ہوا جا رہا تھا۔ حضرت خواجہ میر دردؔ علیہ الرحمۃ کا شعر ہے:

یاراں ز مہربانی دانند، ہرچہ دانند
ما خوب می شناسیم اے دردؔ آنچہ مائیم

اصل بات یہ ہے کہ وہ بفضلہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی، اساسی اور بنیادی طور پر علمی آدمی تھے۔ ان کی روح اور ذوق کی تسکین اگر ہوتی تھی، تو کتابوں سے، یا صاحب علم اصحاب کی صحبت میں۔ جہاں کہیں انھیں یہ دونوں چیزیں میسر آجاتیں، ان کا بیرونی پردہ، جو بہرحال عارضی چیز تھی، اٹھ جاتا اور وہ اپنے اصلی روپ میں نمایاں ہو جاتے۔ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ جب میں ان سے ملا، تو وہ بیتاب ہو گئے، کیونکہ صحیح یا غلط، ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ میں بھی پڑھنے لکھنے کا شوق رکھتا ہوں، اور کتابوں کا قدر دان۔ اس صورت میں عمر، مرتبہ، علم کا تفاوت کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اہم چیز یہ تھی کہ میں بھی ان کے خیال میں علم کا شوقین اور کتابوں کا رسیا تھا۔ یہی چیز ہم دونوں میں قدرِ مشترک تھی۔ اس کے بعد بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ایک ہم مشرب و ہمخیال شخص کے سامنے اپنا اندوختہ نہ رکھ دیتے۔ اس میں کسی حد تک جذبۂ تفاخر بھی شامل تھا۔ آپ نے بارہا دیکھا ہوگا

کہ آپ کا بچہ، جب تک اپنا کھلونا اپنے ہمجولیوں کو نہ دکھا لے، اسے چین نہیں آتا۔ اس کی تہ میں بھی یہی بات ہے یعنی کسی ہمخیال کے ساتھ کھلونے سے لطف اندوز ہونا اور اپنی ملکیت کا غرور اور اس کی نمائش کی خواہش۔

نواب صدر یار جنگ نے عمر بھر کی محنت سے یہ کتابخانہ جمع کیا۔ بدقسمتی سے یہ ایسی جگہ تھا، کہ وہاں تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ اس لیے بسا اوقات واقعی صاحب ذوق حضرات بھی وہاں جانے سے ہچکچاتے تھے۔ لیکن اگر کسی طرح نواب صاحب کو معلوم ہو جاتا، تو وہ دعوتیں دے دے کر انھیں بلاتے، اپنا مہمان رکھتے، اور جب واقعی کوئی قدر دان مل جاتا، تو پھولے نہ سماتے۔

عربی کے مشہور شاعر متنبی نے ایک شعر میں اپنی دو دلپسند چیزوں کا یوں ذکر کیا ہے:

وخیرُ مکانٍ فی الدنی سرجُ سابحٍ

وخیرُ جلیسٍ فی الزمان کتاب

یعنی دنیا میں بہترین نشست برق رفتار گھوڑے کی زین ہے، اور زندگی میں بہترین ساتھی کتاب ہے۔ یہی دوسرا مصرع کتاب خانے کا طغرا ہے۔ ربڑ کی ایک تکونی مہر میں یہ مصرع کندہ ہے اور جو کتاب یہاں داخل ہوتی، اس پر یہ مہر لگا دی جاتی تھی۔

آخر ہم اندر سے نکل کر باہر کے برآمدے میں آکر بیٹھ گئے۔ یہاں دیوار پر مختلف تصویریں، نقشے، مرقعے وغیرہ لٹک رہے تھے۔ ہندستان کے نقشے کا ایک پرانا اور دلکش قلمی نسخہ تھا جس میں ساتھ ساتھ مختلف علاقوں کی زرعی پیداوار اور حیوانات بھی تصاویر میں دکھائے گئے ہیں۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد مرحوم کو آخری زمانے میں مصوری کا بھی شوق ہوا تھا۔ یہاں ان کی دستکاری کے بھی چند نمونے دیکھے۔ تصویریں فنی پہلو سے تو واجبی تھیں، البتہ تبرک ضرور تھیں۔ شروع میں غالب کے جس خط کا ذکر کر آیا ہوں، وہ بھی موجود تھا۔ اس خط کے آخر میں تاریخ تحریر ۱۸۰۴ء لکھی ہے۔ جو بداہۃً غلط ہے۔ دیر تک اس پر بحث

ہوئی کہ ٹھیک تاریخ کیا ہے؟ بہر حال کچھ فیصلہ نہ ہو سکا، اور ہو بھی کیسے سکتا تھا، محض قیاس آرائی ہی تو تھی۔ ثبوت کیسے مہیا کیا جا سکتا تھا۔ "ذکر غالب" کے ساتھ میں نے غالب کی جس تصویر کا عکس دیا ہے، وہ بھی میں نے یہیں سے لی تھی۔
اتنے میں ظہر کا وقت ہو چلا تھا۔ فرمایا، اگر کھانے کے بعد مطالعے کے لیے کوئی کتاب چاہیے، تو نکلوا لیجیے۔ میں نے گزارش کی کہ "سبد چین" کا مطبوعہ نسخہ دلوائیے، تاکہ جو نقل آپ نے بھجوائی ہے، اس سے مقابلہ کر سکوں؛ نیز مومن کا فارسی دیوان۔ کتابیں آئیں اور ہم باہر چلے آئے۔ میں اپنے کمرے کی طرف گیا اور وہ مسجد کی طرف۔

"سبد چین" کی پہلی ۱۸۶۷ء والی اشاعت میں کتابت کی بہت غلطیاں رہ گئی تھیں، اور اس کے آخر میں غلط نامہ لگوایا گیا تھا۔ سوء اتفاق سے حبیب گنج والے نسخے سے یہ غلط نامہ غائب تھا۔ اس لیے میں پوری تصحیح نہ کر سکا۔ آخر میں نے یہ کام ہارڈنگ لائبریری (دلّی) کے نسخے سے کیا۔ اس کے باوجود میرے شائع کردہ ایڈیشن میں بعض غلطیاں رہ گئیں، جن کا مجھے افسوس ہے۔

تھوڑی دیر بعد ملّا احمد مجھے کھانے کے لیے بلانے آئے۔ دستر خوان لکڑی کا ایک نیچا سا تخت تھا، اس پر سفید چادر بچھی تھی۔ تخت کے چاروں طرف گدّے تھے۔ ہم لوگ ان پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئے۔ نواب صاحب مغفور دستر خوان کے ایک سرے پر تھے۔ ان کے سیدھے ہاتھ پر ان کے خلف اکبر خان بہادر محمد عبید الرحمٰن خان شروانی تھے۔ اور ان کے بعد ملا احمد۔ میں نواب صاحب کے بائیں طرف تھا میرے برابر میں ایک اور صاحب بیٹھے تھے، جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ بس ہمیں پانچ کھانے پر تھے۔

کھانے میں قورمہ پلاؤ تھا، مرغ کا سالن تھا، شامی کباب تھے، ترکاری تھی۔ ملازم نے نواب صاحب کے سامنے ایک رکابی میں کوئی خاص چیز لا کے رکھی۔ یاد نہیں

رہا کہ کیا تھا۔ انھوں نے اس میں سے ایک اور رکابی میں تھوڑا سا نکال کے مجھے عنایت فرمایا۔ کھانے کے دوران میں بات چیت ہوتی رہی۔ اس کے بعد کچھ مٹھائی آئی۔ جناب خان بہادر نے یہ کہہ کر مجھے پیش کی کہ شوق فرمائیے؛ بازار سے نہیں آئی، بلکہ خانہ ساز ہے۔

کھانے کے بعد نواب صاحب آرام کے لیے اندر تشریف لے گئے۔ میں اپنے کمرے میں آیا اور مومن کا دیوان دیکھتا رہا۔

چار بجے کے لگ بھگ میں پھر بڑے کمرے کی طرف گیا۔ نواب صاحب تلاوت سے فارغ ہو کر عصر کی نماز کے لیے جا رہے تھے۔ مسجد بڑے پھاٹک کے باہر ہے، جہاں جماعت ہوتی تھی۔ ان کی واپسی پر ہم رات کے کھانے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ درمیان میں ایک مرتبہ وہ مغرب کی نماز کے لیے اٹھے، لیکن نماز کے بعد وہ سیدھے وہیں واپس آئے۔ حیدر آباد کے زمانۂ قیام اور انگریز ریذیڈنٹ سے اپنی چپقلش کے حالات سناتے رہے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد مرحوم کی وضعداری کا ایک قصہ قابل ذکر ہے۔ فرمایا: مجھے پان کھانے کی عادت ہے، لیکن تمباکو نہیں کھاتا۔ میں جب پہلی مرتبہ مہاراجہ بہادر کے ہاں گیا تو وہ خاصدان میں پان رکھ کے لائے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور پان لے لیا۔ واپس جا کے اب دوسری مرتبہ وہ زردہ لے کر آ گئے۔ میں نے پھر شکریہ ادا کیا اور عذر کیا کہ میں تمباکو نہیں کھاتا۔ میں حیدر آباد میں بارہ برس رہا اور مہاراجہ بہادر سے اکثر ملاقات بھی ہوتی تھی۔ جب بھی میں اُن کے ہاں جاتا، وہ پہلے پان کی گلوری لاتے؛ جو میں لے لیتا؛ پھر تمباکو لاتے؛ میں شکریے کے ساتھ عذر کر دیتا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ میں تمباکو نہیں کھاتا۔ لیکن کبھی ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے مجھے تمباکو پیش نہ کیا ہو۔

اس پہلی ملاقات کے موقعہ پر انھوں نے میری نوٹ بک میں مندرجۂ ذیل عبارت

رقم فرمائی:

براہِ دوستیہا ہر کہ بے منت قدم ساید
بہر گامیکہ بردارد، از و پائے، زمن چشمے

کتبہ حبیب الرحمٰن
بفرمایش مالک رام صاحب بوقتِ ورودِ ایشاں در حبیب گنج، ۷ شوال المکرم
۱۳۵۶ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۳۷ء

اگلے دن میں واپس دلّی چلا آیا۔ چلتے وقت آپ نے اپنی تصنیفات کا مجموعہ میرے ساتھ گاڑی میں رکھوا دیا۔ یہاں آنے کے تھوڑے دن بعد میں نے پہلے "سبد چین" اور پھر "ذکرِ غالب" شائع کیں۔ دونوں کے نسخے میں نے ان کی خدمت میں بھیجے۔ حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے بہت تعریف کی۔

۲

اتفاق سے میں ۱۹۳۹ء میں ملک سے باہر چلا گیا۔ جنگ کا سارا زمانہ باہر ہی رہا۔ اور ۱۹۴۶ء کے اواخر میں وطن واپس آیا۔ اس تمام دوران میں خط و کتابت کا سلسلہ ہمارے درمیان جاری رہا۔ میں جب لوٹ کے آنے والا تھا، تو انھوں نے لکھا کہ جب واپس آؤ تو حبیب گنج ضرور آنا۔ چنانچہ میں تعمیلِ حکم میں فروری ۱۹۴۷ء میں علی گڈھ گیا۔ میں نے جانے سے ایک دن پہلے تار سے انھیں اپنے آنے کی اطلاع دی۔ میں صبح گاڑی سے گیا تھا۔ کوٹھی پر پہنچا، تو اب کے پھر جناب عبدالوحید خان صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مجھے پہچانا نہیں، جو اتنے دن کے وقفے کے بعد کچھ ایسا غیر متوقع بھی نہیں تھا۔ بہرحال ان سے معلوم ہوا کہ نواب صاحب قبلہ حبیب گنج میں ہیں۔ میں فوراً دادوں جانے والی بسوں کے اڈّے پر پہنچا۔ اب رستے کا حال کیا بیان کروں! یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے پچھلے دس برس میں سڑک کی مرمّت تک نہیں ہوئی۔ بلکہ اب اسے سڑک کہنا ہی غلط

تھا۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ دونوں طرف کھیت تھے، اور ان کے بیچ میں خاصی چوڑی روش تھی، جس پر بہت باریک مٹی کی چھ انچ موٹی تہ جما دی گئی تھی۔ موٹر کے پیچھے پیچھے گرد وغبار کا ایک طوفان چھایا ہوا تھا، اور اگر بدقسمتی سے کہیں سامنے سے بھی کوئی لاری یا موٹر آ نکلتی، تو پھر خود ہی تصور کر لیجیے کہ مسافروں پر کیا گزر جاتی ہوگی۔ سفر کا آخری ڈیڑھ دو میل کا ٹکڑا اکّے یا تانگے پر طے کرنا تھا۔ یہاں میں اڈّے پر اترا اور ایک تانگے پر بستر رکھ کر آگے روانہ ہوا۔ لیکن یہ راستہ بھی اتنا خراب تھا کہ ہچکولوں کے مارے میری طبیعت خراب ہونے لگی۔ ناچار دو تین فرلانگ کے بعد میں اتر کھڑا ہوا۔ باقی مسافت میں نے پیدل پوری کی اور سامان تانگے پر آیا۔

میں ڈھائی تین بجے کے قریب حبیب گنج پہنچا۔ نواب صاحب مرحوم باہر کے مغربی برآمدے میں فرش پر بیٹھے حسب معمول تلاوت قرآن میں مشغول تھے۔ میں ملا احمد صاحب کو آداب عرض کر کے خاموش بیٹھ گیا جب تلاوت سے فارغ ہوئے، تو میں نے جھک کے سلام عرض کیا۔ چونکہ اب اونچا سننے لگے تھے، اس لیے سنا نہیں۔ ملا احمد صاحب نے کہا کہ ذرا اونچا کہیے۔ چنانچہ منہ کان کے قریب لے جا کر خاصی اونچی آواز سے دوبارہ کہا آداب عرض کرتا ہوں۔ چند لمحے تک غور سے دیکھا، میں نے بھی نام نہیں بتایا اور چپ چاپ ان کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ یک لخت پہچان کے سروقد کھڑے ہوگئے اور لپٹا لیا۔ اللہ اکبر، اس معانقے کی گرمجوشی سے اب تک لذت اندوز ہو رہا ہوں۔ معلوم ہوا کہ میرا تار انھیں موصول نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ چونکہ تار میں نے علی گڑھ کے پتے سے بھیجا تھا، وہاں سے جناب عبدالوحید خان نے اُسے دستی روانہ کر دیا۔ چنانچہ میرے پہنچنے کے آدھ پون گھنٹے بعد ایک شخص ڈاک لے کر آیا، اسی میں تار بھی تھا۔

نواب صاحب نے ملازم کو حکم دیا، وہ پانی کا لوٹا، صابون، تولیا وغیرہ لے آیا۔

میں نے ہاتھ منہ دھویا۔ اتنی دیر وہ میرے پاس کھڑے رہے۔ پھر چائے آئی۔ سب نے پی۔ چند منٹ بیٹھنے کے بعد، عصر کی نماز کے لیے مسجد میں چلے گئے۔ جاتے ہوئے فرمایا، مغرب کے بعد آپ کی پچھلے سات برس کی رام کہانی سنوں گا کہ کہاں کہاں رہے اور کیا کیا دیکھا! میں نے عرض کیا بسر و چشم۔ شام کے کھانے کے بعد ہم لوگ بڑے کمرے میں آ گئے، نواب صاحب اور ملا احمد اور میں۔ اگرچہ میں نے اس چھ سات برس میں شرقِ اوسط و ادنیٰ کے تمام اسلامی ممالک کی سیر کی تھی، لیکن زیادہ قیام مصر میں رہا تھا۔ کہنے لگے: دیکھیے صاحب، اردو میں گفتگو نہیں ہوگی۔ آپ اتنے دن مصر میں رہے، یقیناً عربی اچھی بولتے ہوں گے!

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک بات کی وضاحت کردوں۔

یوں کہنے کو تمام عربی ممالک کی زبان عربی ہے۔ لیکن جب باہر سے کوئی ایسا شخص یہاں آئے، جس نے ساری عمر عربی پڑھی ہو اور اپنے آپ کو عربی کا عالم سمجھتا ہو، اور وہ یہاں کے عام لوگوں سے بات چیت کرے تو بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ وہ ان کی سمجھنے اور انھیں اپنی سمجھانے میں بہت دقت محسوس کرے گا۔ بات یہ ہے کہ عام بول چال کی بولی، کتابی زبان سے بالکل مختلف ہے۔ اس عوامی زبان (دارجہ) کے اپنے اصول ہیں۔ اس کی گرامر الگ ہے۔ اس کا لغات الگ ہے۔ اس کا لب و لہجہ الگ ہے۔ غیر ملکی عالموں کو تو چھوڑیے کہ ان غریبوں نے سوائے کتابیں پڑھنے کے کسی کو بولتے کب سنا ہوگا، خود عربی ممالک کا یہ حال ہے کہ ایک مصری ایک عراقی کی بات سمجھنے میں دقت محسوس کرتا ہے، حالانکہ دونوں عربی بولتے ہیں۔ ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ میرے ایک مصری دوست کسی زمانے میں مارسیلز (فرانس) میں مصری قنصل تھے۔ مراکش کا علاقہ، فرانسیسی سلطنت کا حصہ تھا۔ ایک دن کچھ مراکشی کسی کام سے ان کے دفتر میں آئے۔ اب خیال رہے کہ مصر اور مراکش دونوں ملکوں کی زبان عربی ہے۔ فرمانے لگے، قسم لے لو، جو میں ان کی

گفتگو کا ایک لفظ سمجھا ہو تو بالآخر ایک ترجمان بلانا پڑا، جو طرفین کی باتوں کا ترجمہ کرتا رہا، اور اس طرح معاملہ طے ہوا۔ پھر ہر ایک جگہ کی بولی میں دخیل الفاظ ہیں، یعنی دوسری زبانوں کے لفظ، عربی میں ایسے رس بس گئے ہیں کہ لوگ انھیں بے تکلف بولتے ہیں، اور قطعاً کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ نہ انھیں یہ معلوم ہی ہے کہ یہ عربی کا نہیں، کسی غیر زبان کا لفظ ہے۔ مراکش اور تونس میں فرانسیسی اور ہسپانوی کے لفظ راہ پا گئے ہیں، مصر میں فرانسیسی اور اطالوی۔ اسی طرح عراق میں ترکی اور فارسی۔ اور یہی حال دوسری جگہوں کا ہے۔ اگر اس بیرونی آلایش سے کچھ محفوظ رہی ہے، تو حجاز کی زبان، اگرچہ یہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ پھر یہ خرابی عوام ہی تک محدود نہیں، بلکہ تعلیم یافتہ اور عام لوگ بھی جب آپس میں بات چیت کرینگے، تو اسی دارجہ زبان میں۔ یوں لکھنے کو ٹھیک لکھینگے۔ کتابی زبان نہیں بدلی، لیکن بدل گئے ہیں عام بولی۔

اسی صورتِ حال کو مدِ نظر رکھ کے میں نے عرض کیا کہ مجھے عربی میں بات چیت کرنے میں کوئی عذر نہیں، لیکن بے اختیارانہ میری زبان پر دارجہ کلمات آجائینگے، جو اوّل تو آپ سمجھینگے نہیں، اور اگر سمجھ بھی گئے، تو عربی کا ہے کو، یہ اچھا خاصا مذاق بن جائیگا۔ فرمانے لگے۔ پروا نہ کیجیے۔ چنانچہ ہم پہلے پندرہ بیس منٹ تک عربی میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے کوشش کی کہ حتی الوسع میری زبان نحوی اور صحیح ہو۔ لیکن پھر بھی مشق نہ ہونے کے سبب کہیں کہیں دارجہ لفظ آ گئے۔ موضوعِ سخن اسلامی ممالک کے حالات تھا۔ وہاں کے لوگوں کے دینی اور معاشرتی مسائل سے متعلق پوچھتے رہے۔ جب میں نے بتایا کہ عوام بہت غریب ہیں اور دولت کی تقسیم بہت غلط طریقے پر ہوئی ہے، ملک کا تمام سرمایہ چند خاندانوں میں جمع ہو کے رہ گیا ہے۔ زکوٰۃ کی جمع و تقسیم کا حکومت کی طرف سے کوئی انتظام نہیں، مغربی سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ غیر اسلامی بلکہ خلافِ اسلام تمدن و معاشرت

ہر جگہ عام ہے، تو بہت افسوس کرتے رہے۔

اس کے بعد اردو زبان و ادب کا سلسلہ چلا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جو خطوط قید خانے سے ان کے نام لکھے تھے، ان کا مجموعہ "غبارِ خاطر" کے نام سے چند ماہ پیشتر شائع ہوا تھا۔ میرے پہنچنے سے تھوڑے دن پہلے ایک اور مختصر کتاب ان کے ایک عزیز نے مرتب کرکے "کاروانِ خیال" کے عنوان سے چھاپی تھی۔ اس میں مولانا آزاد کے علاوہ ان کے اپنے خطوط بھی ہیں "غبارِ خاطر" کا ایک بہت خوبصورت ایڈیشن لاہور سے نکلا تھا۔ اس کے آخر میں ایک خط بھی زیادہ ہے، جس میں اسلامی موسیقی سے متعلق بحث ہے۔ "کاروانِ خیال" کے ساتھ اس خاص ایڈیشن کا ایک نسخہ میز پر پڑا تھا۔ دونوں کتابوں کو اٹھایا اور ان پر دستخط کرکے مجھے عنایت فرمائیں۔ پھر مولانا آزاد کی تحریر و تقریر اور حافظے اور ہمہ گیر شخصیت کی تعریف کرتے رہے۔ مجھے خیال ہوا کہ ان کی زندگی کے کچھ حالات پوچھوں۔ چنانچہ میں نے ان کے خاندان، تعلیم اور حیدرآباد کی ملازمت سے متعلق کئی سوال کیے۔ جواب دیتے رہے۔ پھر فرمایا، میرے ایک عزیز نے پچھلے دنوں علی گڑھ کے رسالے مصنف میں میرے متعلق ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں کچھ غلطیاں در آئی ہیں۔ بہرحال اس پر ایک نظر ڈال کے آپ کو بھیج دوں گا۔ چنانچہ حسبِ وعدہ یہ پرچہ انھوں نے مجھے بھیجا تھا۔ اس میں بعض اصلاحیں خود اُن کے اپنے قلم سے ہیں، بعض کسی اور کے۔

اگلی صبح ہم ناشتے کے بعد کتب خانے میں پہنچے۔ میرے پاس دیوانِ غالب کا ایک نسخہ ہے، جس کا پہلا اور آخری ورق غائب ہیں۔ اس لیے مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ کہاں سے اور کب شائع ہوا۔ قرائن سے البتہ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ یہ میرزا کی زندگی میں چھپا ہے۔ اس کے آخر میں نیّر رخشاں کی لکھی ہوئی تقریظ سے میں نے یہ غلط نتیجہ نکالا کہ یہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں شائع ہوا تھا۔

چنانچہ میں نے اسی طرح "ذکر غالب" کے پہلے ایڈیشن میں لکھ دیا۔ بعد کو اپنی غلطی پر متنبہ ہوا۔ اب یہ بات تو صاف ہو گئی کہ ۱۸۵۵ء میں اردو دیوان کا کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا تھا، لیکن ایک نئی الجھن پیدا ہوئی کہ آخر میرے پاس جو نسخہ ہے، یہ کہاں اور کس سال چھپا۔ میں احتیاطاً اسے اپنے ساتھ لیتا گیا تھا کہ اگر کتابخانۂ حبیب گنج میں بھی اسی ایڈیشن کا کوئی اور نسخہ ہو تو مقابلے سے یہ معمہ حل ہو جائے۔ خوش قسمتی سے یہاں ایک مکمل نسخہ موجود تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ مطبع احمدی شاہدرہ، دلی ۱۸۶۱ء کا نسخہ ہے۔ اس میں بہت غلطیاں رہ گیئں تھیں۔ بعض شعر چھپنے سے رہ گئے، بعض دوبارہ چھپ گئے۔ کتابت کی غلطیوں کا تو شمار ہی کیا! اسی لیے میرزا نے فوراً مطبع نظامی، کانپور میں نیا ایڈیشن چھاپنے کی اجازت دے دی تھی۔

ہمیں کتابخانے میں آکے بیٹھے ابھی چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ فرمایا: لیجیے آپ سے متعلق ایک شعر ہو گیا ہے:

اے مالک صد ملک وفائے یاراں
دل رام تو شد، فدائیت صد جاں

میں اٹھ کے آداب بجا لایا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔

میں نے عرض کیا کہ اپنی کوئی تصویر ہو تو مرحمت فرمایئے۔ ہم دیر تک تصویروں کے ذخیرے میں تلاش کرتے رہے۔ سب پرانی چیزیں تھیں۔ اور ان میں سے بھی کوئی اکیلی تصویر نہ نکلی۔ چونکہ میرا شام کو واپسی کا ارادہ تھا، فرمانے لگے: چلیئے، میں آپ کے ساتھ علی گڑھ تک چلتا ہوں، وہیں اکٹھے تصویر اتروائینگے۔ میں نے کہا کہ نہیں اتنی زحمت کی کیا ضرورت ہے۔ کہنے لگے، زحمت کچھ بھی نہیں۔ میں کل تو جانے ہی والا تھا، آج چلا جاؤنگا اور یوں علی گڑھ تک اور ساتھ بھی رہیگا۔ غالباً یہ بھی فرمایا تھا کہ مجھے کل کسی کام سے الہ آباد جانا ہے۔ لیکن ہمیں حبیب گنج سے روانہ ہوتے ہوتے دیر ہو گئی۔ جاڑوں کے دن، پانچ بجے ہی خاصا اندھیرا ہو جاتا ہے۔

چنانچہ جب تک ہم علی گڑھ پہنچیں، روشنی اتنی کم ہو چکی تھی کہ تصویر اتروانے کا وقت نکل گیا تھا۔ کہنے لگے کوئی بات نہیں، پھر کسی وقت اتروا کر بھیج دونگا۔ اگرچہ یہ افسوس ضرور رہیگا کہ آپ اس میں نہیں ہونگے۔

راستے میں گرد و غبار کا طوفان دیکھ کر میں نے عرض کیا کہ اس دل بادل کے دیکھنے کے بعد فردوسی کے شعر کی حقیقت واضح ہو گئی،

زبس گرد میداں کہ بر شد بدشت
زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

بہت مسرور ہوئے۔ پھر حافظہ پر زور دے کر شاہنامے کے اسی مقام کے آٹھ دس شعر سنائے۔ میں ان کی یادداشت پر دنگ رہ گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ کے پیٹے میں تھی۔ اور ظاہر ہے کہ شاہنامہ انھوں نے ایک زمانے سے نہیں دیکھا ہوگا۔ کوئی ایک آدھ شعر کسی جگہ سے حسب موقع پڑھ دینا کوئی کمال نہیں؛ یہ بات ہر کوئی کر سکتا ہے۔ لیکن یوں اچانک ایک شعر سن کر آگے پیچھے کے شعر سنا دینا معمولی بات نہیں۔

مرحوم کی ایک عادت تھی کہ اگر وہ کسی بات کا جواب نہیں دینا چاہتے تھے تو عموماً خاموش رہتے یا کوئی اور ذکر چھیڑ دیتے۔ اس سفر میں بھی ایک اسی طرح کا تجربہ ہوا۔

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے مولانا شبلی کی سوانح عمری "حیاتِ شبلی" کے عنوان سے لکھی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی تھی، اس کا پورا مسودہ نواب صاحب مرحوم نے دیکھا تھا، اور انھوں نے اس پر جا بجا اضافے کیے، جو کتاب کے ساتھ چھپ گئے ہیں۔ اسی زمانے میں یاروں کو مشغلہ ہاتھ آیا، انھوں نے مختلف رسالوں میں شبلی اور عطیہ بیگم کے موضوع پر مضمونوں کا ایک تار باندھ دیا، بلکہ یاد پڑتا ہے کہ غالباً حیدرآباد ریڈیو سے ایک تقریر بھی اس موضوع پر نشر ہوئی تھی۔ جس وقت وہ شاہنامے کے شعر مجھے سنا رہے تھے، میرا ذہن شعر العجم کی طرف منتقل ہو گیا،

جس کے پہلے حصے میں مولانا شبلی نے کوئی سو صفحے میں شاہنامے پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ شعر العجم اور شبلی کا سے مجھے شبلی اور عطیہ بیگم کا قصہ یاد آگیا۔ اب مجھے شرارت اور تحقیق کی سوجھی۔ جن اصحاب نے "حیات شبلی" پڑھی ہے، انھیں معلوم ہے کہ مولانا سید سلیمان نے اس سے متعلق ایک لفظ نہیں لکھا، حالانکہ یہ ایسی بات نہیں، جسے یوں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس میں کچھ اصلیت ہے، تو اس کا برملا اعتراف کر لینا چاہیے تھا کیونکہ اس سے مولانا شبلی کی عظمت اور وقار میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوتی؛ اور اگر یہ غلط ہے تو پھر اس کی مدلل تردید کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اگر آج یہ مسئلہ صاف نہ ہوا، تو پھر قیامت تک نہیں ہونے کا۔ اس وقت مولانا شبلی کے تلامذہ اور احباب اور تربیت یافتہ اصحاب ہمارے درمیان موجود ہیں، جو اس موضوع پر ذمہ دارانہ اور واقف کارانہ انداز میں لکھ سکتے ہیں۔ بعد کے آنے والے تو بہر حال انھیں کے خوشہ چین ہونگے۔

ان ہی رعایتوں کے خیال سے میں نے ان سے سوال کیا کہ کیا آپ نے حیات شبلی میں کوئی فرو گذاشت محسوس نہیں کی۔ پوچھا، کیوں، آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟ میں نے کہا یہی عطیہ بیگم والے قصے پر بھی کچھ لکھنے کی ضرورت تھی۔ ہاں، ہوں، کرکے رہ گئے، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سے متعلق گفتگو کرنے پر تیار نہیں۔ ادھر میں محض "خطا بر بزرگاں گرفتن خطا ست" پر عمل کرنے کو تیار نہیں تھا جرأت رندانہ سے کام لیتے ہوئے، میں نے پھر کہا: مکاتیب شبلی میں آپ نے مولانا کے خط مہدی افادی کے نام تو ضرور پڑھے ہونگے؟ جواب اثبات میں دیا۔ پھر پوچھا کہ کیا آپ نے مہدی افادی کے خطوط کا مجموعہ بھی دیکھا ہے؟ فرمایا: ہاں، ایک زمانہ ہوا دیکھا تھا۔ میں نے کہا آپ نے کتاب خطوطِ شبلی ضرور دیکھی ہوگی۔ (جس میں شبلی کے وہ خطوط ہیں، جو انھوں نے عطیہ بیگم اور ان کی بہن کے نام لکھے تھے، فرمایا، ہاں یہ بھی بہت مدت ہوئی دیکھی تھی۔ اب میں نے اتنی تمہید دل

کے بعد سوال کیا کہ مہدی نے مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں صاف لکھا ہے کہ مولانا شبلیؔ کا مجھ سے پردہ نہیں تھا۔ آخر یہ کس بات کی پردہ داری تھی؟ کہنے لگے: مجھے یہ کتاب دیکھے اتنا زمانہ ہو گیا ہے کہ اب ٹھیک طور پر کچھ یاد نہیں۔ میں نے کہا، اچھا یہی سہی۔ لیکن آپ اصحاب کی یہ کامل خموشی بھی تو شک پیدا کرنے والی ہے۔ آخر آپ لوگ کھل کے کیوں کوئی بات نہیں کرتے۔ کہنے لگے: فائدہ؟ "فائدہ یہ کہ اس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائیگا۔ کل کے مؤرخ کے لیے روشنی مہیا ہو جائیگی، اور اس کے لیے فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گی۔" انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب میں نے گستاخانہ جسارت سے کام لیتے ہوئے ایک اور حربہ استعمال کیا۔ میں نے کہا قرآن کہتا ہے: لا تکتموا الشھادۃ اگر کسی سلسلے میں تمھیں کچھ بات معلوم ہو تو اس کے اظہار سے دریغ نہ کرو اور اُسے مت چھپاؤ اور آپ حضرات ہیں کہ سب کچھ جانتے ہوئے خاموش ہیں۔ اور پوچھنے پر بھی نہیں بتاتے۔ لیکن صاحب یہ وار بھی خالی گیا۔ وہ ہنس کے ٹال گئے۔ اتنے میں ہم علی گڑھ پہنچ گئے۔

میں شام کی گاڑی سے واپس دلی چلا آیا۔ اس موقع پر آپ نے میری نوٹ بک میں تحریر فرمایا تھا۔

اے آمدنت باعثِ آبادیِ ما
ذکرِ تو بود زمزمۂ شادیِ ما

بفرمائشِ مالک رام صاحب بوقتِ ورودِ مکرّر مقام حبیب گنج
فی البداہہ

اے مالک صد ملک وفائے یاراں
دل رامِ تو شد فدائے صد جاں

حبیب الرحمٰن صدر یار جنگ حبیب گنج ۲۷ فروری ۱۹۴۷ء

یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد جلد ہی میں دوبارہ ملک سے باہر چلا گیا۔ پہلے خط وکتابت برابر جاری رہی۔ لیکن پھر بہت بیقاعدگی پیدا ہوگئی۔ بلکہ آخری سال میں تو بالکل بند ہوگئی تھی۔ لکھا کہ اب کچھ لکھتا ہوں، تو انگلیاں درد کرنے لگتی ہیں۔ میں نے بھی بارِ خاطر ہونا پسند نہ کیا۔ جناب عبدالوحید خان صاحب سے ان کی خبر برابر ملتی رہتی تھی۔ آخر ایک دن ان کا خط ملا کہ وہ ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء کو جمعہ کے دن صبح سات بجے اپنے خالقِ حقیقی سے جاملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۳

موت بنی آدم کی میراث ہے، اس سے مفر نہیں۔ وہ طبعی عمر گزار کر وہاں گئے، جہاں ہم سب کو جانا ہے۔ وفات کے وقت عمر ۸۴ برس کی تھی یعنی کتابِ مقدس کی مقرر کردہ حد سے بھی ۱۴ برس زیادہ۔ تو اس پہلو سے کوئی افسوس نہیں۔ یہ مرحلہ ٹالے ٹل نہیں سکتا۔ ایک نہ ایک دن ضرور پیش آتا۔ وہ رئیس بن رئیس تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی عمر رئیسوں کی لغویات میں ضائع نہیں کی۔ علم کو اس طرح حاصل کیا جو اس کا حق ہے۔ پھر ملک کے علم وعمل کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہوگا، جو ان کی مادی یا معنوی اعانت سے شاد کام اور فیضیاب نہ ہوا ہو۔ یہ بھی قابلِ فخر بات ہے۔ لیکن افسوس ہے تو اس بات کا کہ اب ان سا انسان نہیں ملنے کا۔ جس دور کی وہ پیداوار تھے، وہ دور ہی ختم ہوگیا۔ اب ان کے سے انسان پیدا ہی نہیں ہوتے۔ ایک آدھ اور صورت جو اس دور کی یادگار باقی ہے، وہ بھی جھلملاتی شمع ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور گل؛ اس کے بعد گھپ اندھیرا ہے۔

زمانے نے اپنا ورق الٹ دیا ہے۔ آج محبت اور خلوص، دوستی اور وفا، اخلاق اور قدردانی، علم اور فن، دین اور دنیا، غرض ہر چیز کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ مرحوم اس زمانے میں پیدا ہوئے، پھلے پھولے اور پروان چڑھے، جسے ہم ایک

لفظ میں بیان کرنا چاہیں تو وضعداری سے بہتر علم نہ ملے۔ وضعداری ایک قانون، ایک ضابطے کا نام تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ جس طرح کسی شخص سے آج ملے ہیں، اسی طرح آج سے پچاس برس بعد بھی ملینگے۔ زندگی کا جو اصول آپ نے بنا لیا ہے، اب کوئی طاقت آپ کو اِدھر سے اُدھر نہیں کر سکتی۔ آپ کی دوستی بھی کسی اصول پر مبنی ہوگی، اور مخالفت بھی۔ یہ نہیں کہ جدھر کی ہوا ہوئی، اسی طرف پھر گئے۔ اسے ہم "وفاداری بشرط استواری" سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ مرحوم اسی اصول کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ اب یہ تصویر پھر نظر نہیں آئیگی۔ میرؔ کا ایک شعر یاد آگیا، اسی پر ختم کرتا ہوں:

باتیں ہماری یاد رہیں، پھر باتیں نہ ایسی سنیے گا
جب کہتے کسی کو سنیے گا، تو دیر تلک سر دھنیے گا

علّامہ سیّد سلیمان ندوی

کم و بیش ۱۹۲۷ء کی بات ہے۔ یادش بخیر، یہ میرے تعلیمی سفر کی آخری منزل کے قریب کا زمانہ تھا۔ میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے کے درجے میں تاریخ کا طالبعلم تھا، جب مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" وہاں پہنچی۔ چونکہ مضمون میرے مذاق اور موضوع کے مطابق تھا، میں نے کتاب کا ایک نسخہ بازار سے منگایا۔ قدرتاً اسے شوق کے ہاتھوں سے لیا، اور عقیدت کی نظر سے پڑھا، اور جب پڑھ چکنے کے بعد اسے ہاتھ سے رکھا، تو اس حسرت کے ساتھ کہ کاشکے یہ ابھی کچھ اور لمبی ہوتی۔ کتاب کی خوبی اور مصنف کی کاوش اور دیدہ ریزی کا اندازہ کسی حد تک اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ آج تک اردو ہی میں نہیں، بلکہ دوسری زبانوں میں بھی اس موضوع پر اکیلی کتاب ہے۔ چونکہ اس سے متعلق مواد کسی جگہ مرتب اور مسلسل شکل میں موجود نہیں تھا، اس کی تالیف میں مصنف کو عربی کا جاہلی اور اسلامی دور کا پورا ادب دیکھنا پڑا تھا کہ نہ معلوم کہاں سے کوئی مفید مطلب چیز مہیا ہو جائے اور اس جستجو میں واقعی ایسی ایسی جگہ سے انھوں نے معتد بہ معلومات حاصل کر لیں، جہاں ان کی موجودگی کا ساں گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن مجھے یہاں اس کتاب پر تبصرہ لکھنا منظور نہیں۔

اس کتاب میں مصنفِ علّام نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہندستان کی تاریخ لکھنے والوں

نے جتنی توجہ فارسی ماخذوں پر کی ہے، اتنی ہی عربی سفرناموں اور تاریخ و جغرافیہ کی کتابوں سے بے اعتنائی برتی ہے، حال آں کہ یہ قیمتی معلومات کا مخزن ہیں، اور ان سے کما حقہٗ استفادہ کیے بغیر ملک کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔

خدا انھیں خوش رکھے، میرے ایک ہم سبق اور عزیز دوست فیروزدین بھٹی تھے۔ میری عربی سے واقفیت شُد بُد سے زیادہ نہیں تھی، لیکن وہ کم از کم مجھ سے زیادہ جانتے تھے؛ بی اے میں ان کا اختیاری مضمون عربی رہا تھا۔ ہم دونوں نے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ اگر ممکن ہو، تو یہ کام ضرور کرنا چاہیے۔ ارادہ یہ تھا کہ جس طرح ایلیٹ نے مختلف فارسی تاریخوں کے متعلقہ حصّوں کا انگریزی ترجمہ کر دیا ہے، اسی طرح عربی ماخذوں کو اردو میں منتقل کر دیا جائے۔ چنانچہ میں نے سیّد صاحب مرحوم کی خدمت میں لکھا کہ میں نے آپ کی کتاب پڑھی ہے، اور یہ ہمارا منصوبہ ہے؛ مہربانی ہو اگر اس بارے میں ہمیں اپنی رہنمائی سے مستفید کریں؛ اور سب سے پہلی یہ بات کہ ان کتابوں کی فہرست لکھیں، جو آپ کے خیال میں ترجمہ کرنے کے لائق ہیں۔ جواب فوراً آیا۔ اس میں کوئی بیس کتابوں کی فہرست تھی۔ اس پر میں بلاذری کی فتوح البلدان کا ایک نسخہ خرید لایا، اور ہم نے اس کے ہندستان سے متعلقہ حصے کا ترجمہ شروع کر دیا۔ اسی دوران میں سلیمان تاجر کا سفرنامہ، جو نسبتاً مختصر چیز ہے، میرے ہاتھ لگ گیا۔ میں نے چند دن میں اس کا ترجمہ کر ڈالا۔ لیکن افسوس، یہ مفید کام ہماری خواہش کے مطابق جاری نہ رہ سکا۔ پہلے تو ہماری تعلیمی مشغولیات کے باعث یہ بہت آہستہ آہستہ ہوتا رہا۔ پھر جب تعلیم سے فارغ ہوئے، تو غمِ روزگار نے وہ رہی سہی عافیت بھی نہ چھوڑی۔ وہ جگ ٹوٹ گیا؛ بھٹی صاحب کہیں، میں کہیں۔ غرض ترجمے کا کام بالکل بند ہو گیا۔ اس کے بعد آج تک اس موضوع کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے ‏ بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

لیکن حسرتوں کے گنوانے سے فائدہ! ان کی فہرست خاصی طویل ہے۔ اس حکایت کے بیان کرنے سے مقصود یہ بتانا تھا کہ سید سلیمان ندوی مرحوم سے میری واقفیت کی تقریب کیسے پیدا ہوئی۔ بہرحال اس سے یہ فائدہ ہوا کہ اس کے بعد ہمارے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہو گیا۔

۱۹۳۶ء میں جناب امداد صابری دہلوی نے ایک رسالہ "علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں" چھاپا۔ میں ان دنوں دلّی میں تھا۔ ایک دن حسبِ معمول نواب سراج الدین احمد خاں سائل مرحوم کے مکان پر گیا، تو یہ رسالہ وہاں بیٹھنے کے کمرے میں پڑا مل گیا۔ میں اسے اٹھا لایا۔ اب یہ اتنے دن کی پرانی بات ہے کہ یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تاہم اتنا یاد پڑتا ہے کہ صابری صاحب نے اس میں اپنے نزدیک سیرۃ النبی میں نقل کردہ آیاتِ قرآنی کے ترجمے کی بعض غلطیاں دکھائی تھیں۔ سید صاحب نے غالباً دسمبر ۱۹۳۶ء کے معارف کے شذرات میں اس رسالے کا جس طرح جائزہ لیا، اس سے مترشح ہوتا تھا کہ ان کے خیال میں یہ رسالہ جناب امداد صابری نے کسی اور صاحب کے کہنے پر لکھا ہے، بلکہ یہ غالباً ان کا لکھا ہوا ہی نہیں ہے اور انھوں نے اسے کسی اور سے لکھوا کر اپنے نام سے شائع کر دیا ہے۔ اس پر امداد صابری نے دلّی کی عدالت میں ازالۂ حیثیتِ عرفی اور ہرجانے کا دعویٰ دائر کر دیا۔

مرحوم سے میری پہلی ملاقات اسی سلسلے میں ہوئی۔ وہ اس مقدمے میں پیشی کے لیے دلی آئے، تو حسبِ معمول جامعۂ ملیہ اسلامیہ (قرول باغ) میں بھی تشریف لائے۔ ان دنوں میرا بھی اسی قرب و جوار میں قیام تھا۔ مجھے ایک شام میں حامد علی خاں (جنرل منیجر مکتبۂ جامعہ) کے مکان پر ان سے ملا۔ نسبتاً چھوٹا قد، آفتابی چہرہ، بڑی بڑی روشن آنکھیں، کشادہ اونچی پیشانی، کسی قدر لمبی ناک جو پھننگ کے قریب قدرے موٹی ہو گئی تھی، قصّ الشوارب واعفاء اللحی کا مصداق چھوٹی

چھوٹی بتیں اور گھنی کھچڑی ڈاڑھی، جو بہت لمبی نہیں تھی، اور جس میں سفید بال زیادہ تھے اور سیاہ کم؛ صاف ستھرا کھلتا رنگ، گلے میں شیروانی نما بند گلے کا کوٹ جس کی دائیں طرف کی جیب سے گھڑی کی زنجیر لٹک رہی تھی، اور دوسری طرف لکھنے کا قلم نظر آرہا تھا۔ نیچے سفید پاجامہ اور سر پر عمامہ، جس کا شملہ پیچھے سے اٹھا کر خاص طریقے سے اُڑس رکھا تھا۔ یہ تھا ان کا حلیہ۔ میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں اور ان کی صورت میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔

جب مجھے اس مقدمے کی رُوداد معلوم ہوئی، تو میں نے پیشکش کی کہ اگر اجازت ہو، تو میں نواب سائل کے ذریعے سے صلح صفائی کی کوشش کروں۔ اس پر دوستوں نے اصرار کیا کہ یہ ثواب کا کام ہوگا۔ خود انھوں نے بھی رضامندی کا اظہار کیا۔ میں نے اسی شام نواب صاحب سے مل کر طے کیا کہ صابری صاحب سے ملنا چاہیے۔ لیکن اگلی صبح میں نواب صاحب کے ہاں جانے سے پہلے سید صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے دریافت کیا کہ آپ کن شرائط پر صلح کرنے کو تیار ہوں گے کیونکہ میں نے خیال کیا کہ فریقِ ثانی سے بات چیت کرنے سے پہلے مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں ان کی طرف سے کس حد تک جانے کا مجاز ہوں۔

جاڑوں کے دن تھے۔ میں یہی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے صبح کے وقت ان کے پاس پہنچا۔ وہ چھتہ منگلو میں جناب سید مرتضیٰ علی صاحب کے مکان پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے جب اطلاع کرائی ہے، تو وہ ناشتہ کر کے باہر برآمدے میں تشریف لا چکے تھے۔ بہت لطف اور مہربانی سے پیش آئے۔ علیک سلیک کے بعد پہلے میرے متعلق دو چار باتیں ہوئیں۔ لیکن چونکہ وقت تنگ تھا؛ مجھے نواب سائل کو ساتھ لے کر صابری صاحب کے ہاں پہنچنا تھا، جو اندیشہ تھا کہ گھر سے نکل جائیں گے، اور مقدمے کی اسی دن پیشی تھی، اس لیے میں زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ میرے پوچھنے پر کہا کہ یہ مقدمہ غلط فہمی کی بنا پر دائر کیا گیا ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا تھا،

اس سے ہرگز میرا یہ منشا نہیں تھا کہ کسی طرح جناب امداد صابری صاحب کی ہتک یا دل آزاری ہو۔ وہ اگر مقدمہ واپس لے لیں، تو میں مناسب الفاظ میں معارف میں معذرت شائع کر دونگا، تاکہ ان کا ملال دور ہو جائے۔ خود مجھے بھی یقین تھا کہ معارف کے بنائے دعویٰ شذرات سے صابری صاحب کی مخالفت مقصود نہیں تھی، بلکہ مرحوم اس سے صرف یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

بہر حال اس وقت انھوں نے جو کچھ مجھ سے کہا، اس سے میرا اطمینان ہو گیا۔ میں یہاں سے نکل کر لال کنوئیں میں سائل صاحب کے مکان پر پہنچا اور ہم دونوں تم ععی جناب صابری صاحب کے ہاں گئے۔

بقیہ حالات سب کو معلوم ہی ہیں۔ فریقین نے راضی نامہ داخل کر دیا اور مقدمہ واپس لے لیا گیا۔ رسیدہ بود بلائے، ولے بخیر گذشت۔ اب مجھے یاد نہیں کہ سید صاحب مرحوم نے معارف میں معذرت کی تھی۔ بہر حال مجھے اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اس بہانے میرا گذشتہ چھ سات برس کا غائبانہ تعلق ذاتی واقفیت میں تبدیل ہو گیا، اور اب ہماری خط و کتابت میں بھی باقاعدگی پیدا ہو گئی۔

اس کے کچھ دن بعد میں نے "عورت اور اسلامی تعلیم" لکھی۔ میں نے شاید کہیں پہلے بھی لکھا ہے کہ میری ابتدائی تعلیم سراسر اردو اور فارسی پر مشتمل تھی۔ ہائی اسکول کے بعد مجھے نگار کے مطالعے سے قرآن اور اسلام سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس پر میں نے ایک مولوی صاحب سے قرآن پڑھنا شروع کیا۔ افسوس کہ اسے میں ان کے ساتھ مکمل نہ کر سکا۔ نصف سے زیادہ پڑھ چکا تھا کہ یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ لیکن میری طبیعت نے کام کو ادھورا چھوڑ دینا گوارا نہ کیا۔ اس کے بعد ذاتی محنت سے میں نے اسے مکمل کر لیا۔ اب میدان وسیع ہو گیا اور عربی کی شد بد ہو جانے سے قرآن کی تفسیر دیکھنے کا موقع ملا۔ پھر اس سے گذر کر حدیث کے مطالعے کا شوق

پیدا ہوا اور حتی الوسع میں نے حدیث کی بیشتر کتابیں بھی دیکھ ڈالیں۔ ان میں زیادہ توجہ صحاحِ ستّہ پر رہی کہ یہی چھ مجموعے زیادہ معتبر خیال کیے جاتے ہیں۔

تو خیر، میں کم و بیش روزانہ قرآن کا کچھ حصّہ ترجمے اور تفسیر کے ساتھ تلاوت کیا کرتا تھا۔ میں نے دَورانِ مطالعہ میں دیکھا کہ عورتوں سے متعلق احکام منتشر حالت میں پڑے ہیں۔ خیال آیا کہ اگر انھیں یکجا کر دیا جائے، تو ان پر ایک اچھا خاصا مضمون قلمبند ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہو کہ شروع میں میرا ۲۰۔۲۵ صفحے سے زیادہ کے مضمون کا خیال نہیں تھا۔ لیکن لکھنے بیٹھا، تو اتنا مواد جمع ہو گیا اور ایسے ایسے گوشے سامنے آئے کہ اسے ایک مضمون میں محدود کر لینا ممکن نہ رہا۔ اس پر میں نے پانچ ابواب میں یہ کتاب لکھ ڈالی۔

یہ اتنی بڑی جسارت تھی کہ میں آج بھی بعض اوقات اپنے اوپر تعجب کرتا ہوں۔ موضوع نہ صرف علمی، بلکہ خالص اسلامی اور فقہی۔ مجھے بجا طور پر اندیشہ تھا کہ عامۃ المسلمین اسے دخل در معقولات سے زیادہ وقعت نہیں دیں گے۔ لیکن اب لکھ لینے کے بعد اسے ضائع کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ اس خسارے کے سودے میں نفع حاصل کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اسے چھپوا کر بیچا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے نیاز فتحپوری کو زحمت دی کہ وہ اسے ایک نظر دیکھ لیں اور ان کے طلب کرنے پر مسودہ ان کے پاس بھیج دیا۔ انھوں نے لکھا کہ اگرچہ مجھے آپ کے بعض نتائج سے اتفاق نہیں ہے، لیکن چونکہ آپ نے کہیں عربی لغات اور زبان کے اصولوں سے انحراف نہیں کیا، اس لیے تعبیر و تفسیر میں یہ نقطۂ نظر آپ کا حق ہے؛ بہرحال آپ اسے ضرور شائع کر دیں۔

نیاز اپنی آزاد خیالی کے لیے مطعون تھے؛ بلکہ بعض حلقوں میں تو ان کا اسلام ہی محلِ نظر تھا۔ پس اگرچہ ان کی رائے سے میری ہمت بڑھی، لیکن میں نے طے

کیا کہ مسودہ کسی قدیم خیال کے عالم کو بھی دکھا لینا چاہیے۔ اب میں نے سید سلیمان ندوی مرحوم سے اس پر ایک نظر ڈالنے اور مقدمہ لکھنے کی درخواست کی۔ انھوں نے لکھا، میں وعدہ نہیں کرتا، مضمون بھیج دیں، تو دیکھ کر بتاؤں۔ جب مسودہ ان کے پاس پہنچا، تو انھوں نے میری توقع سے بہت زیادہ اس کی تعریف کی۔ لکھا کہ اگر مضمون کے باہر "مالک رام" نام نہیں لکھا ہوتا، تو میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ کسی مسلمان عالم کی تصنیف نہیں ہے۔ انھوں نے یہ بھی اضافہ کیا کہ مجھے تمھاری بعض آرا سے اختلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں مقدمہ لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ انھوں نے یہ نہیں لکھا تھا کہ انھیں کون کون سے مقامات پر مجھ سے اتفاق نہیں ہے۔ میں نے پوچھا، تو فرمایا کہ لکھنے میں خواہ مخواہ طوالت ہو جائیگی۔ کبھی موقع ملا، تو ذاتی ملاقات اور گفتگو سے انھیں دور کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی ہو گیا:

نیاز صاحب نے مسودے کے حاشیے میں کہیں کہیں کچھ اشارے لکھے تھے۔ اسی طرح کا ایک اشارہ مسئلہ متعہ سے متعلق تھا۔ میں نے قاضی یحییٰ بن اکثم کے اتباع میں سورۃ المومنون (۲۳: ۵-۶) کی تشریح میں لکھا تھا کہ ممتوعہ عورت نہ بیوی ہے، نہ ملک یمین؛ اس کی حالت یہ ہے کہ مرد کی زندگی میں اس پر طلاق اور خلع کے قانون کا اطلاق نہیں ہوتا اور وہ مر جائے، تو اس پر عدّتِ وفات واجب نہیں، نہ وہ اس کی وارث ہے وغیرہ۔ اس جگہ حاشیے میں نیاز نے لکھا کہ یہ رائے غالباً صحیح نہیں ہے، اس باب میں شیعہ کتابوں کا مطالعہ کر لیجیے۔ مولانا سید سلیمان مرحوم نے یہ عبارت دیکھی، تو اس پر مزید حاشیہ لکھا:

> شیعیوں کی مستند کتاب منہاج النہایہ وغیرہ میں بتصریح مذکور ہے کہ ممتوعہ کے حق میں نہ طلاق ہے، نہ ایلاء، نہ ظہار، نہ وہ مستحق ارث

> ہے، نہ تمتع کرنے والے کی وفات کے بعد اس پر عدت وفات واجب ہے۔ اس لیے آپ کی رائے صحیح ہے اور اسلم صاحب کا تعاقب ناواقفیت پر مبنی ہے۔

اس سے قطع نظر کہ انھوں نے میری رائے کی تصدیق کی، نہ جانے کیسے، انھیں یہ خیال گزرا کہ پہلا حاشیہ مولانا اسلم جیراجپوری کا لکھا ہوا ہے۔ شاید یہ وجہ ہو کہ میں نے تمام احکام قرآن سے اخذ کیے تھے، حدیث صرف تائید و تشریح کے لیے استعمال کی تھی۔ مولانا اسلم غالی اہل قرآن تھے اور دین میں حدیث کی حجیت کے قائل نہیں تھے۔ اسی اختلاف رائے کے باعث مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا اسلم جیراجپوری میں کچھ معاصرانہ چشمک بھی تھی۔ لیکن اس پر رائے زنی کرنے کا میرا کوئی حق نہیں، نہ میں اس کا اہل ہی ہوں۔

بہر حال جیسا کہ لکھ چکا ہوں، مسودہ نیاز کے سوا اور کسی نے نہیں دیکھا تھا اور سید صاحب کا اسلم جیراجپوری کی طرف اشارہ کسی غلط فہمی پر مبنی تھا۔

چونکہ اس کے تھوڑے دن بعد میں ہندستان سے باہر چلا گیا۔ اس لیے یہ معاملہ اسی پر ختم ہو گیا۔ نہ میں ان سے مل سکا، نہ گفتگو کی نوبت آئی۔ یہ مسودہ بھی بہت دن تک ان کے پاس پڑا رہا۔ آخر کار انھوں نے ۱۹۴۶ء میں اسے میری درخواست پر میرے ایک دوست (ملک احمد حسن) کے پاس لاہور بھیج دیا۔

میں یہاں سے مصر گیا تھا۔ وہاں عربی کا مطالعہ اور علم کچھ اور بڑھا اور مجھے اپنے مضمون پر مزید غور و فکر کرنے کا موقع ملا۔ پہلے میں نے "پردہ" کی بحث میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ منہ کا چھپانا "اسلامی پردہ" میں شامل نہیں ہے۔ لیکن بعد کو مطالعے اور قرآن و حدیث پر زیادہ دقت نظر سے غور کرنے پر میں نے اپنی رائے بدل لی۔ اب میں اس نتیجے پر پہنچا کہ منہ بھی اس حکم میں شامل ہے۔ اور بھی دو ایک جگہ خفیف سی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ میں نے نہ صرف

یہ مقام بدل ڈالے، بلکہ پورا مضمون نئے سرے سے دوبارہ لکھ کر اسے شائع کر دیا۔ جب مطبوعہ نسخہ ان کی خدمت میں پہنچا، تو انھوں نے اس کی بھی تعریف کی۔

اس تمام زمانے میں میری ان سے خط و کتابت رہی۔ وہ خط لکھنے میں بڑے سست تھے؛ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دیر سویر انھوں نے خط کا جواب نہ دیا ہو۔ مجھے اپنی ہیچ میرزی اور ہیچ مدانی کا پورا احساس ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں، اس کے باوجود میں بزرگوں کی خدمت میں ہمیشہ سے بیباک رہا ہوں اور الٹی سیدھی بات کہنے میں کبھی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ پھر اس پر بھی خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ وہ اس پر طرح دیتے ہیں اور چشم نمائی کی جگہ چشم پوشی فرماتے ہیں۔ مرحوم سے بھی میرا رویہ اس سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ میں ان کی خدمت میں بھی گستاخ تھا۔ جو جی میں آتی، بلا تامل لکھ دیتا۔ لیکن یہ ان کی ذرہ نوازی تھی کہ وہ کبھی پیشانی پر بل نہیں لائے بلطف فرماتے، میرے کہے سے درگزر کرتے اور جواب دیتے۔

افسوس کہ ان کے تمام خطوط محفوظ نہیں رہے۔ تقسیمِ ملک سے پہلے کے بیشتر خط لاہور میں رہ گئے۔ کچھ میرے مسلسل مختلف ممالک کے سفروں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے وقت کھو گئے۔ بہر حال اب بھی کوئی نصف درجن خطوط میرے پاس محفوظ ہونگے۔

اردو میں مذہبی موضوعات پر لکھنے والوں کی کمی نہیں رہی۔ ان میں سے بعض حضرات کی تصنیفات کی تعداد تو سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اردو زبان کی تاریخ میں کہیں ان کا نام نہیں ملتا۔ اس کے دو سبب ہیں: اول، نفسِ موضوع اور دوم، اسے پیش کرنے کا طریقہ۔ موضوع بالعموم عام لوگوں کی دلچسپی کا نہیں ہوتا۔ بنیادی مذہبی عقائد کو تو رہنے دیجیے کہ ان میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں۔ لیکن جہاں موضوع میں وسعت پیدا ہو سکتی ہے اور یہ اپنوں کے علاوہ بیگانوں کے لیے بھی قابلِ مطالعہ اور کشش کا باعث ہو سکتا ہے، وہاں بھی بہت کم ایسا

اتفاق ہوا ہے کہ ان میں سے کوئی کتاب زبان وبیان کے پہلو سے بھی معیاری ہو۔ یہ اللہ والے لوگ اس بارے میں الّا ماشاء اللہ عموماً بے نیاز واقع ہوئے ہیں، مشکل اور نامانوس الفاظ اور ترکیبوں کی بھرمار سے پڑھنے والے کا سر چکرانے لگتا ہے۔ غیر ضروری تکرار، اور طول نویسی اس پر مستزاد۔ اور ان سب سے بڑھ کر بسا اوقات اپنے طرزِ استدلال اور متقدمین کی ہر رطب و یابس کی صحت پر اصرار۔ غرض کہ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتابیں ایک خاص حلقے میں محدود ہو کر رہ گئیں اور عام پڑھے لکھے ان سے استفادہ کرنے سے محروم رہ گئے۔ ظاہر ہو کہ ایسی صورت میں علم و ادب کی تاریخ لکھنے والے ان کا ذکر کیوں کرنے لگے تھے!

خدا مغفرت کرے مولانا شبلی نعمانی کی، سب سے پہلے انھوں نے اس بھول بھلیاں سے نکلنے کی راہ دکھائی۔ انھوں نے خالص علمی اور مذہبی موضوعات پر مقالے اور کتابیں لکھیں اور ایسی دلکش اور شستہ و رفتہ زبان میں کہ اس میں شیر و شکر کی حلاوت محسوس ہونے لگی۔ نہ صرف یہی، بلکہ یہ واقع ہے کہ ان سے پہلے اردو میں صحیح علمی تحقیق النادر کالمعدوم کا حکم رکھتی تھی۔ اس میدان میں بہت حد تک اولیت کا سہرا انھی کے سر ہے۔ انھوں نے اسلامی اور تاریخی اہمیت کے کئی زندۂ جاوید مقالے لکھے۔ ہر طرف سے اس بدعت حسنہ پر آفرین اور ہل من مزید کا نعرہ بلند ہوا۔ اس سے دوسرے اہلِ قلم کو بھی توجہ اور جرأت ہوئی۔ چنانچہ ان کے زمانے میں بعض اصحاب نے ان کے تتبع میں کتابیں لکھیں۔ عبدالرزاق کانپوری کا سلسلۂ وزرائے اسلام اس کی روشن مثال ہو، جس میں البرامکہ اور نظام الملک طوسی کی سی قابلِ داد کتابیں شائع ہوئیں۔ دوسروں کے علاوہ خود شبلی کے تربیت یافتہ تلامذہ نے استاد کے ترکے پر جو اضافہ کیا ہے، وہ اردو کا مایۂ ناز سرمایہ ہے۔ اس گروہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کی ذات رئیس الطائفہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اگر انھوں نے اپنی عمر بھر میں صرف سیرۃ النبی ہی کی تکمیل کی ہوتی، تو یہ بھی اتنا بڑا

کارنامہ ہے کہ تاریخ علم و ادب میں ان کا نام زندہ رکھنے کو کافی تھا۔ لیکن انھوں نے اس کے علاوہ ہمیں "خطباتِ مدراس" دیے، جو رسول کریم صلعم کی سیرت پر بالکل اچھوتے انداز میں روشنی ڈالتے ہیں۔ انھوں نے جو تحقیقی کتابیں ـــــ ارض القرآن، عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہازرانی ـ لکھی ہیں، وہ ہماری زبان کی بہترین کتابوں میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ اسی طرح سوانح عمریوں میں حیاتِ امام مالک، سیرت عائشہ، خیام، حیاتِ شبلی ـ اپنے اپنے موضوع پر حرفِ آخر کا حکم رکھتی ہیں۔ سچ یہ کہ اگرچہ بنیادی طور پر ان کی تعلیم بھی سرا سر مذہبی تھی، لیکن انھوں نے اپنے مطالعے کو مذہب تک محدود نہیں رکھا، جس سے ان کے اسلوبِ فکر میں تنوع پیدا ہو گیا؛ اور انھوں نے اپنے گرامی قدر استاد کی پیروی میں ہماری زبان کو گوناگوں تصنیفات سے مالامال کر دیا۔ ان کی ہمہ گیری اور جامعیت کا کچھ اندازہ اس سے لگایئے کہ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، جغرافیہ، سیرت، ادب، تنقید، شعر، سفرنامہ ــ کوئی موضوع ان کے افادات سے محروم نہیں رہا۔ ان میں سے ہر ایک پر انھوں نے معیاری کتابیں لکھی ہیں، جو نہ صرف معلومات کا خزانہ ہیں بلکہ خیال انگیز بھی، اور ان موضوعات پر بھی مزید کام کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے سکتی ہیں۔

جو جگہ خالی ہوئی ہے، وہ تو اب خالی ہی رہے گی۔ اس سے پہلے کسی کی پر ہوئی ہے، جو ان کی ہو گی! لیکن ان کے اخلاف اتنا تو کر سکتے ہیں کہ جو شمع انھوں نے جلائی تھی، اس کی روشنی میں اضافہ نہیں کر سکتے، تو کم از کم اس میں اپنی جانیں لڑا دیں کہ اس کی تابناکی میں کمی نہ آنے پائے۔ اور سچ تو یہ ہو کہ یہ ان کا اپنے آپ پر احسان ہوگا کہ اس بہانے ان کا نام زندۂ جاوید ہو جائیگا، ورنہ مرنے والے کے کارنامے تو ایسے ہیں کہ اگر انھیں کوئی بھلانا چاہے بھی، تو وہ بھلائے نہیں جا سکتے:

بارے، دنیا میں رہو، غمزدہ یا شاد رہو ۔۔۔ ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

برج موہن دتاتریہ کیفی

خاندانِ تیموریہ میں حصولِ تخت کے لیے ورثا میں خانہ جنگی کی رسم پرانی تھی۔ بابر، اکبر، جہانگیر، شاہجہان۔ وسط ایشیا سے قطع نظر، وہ بادشاہ جن کا تاریخ ہند سے تعلّق ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی وفات پر یہی ہوا۔ اورنگ زیب کی وفات پر بھی اُس کی وصیت کے باوجود اُس کے تین بیٹوں نے فیصلہ تلوار کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور میدان سب سے بڑے بھائی محمد معظم بہادر شاہ کے ہاتھ رہا۔ خود بہادر شاہ کی موت (۱۷۱۲ء) کے وقت اس کے چار بیٹوں میں سے اس کے پاس ایک بھی موجود نہیں تھا۔ وہ تخت کے لیے ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے۔ جہاندار شاہ اور اس کے بعد فرخ سیر کے عہد میں حالات اور بھی خراب ہو گئے۔ ملک میں بد نظمی کا دور دورہ تھا۔ نہ کسی کا جان و مال محفوظ تھا، نہ ناموس و وقار۔ لیکن اس کے باوجود ملک کے دُور دست علاقوں میں مرکزی حکومت کی ساکھ بہت کچھ قائم تھی۔ لوگ اب بھی بادشاہ کو جہاں پناہ اور ظل اللہ ہی سمجھتے تھے۔ وہ حصولِ ملازمت کی خاطر دلّی آتے اور اپنے آپ کو کسی نہ کسی صاحبِ اقتدار امیر کے دامن سے وابستہ کر کے دربار میں جگہ اور رسوخ حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔

فرخ سیر کے عہد میں ایک کشمیری برہمن خاندان قسمت آزمائی کے لیے دلّی پہنچا۔ اس کے

برج موہن دتاتریہ کیفی

ایک فرد نے جو فارسی میں طاق اور علم حساب و ریاضی میں مشاق تھے، بہت جلد اپنی لیاقت اور معاملہ فہمی کی بدولت دربار میں رسائی حاصل کر لی۔ پھر جب انیسویں صدی کے شروع میں سلطنت سمٹ سمٹا کر "از دلّی تا پالم" رہ گئی، تو اس خاندان کے کئی افراد نے کمپنی بہادر کی ملازمت اختیار کر لی؛ اور یہاں بھی اپنے حسن کارکردگی سے ہمچشموں میں ابھر دیا ئی۔

اسی خاندان میں ۱۳ دسمبر ۱۸۶۶ء کو بازار سیتارام میں پنڈت کنہیالال کے گھر میں ایک بچّہ پیدا ہوا؛ اس کا نام برج موہن رکھا گیا۔ یہی بچہ آگے چل کر اردو علم و ادب کے آسمان پر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کے نام نامی سے مہر درخشاں کی طرح چمکا۔

پنڈت کنہیالال، مہاراجہ بھرپور سنگھ کے عہد میں ریاست نابھہ میں کوتوال تھے۔ کیفی ابھی ایک سال کے بھی نہیں تھے کہ ان کے والد نے عین عالم شباب میں سل کے مرض سے انتقال کیا۔ اس کے بعد ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا بار ان کی والدہ اور دادا (پنڈت رادھا کشن) کے چھوٹے بھائی پنڈت جیون داس کے کندھوں پر آپڑا، جو انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے برداشت کیا۔ لیکن قدرت کو یہ تھوڑا سا آسرا بھی منظور نہ ہوا۔ یہ ابھی صغر سِن ہی تھے کہ والدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ کیفی کی ایک پھوپھی تھیں، جن کے کوئی اولاد نہیں تھی؛ ان کے شوہر پٹیالے میں ملازم تھے۔ برج موہن کی والدہ کی وفات کے بعد ان کی پھوپھی نے انھیں گود لے لیا۔

کیفی کی تعلیم اپنے محلّے ہی کے ایک مکتب میں شروع ہوئی۔ یہاں حکیم لوریے والے نامی طبیب کا مطب تھا۔ اسی مطب کے ساتھ ایک مختصر سا مکتب بھی تھا۔ جب یہ پانچ برس کے ہوئے، تو یہاں بھیج دیے گئے۔ اس زمانے میں مکتب کی تعلیم شیخ سعدی کی گلستان، بوستاں اور کریما اور ما مقیماں اور دستور الصّبیان سے شروع ہوتی تھی؛ جس سے طالب علم فارسی میں بہت جلد اچھی استعداد حاصل کر لیتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ گھر پر بھی اپنے چھوٹے دادا اور نانا سے فارسی کی مختلف کتابیں پڑھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ رسمی نصاب سے گزر کر اچھی اونچے درجے کی کتابیں انوارِ سہیلی

اور یوسف زلیخا وغیرہ پڑھنے لگے۔

مکتب کی تعلیم ختم ہوئی، تو اب انھیں شاہ جی کے چھتّے کے سرکاری اسکول بھیج دیا گیا۔ مولوی رحیم بخش جو بعد کو سر رحیم بخش ہوئے اور جنھیں پنجاب کی سیاسیات میں بڑا مقام حاصل ہوا، اس زمانے میں اس اسکول میں فارسی کے مدرس تھے۔ انھوں نے کیفی صاحب کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

اب ذکر آگیا ہے تو مولوی رحیم بخش کا بھی کچھ حال سن لیجیے:

ضلع کرنال میں ایک مختصر سا قصبہ ٹھسکہ میرانجی ہے۔ یہ وہیں کے رہنے والے تھے۔ زندگی عربی اور فارسی کے مدرس کی حیثیت سے شروع کی اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے چیفس کالج، لاہور کے بورڈنگ کے مہتمم (سپرنٹنڈنٹ) مقرر ہو گئے۔ اس کالج میں مختلف ریاستوں کے ولی عہد اور دوسرے رؤسا کے چشم و چراغ تعلیم پایا کرتے تھے۔ مولوی رحیم بخش کے زمانے میں یہاں ریاست بہاولپور کے ولی عہد زیر تعلیم تھے اور انھیں کی نگرانی میں رہتے تھے۔ جب بعد کو وہ اپنی ریاست کے حکمران ہوئے، تو انھوں نے اپنے پرانے اتالیق کو بہاولپور بلا کر ایک اعلیٰ عہدے پر مقرر کر دیا۔ اُن کی وفات کے وقت اُن کے جانشین نواب نابالغ تھے۔ انگریزوں نے مولوی رحیم بخش کی دیرینہ خدمات اور قابلیت کے پیش نظر انھیں مجلس نیابت کا صدر مقرر کر دیا۔ اس عہدے پر بھی انھوں نے نہایت وفاداری محنت اور انتظامی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا۔ اسی زمانے میں انھیں سر کا خطاب ملا۔ جب ریاست بہاولپور کی ملازمت سے پنشن پائی، تو اس کے بعد ملک کے مختلف تعلیمی اداروں کی ترقی میں دلچسپی لیتے رہے۔ چنانچہ انھوں نے ندوۃ العلماء لکھنؤ اور علی گڑھ یونیورسٹی کی بہت خدمت کی تھی۔ ۱۹ مئی ۱۹۳۵ء کو تقریباً اسّی برس کی عمر میں اپنے وطن میں انتقال کیا۔

کیفی صاحب اسکول کے زمانے ہی میں شعر کہنے لگے تھے۔ مولوی رحیم بخش کو اس کا علم ہوا، تو انھوں نے یہ نہایت صائب مشورہ دیا کہ تعلیم کی تکمیل کے بعد اس جھمیلے میں پڑنا۔ لیکن شاعری کا جن ایسا نہیں کہ ایک مرتبہ کسی کے سر پر چڑھ کر آسانی سے

اتر جائے۔ کیفی صاحب نے بھی یہ مشورہ قبول نہ کیا۔ اس زمانے میں حالی یہیں دلّی (لال کنواں) میں رہتے اور پرانے اینگلو عربک کالج میں پڑھاتے تھے۔ کیفی صاحب ان کے وہاں پہنچے اور اپنی غزل اصلاح کے لیے ان کی خدمت میں پیش کی۔ لیکن یہ اصلاح بھی دو تین غزلوں سے آگے نہیں بڑھی، اور جلد ہی یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس کے بعد عمر بھر کسی سے اصلاح نہیں لی۔

مولانا حالی سے اپنے تعلقات کے بارے میں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے، وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ لکھتے ہیں:

> خواجہ حالی سے میرے تعلقات عجیب نوعیت کے تھے۔ اگرچہ میری فارسی کی تعلیم گھر پر ختم ہو چکی تھی، لیکن میں ہائی اسکول میں پڑھتا تھا، مشاعروں میں شریک ہوتا تھا۔ لیکن مولانا کا علم و فضل اور شہرت، سب کے علاوہ عمر کا تفاوت دوستانہ تعلقات کے دعوے کی نفی کرتا ہے۔ میں نے ان کو کل ۳۰ - ۴۰ شعر دکھائے تھے، پھر اصلاح کا لفظ درمیان میں نہ آیا۔ اس کا سبب بتانا مشکل ہے کہ اصلاح اور مشورۂ سخن آگے کیوں نہ چلا۔ لیکن بایں ہمہ ادبی گفتگو اور زبان کی مشکلات سے متعلق گفتگو برابر جاری رہتی۔ سیف الحق ادیب، مرزا ارشد اور زکی باہر چلے گئے تھے، جن سے میرے دوستانہ تعلقات تھے۔ اب حالی کے در کے سوا کوئی جگہ میری ادبی پیاس کے لیے نہیں رہی تھی۔ کوئی دو برس تک یہ معمول رہا کہ روز شام میں اپنے مکان (واقع بازار سیتا رام) سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ وہ اس وقت یا غسل کو جاتے ہوتے (شام کو ہی ہر موسم میں بتیر گرم پانی سے نہایا کرتے تھے) یا کھانا کھاتے ہوتے، جب میں پہنچتا۔ کھانے کے بعد وہ اور میں اکرام اللہ خاں صاحب شیدا عرف ننھے خاں کے مکان پر جاتے، جو ٹیامحل میں رہتے تھے۔ وہاں کوئی گھنٹہ بھر بیٹھتے۔ واپسی پر قاضی حوض سے وہ اپنے گھر لال کنوئیں کو چلے جاتے،

اور میں اپنے گھر۔ جب ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی آئی، تو خواجہ نے مجھ سے فرمایا کہ اس موقع پر بلینک ورس میں نظم کہو۔ میں نے جواب دیا کہ قافیہ اور ردیف کی بدولت بہت سی خوبیاں شعر میں پیدا ہوجاتی ہیں، میں لکھونگا، تو نظم بے نمک ہوگی؛ آپ بلینک ورس لکھیے لیکن انھوں نے اس موقع پر صرف ایک مختصر سی مثنوی کہی۔ میری نظم بلینک ورس تو نہ تھی، لیکن چار مصرع کے بندوں میں یہ التزام تھا کہ پہلا اور تیسرا، اور دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ تھے۔ شاید یہ انگریزی طرز کے بند اردو میں اوّلیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھیں دنوں میں خواجہ تصدق حسین اور غلام الثقلین اور دوسرے اعزّہ تکمیلِ تعلیم کے لیے انھیں کے پاس یا پاس کے مکان میں مہینوں آ کر رہے۔ حکیم اجمل خان مرحوم بھی کبھی کبھی آیا کرتے تھے۔

ایک دن کیا ہوا کہ ننھے خان صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور ہم دونوں کمپنی باغ میں ٹہل رہے تھے۔ میں اس زمانے میں ٹھیٹھ دہلی کی وضع کے کپڑے پہنا کرتا تھا۔ برابر سے ایک جگنو اڑتا ہوا گزرا۔ میں نے اسے اپنی دوپلّی ٹوپی میں رکھ لیا۔ خواجہ کی نظر اس پر پڑی، تو چیں بجبیں ہوکر فرمایا کہ ہیں، پنڈت جی ہوکر اتنے بیرحم! میرے دریافت کرنے پر فرمایا کہ ٹوپی کے اندر کیسے قید کر رکھا ہے؟ میں نے جگنو اڑا دیا اور معافی مانگی۔ ایک دن وہ گھر سے نکلتے ہی، قاسم جان کی گلی کی طرف ہوتے ہوئے، وہاں سے بلّی ماروں میں حکیم محمود خان کے مکان میں داخل ہوئے۔ میں کہہ رہا تھا کہ محمود خاں تو اس وقت گھوڑے پر سوار ہوکر باہر جایا کرتے ہیں کہ وہ حکیم عبد المجید خان کے مطب کی طرف بڑھے۔ مزاج میں خشکی کی شکایت ہمیشہ رہتی، اور قبض اور خفیف دردِ سر کا دائمی عارضہ تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ حکیم صاحب چھت پر بیٹھے تھے۔ مولانا کی تکلیفوں کی کہانی سن کر انھوں نے کچھ دوا

اپنے بکس میں سے دی اور ایک نسخہ لکھوا دیا۔ میرا مزاج کچھ عمر کے تقاضے اور کچھ ان کی عنایت کی وجہ سے چنچل بہت تھا۔ چنانچہ پھاٹک سے باہر نکلتے ہی میں نے کہا: مولوی صاحب! آپ تو اس طب کو مسدس میں یونانیوں کا فضلہ کہہ چکے ہیں؛ پھر یہ کیا؟ انھوں نے صرف میری طرف دیکھا اور چُپ رہے۔ میں سخت نادم ہوا۔ اس روز مٹیا محل تک سارا راستہ چپ چاپ کٹا۔ ایک دن فرمایا۔ کسی ایسے شخص کا انتظام کرا دو، جو ہندی کا پورا ماہر ہو۔ ان کا ارادہ باضابطہ ہندی کی تحصیل کا تھا۔ لیکن یہ کام چلنے نہ پایا کیونکہ پھر وہ جلد ہی عربی اسکول سے گریجوئٹی (GRATUITY) لے کر پانی پت چلے گئے۔

جب اسکول کی تعلیم ختم کر لی، تو انگریزی کی اعلی تعلیم حاصل کرنے کو سان اسٹیفنس کالج میں داخلہ لے لیا اور وہیں سے ۱۸۸۶ء میں بی اے کی سند پائی۔

تعلیم کے اختتام پر روزگار کی تلاش میں نکلے۔ پہلے پٹیالے گئے۔ لیکن وہاں دل نہ لگا، تو بعض دوسری ریاستوں میں چکر کاٹتے رہے۔ اسی زمانے میں لاہور بھی جانا ہوا اور یہاں مولانا محمد حسین آزاد سے صحبتیں رہیں۔ آخر کار ۱۸۹۶ء کے لگ بھگ کپور تھلہ پہنچے اور والی ریاست مہاراجا جگت جیت سنگھ کے چچا کنور سچیت سنگھ کے سکرٹری مقرر ہو گئے۔ تین برس تک ان کے ساتھ رہے۔ ان کے انتقال (۱۸۹۹ء) پر انھیں کے بھتیجے اور مہاراجا کے چچیرے بھائی کنور دلجیت سنگھ (خلف کنور بکرم سنگھ) کے نجی سکرٹری مقرر ہوئے۔ اس تعلق سے مدتوں جالندھر میں قیام رہا، جہاں کنور صاحب کی مستقل سکونت تھی۔ جب پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ - ۱۹۱۸ء) کے زمانے میں کنور صاحب موصوف انگلستان گئے، تو یہ بھی ہمرکاب تھے۔ ولایت کے قیام کے دوران میں بعض انگریز مشاہیر سے ملاقاتیں رہیں، جن میں ماہر ہندیات ٹامس اور گراہم بیلی اور جارج برنارڈ شا کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مسٹر ٹامس بعد کو کئی برس تک برٹش میوزیم کے کتابخانے کے مہتمم رہے تھے۔ کیفی صاحب کو قدیم ہندو ڈراما سے بہت

دلچسپی تھی اور انھوں نے اس موضوع پر خاصی تحقیق کی تھی۔ اس سلسلے میں بہت دن تک ان کی مسٹر ٹامس سے خط و کتابت رہی۔

ولایت سے واپسی کے بعد ۱۹۱۶ء میں نواب کنجپورہ نے انھیں اپنا دیوان مقرر کیا۔ دو سال بعد ۱۹۱۸ء میں انھوں نے ریاست کشمیر میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں آٹھ برس تک وہ ریاست کے اسسٹنٹ فارن سیکرٹری رہے اور اس عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد ۱۹۲۶ء میں وہیں ایک پہاڑی ریاست چینینی میں پہلے مجسٹریٹ اور کلکٹر اور پھر وزیر مقرر ہوئے۔

کشمیر کی ملازمت کے زمانے کا ایک دلچسپ واقعہ سنیے:

یہ مہاراجا پرتاپ سنگھ کا زمانہ تھا۔ اپنے عہدے کے باعث انھیں بھی باقاعدہ دربار میں حاضری دینا پڑتی تھی۔ مہاراجا کو معلوم ہوا کہ یہ شاعر ہیں، لیکن اسی حد تک کہ "شعر" کہہ لیتے ہیں اور بس۔ نہ کبھی انھوں نے فرمایش کی، نہ کبھی انھیں اپنے اصول کے خلاف بات کہنے کی مجبوری پیش آئی۔ ایک دن، خدا معلوم کیسے، دربار میں شعر و شاعری کی گفتگو شروع ہو گئی۔ مہاراجا بہادر نے ان سے مخاطب ہو کر کہا: پنڈت جی! آپ بھی تو "شاعر" ہیں! لیکن ہم نے آج تک آپ سے کچھ سنا نہیں۔ حاضرین نے بھی لقمہ دیا کہ مہاراج، یہ بہت بڑے شاعر ہیں، یہ ہیں، وہ ہیں وغیرہ۔ قصہ کوتاہ، حکم ہوا کہ اچھا، پنڈت جی اپنا کچھ کلام سنائیں۔ عرض کیا کہ حضور، اس وقت تو کچھ یاد نہیں، کل پیش کروں گا۔

اب یہ حیران کہ کہوں تو کیا کہوں۔ مدح ان کا شیوہ نہیں تھا۔ اگرچہ ۱۹۱۱ء کے جشنِ تاجپوشی کے موقع پر لالہ سری رام مرحوم کے اصرار پر انھوں نے ایک ترکیب بند "توزکِ قیصری" کے عنوان سے کہا تھا، جو اس تقریب کی سب منظومات میں سے بہترین نظم ٹھہری اور مستحقِ انعام قرار پائی۔ لیکن اس میں مدح کم اور تاریخ زیادہ تھی۔ اب جو مہاراجا بہادر نے فرمایش کی، تو یہ سٹپٹائے کہ لکھوں، تو کیا! آخر بہت سوچ بچار کے بعد ۱۰ بند کا ایک دعائیہ مسدس لکھا جس میں مدح اور نصیحت کا عجیب امتزاج پایا

پایا جاتا ہے؛ یہ ان کے کلیات "واردات" کی سب سے آخری نظم ہے۔
بہر حال ریاست چینینی کی ملازمت کا سلسلہ بھی ۱۹۲۹ء میں منقطع ہوگیا۔ چونکہ راجا صاحب ان کے کاموں میں بہت دخل دینے لگے تھے، جو انھیں پسند نہیں تھا؛ یہ استعفٰی دے کر الگ ہو گئے۔ اور اس کے بعد لاہور میں مستقل قیام اختیار کر لیا۔
۱۹۲۷ء میں لکھنؤ یونیورسٹی نے انھیں توسیعی تقریروں کے لیے مدعو کیا۔ پہلی تقریر کا جو انگریزی زبان میں تھی، عنوان تھا: اردو شاعری کی نشاۃ ثانیہ RENAISSANSE of URDU POETRY) یہ انھوں نے ۶ جنوری، ۱۹۲۷ء کو ڈاکٹر بندل الرحمٰن (ڈین اورینٹل فیکلٹی) کی صدارت میں کی تھی۔ دوسری تقریر چار دن بعد ۱۰ جنوری کو انجمن اردو کے زیر اہتمام ریڈ ہال کرسچین کالج میں اردو میں ہوئی۔ اس کا عنوان تھا: اردو اور لکھنؤ۔ اس جلسے کی صدارت سر وزیر حسن، جج چیف کورٹ اودھ نے کی تھی۔
تیسری تقریر بھی انگریزی میں تھی جس کا عنوان تھا، ہندستان کے دور قدیم اور عہد وسطٰی کی تاریخ (ANCIENT & MEDIEVAL HISTORY of INDIA)
اردو تقریر تو ان کے مجموعۂ مضامین "منشورات" میں موجود ہے، لیکن دونوں انگریزی تقریریں کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئیں۔
ستمبر- اکتوبر ۱۹۳۰ء میں نظام دکن میر عثمان علی خان مرحوم کے ایما پر ایک اردو کانفرنس حیدرآباد دکن میں منعقد ہوئی تھی کیفی صاحب کو بھی مدعو کیا گیا۔ اس موقع پر حیدرآباد میں انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کلب میں جو تقریر کی تھی، وہ بھی "منشورات" میں شامل ہے؛ عنوان ہے: مبادیات فصاحت۔ حیدرآباد میں اصحاب علم و ادب نے ان کی بہت آؤ بھگت کی۔ مہاراجا سر کشن پرشاد بہادر شاد نے خاص طور پر بہت عزت افزائی فرمائی؛ بلکہ ایک خاص طرحی مشاعرہ بھی ان کے اعزاز میں اپنے در دولت پر کرایا، جس میں نہ صرف مقامی حضرات، بلکہ باہر کے اساتذہ نے بھی شرکت کی۔ خود مہاراجا بہادر نے طرحی غزل میں کیفی صاحب کا ذکر ان اشعار میں کیا تھا:

کہتا ہے شاد بھی یہی کیفی سے، با خلوص — "ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے"
مشہور خاص و عام ہے ان کی سخنوری — کامل ہیں ایسے، شاعر غزل کہیں جسے

جو جو نفوس اب ہیں، غنیمت سمجھو انھیں
ہر اک وحیدِ دہر ہے، یکتا کہیں جسے

ہندوستاں میں چند ہیں، ملکِ دکن میں چند
ایسا ہو کون، مثل ہم ان کا کہیں جسے

۱۹۳۱ء میں وہ دوبارہ حیدر آباد (دکن) تشریف لے گئے اور ایک توسیعی تقریر "اردو لسانیات" کے موضوع پر کلیۂ جامعہ عثمانیہ میں کی۔ یہ "منشورات" کا پہلا مضمون ہے۔

جب مستقل طور پر لاہور میں قیام اختیار کیا، تو وہاں "اردو سبھا" کی بنیاد ڈالی، جس نے پنجاب میں اردو کی ترویج اور لاہور کے کالجوں کے طلبہ کے دل میں تحقیق کا شوق پیدا کرنے میں بہت قابلِ قدر خدمات سر انجام دیں۔ وہ خود بھی اس سبھا کے جلسوں میں اپنے گرانقدر مقالے پڑھا کرتے تھے؛ ان میں سے بعض "منشورات" میں چھپ چکے ہیں۔

اس زمانے میں وہ اپنے دوسرے صاحبزادے پنڈت سریندر موہن دتاتریہ کے ساتھ رہنے لگے، جو محکمۂ تعلیم میں ملازم تھے۔ پھر کچھ مدت بعد ماڈل ٹاؤن (لاہور) میں اپنا ذاتی مکان تعمیر کر لیا اور اس میں اُٹھ گئے۔ تقسیمِ ملک سے پہلے جب آئے دن لاہور میں فساد ہونے لگے، تو وہ پنڈت سریندر موہن کے پاس لائل پور چلے گئے، جو ان دنوں وہاں گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے۔ انہی ایام میں یہ افواہ سننے میں آئی کہ اس ہنگامے میں کیفی صاحب بھی قتل کر دیے گئے ہیں۔ جب یہ خبر اخبار میں چھپی، تو ان کے قدیم دوست سید معشوق حسین اطہر ہاپوڑی نے تاریخ کہی:

راہ لے کر عدم کی یاروں نے
کر دی منزل مرے لیے بھی قریب

شاعرِ نامی و گرامیِ ہند
برج موہن مرے شفیقِ نجیب

ہو گئے رہ نوردِ ملکِ بقا
ان کے مرنے کا سانحہ ہے عجیب

خادمِ شعر، حامیِ اردو
ناظم و ناثر و خطیب و ادیب

بے ریا، بے تعصب و مخلص
تھے وہ اک آدمی عجیب و غریب

ماہرِ فنِ شعر و صاحبِ ذوق
کس کو یہ وسعتِ نظر ہے نصیب

ان کی تاریخِ قتل ہے، اطہر!
"کیفیِ خوش سخن، فصیح و ادیب"

لیکن وہ پنجاب سے نکل کر ہندوستان چلے آئے تھے اور بمبئی میں ایک دوست کے ہاں مقیم تھے۔ جب اپنی وفات کی خبر پڑھی، تو دیکھیے کن دردناک الفاظ میں اس کی تردید کی ہے:

جس بھلے مانس نے میرے قتل ہونے کی خبر آپ کو بھیجی، وہ میرا خیر خواہ اور سچا غمگسار ہوگا، کیونکہ میں سوا دو برس سے وجع مفاصل اور دل وغیرہ کے امراض میں مبتلا ہوں۔ ان تکلیفوں میں اہلِ وطن کے اس رویے کو دیکھ کر جو دلی اذیت مجھے ہوئی اور جس طرح میری روح تڑپی اور تڑپ کر رہ گئی، موت ہی اس سے نجات دلا سکتی ہے۔ کاش، میں ان ہنگاموں کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھتا اور اس دنیا سے چل بسا ہوتا۔

میں تو اس خبر کو سن کر مطمئن ہوا کہ میرے دل کی کیفیت جاننے والا کوئی ہے۔ مگر اس خیال سے کہ اس خبر کو سن کر میرے دوستوں اور عزیزوں کو صدمہ ہوا ہوگا، آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں، اور اعلان کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے میں زندہ ہوں۔ مجھ پر کوئی حملہ نہیں ہوا۔ میں بمبئی میں ہوں اور موسمِ بہار تک یہیں ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔"

یہ خط "ریاست" (ہفتہ وار) کے ایڈیٹر سردار دیوان سنگھ کے نام لکھا گیا تھا۔ جب ان کے بقیدِ حیات ہونے کی خبر شائع ہوئی، تو اطہر صاحب نے دوبارہ قطعہ لکھا:

زندہ ہیں فضلِ خدائے پاک سے — کیفیِ والا گہر، والا صفات
ان کے مرنے کی خبر نکلی غلط — باعثِ اندوہ تھی ان کی وفات
ان کے دم سے زندہ ہیں شعر و ادب — زندہ رکھ ان کو، خدائے کائنات!
مایۂ صد افتخار و ناز ہے — آج دنیائے ادب میں ان کی ذات
سوتر آنے، اور ان کا ایک شعر — سو لطیفے، اور ان کی ایک بات

عمرِ کیفی، ہم عددِ کیفی کی ہو ایک دن کم ہو نہ یارب! ایک رات

آپ بھی تاریخ اس افواہ کی
لکھیے، اظہر! "حضرتِ کیفی حیات"

تقسیم کے بعد وہ یہیں دلّی میں آرہے تھے۔ ۱۹۵۳ء کے وسط میں دلّی کے کچھ اربابِ ذوق نے طے کیا کہ ان کی ۸۸ ویں سالگرہ منائی جائے۔ ان کے عقیدتمندوں اور مدّاحوں سے فرمایش کی گئی کہ اس تقریب میں پڑھنے کے لیے مقالے لکھیں۔ لیکن ایک ہوائی حادثے میں دلّی کے مشہور کانگریسی کارکن جناب رگھونندن سرن کا انتقال ہوگیا۔ وہ کیفی صاحب کے دیرینہ دوست تھے۔ اس لیے یہ تقریب جو ۱۳ دسمبر ۱۹۵۳ء کو ہونا تھی، ملتوی کرنا پڑی۔ بالآخر یہ ۱۰ جنوری ۱۹۵۴ء کو منعقد ہوئی۔ ان کی کمزور صحت کے پیشِ نظر ان کی جائے قیام کے صحن ہی میں خیمے نصب کیے گئے۔ شہریوں کی طرف سے سپاسنامہ اور ...۔۴ روپے کی تھیلی ان کی خدمت میں پیش کی گئی۔ یہ رقم انھوں نے اسی وقت علمی اور ادبی اور سوشل کاموں کے لیے وقف کر دی۔

مارچ ۱۹۵۴ء میں بمبئی کے اصحابِ علم نے بھی وہاں ایک ایسی تقریب میں اپنے اس جوان ہمّت بزرگ کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ کیفی صاحب اپنی سقیم تندرستی اور پیرانہ سالی کے باوجود بمبئی تشریف لے گئے، جلسے کی کارروائی میں حصّہ لیا۔ اور چند دن کے قیام کے بعد واپس دلّی چلے آئے۔

اگست ۱۹۵۴ء میں وہ آنکھوں کا آپریشن کرانے کے لیے علی گڑھ گئے۔ آپریشن بہت کامیاب رہا اور وہ چشمے کی مدد سے لکھنے پڑھنے کے قابل ہو گئے، لیکن جسمانی صحت اتنی کمزور ہوگئی تھی کہ اب وہ تن تنہا یہاں نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ اپنے بھتیجے پنڈت اونکار ناتھ اُگھل، وکیل غازی آباد کے پاس چلے گئے۔ وہاں جاڑوں میں تندرستی بہت خراب ہوگئی۔ پیچش کے موذی مرض نے بہت پریشان کیا۔ دمہ کی بیماری ایک مدّت سے لاحق تھی ہی، اب قلب کی حالت بھی مخدوش ہو گئی۔ لیکن خدا نے خیر کی اور وہ اس حملے سے بچ نکلے۔ تاہم واقع یہ ہے کہ اس کے بعد اطمینان

کا ایک دن بھی نہیں گزرا، کچھ نہ کچھ حرکت دانش چلی ہی جاتی تھی۔ آخر یکم نومبر ۱۹۵۵ء کو دن کے ساڑھے بارہ بجے اردو کا یہ دیرینہ خادم، نو وارد ان میدانِ علم و ادب کا بےغرض رہنما، ہندستانی تہذیب کا مثالی نمونہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا اِلیہِ رَاجِعُون۔ اسی شام ارتھی اٹھی اور نعش کو جمنا کے کنارے نذرِ آتش کر دیا گیا۔

ان کا نظم کا سرمایہ ۲۵-۳۰ ہزار شعر سے کم نہیں ہوگا۔ لیکن ان کا بہت بڑا کارنامہ اردو زبان کی ابتدا، نشو و نما، رجحانات، آیندہ امکانات اور متعلقہ موضوعات سے متعلق تحقیقات پر مشتمل ہے۔ اس میدان میں بہت کم اصحاب ان کے حریف تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنی کتابوں اور مضامین میں ایسے ایسے نادر نکتے بیان کیے ہیں، اور ایسی خیال انگیز اور نتیجہ خیز باتیں لکھی ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اردو دراصل ریختہ ہے۔ جب تک کوئی شخص فارسی اور ہندستان کی مختلف پراکرتوں اور برج سے پوری آگاہی نہ رکھتا ہو، اس کے لیے اس زبان کے آغاز اور اس کی ساخت وغیرہ سے متعلق کوئی کام کرنا محال ہے۔ کیفی فارسی کے منتہی تھے اور جس حد تک ہر فارسی دان عربی سے واقف ہو جاتا ہے، اس حد تک کچھ عربی بھی جانتے تھے؛ ورنہ یوں نہ انھوں نے عربی پڑھی، نہ وہ اس کے جاننے کے دعویدار تھے۔ یہی حال سنسکرت کا ہے۔ ہندی وہ اچھی جانتے تھے، لیکن سنسکرت کی شُد بُد سے زیادہ واقفیت نہیں تھی۔ پراکرتوں سے البتہ ان کی معلومات گہری اور وسیع تھیں۔ انگریزی پر بھی انھیں عبور حاصل تھا، اور اس زبان میں بھی ان کی تحریریں زبان اور اسلوب بیان کے لحاظ سے بہت خوب ہیں۔

جسمانی اولاد میں تین بیٹے ہوئے: پیارے موہن، سریندر موہن اور مدن موہن۔ مدن موہن صغرسنی ہی میں تپ محرقہ کا شکار ہو گیا۔ سب سے بڑے پیارے موہن انگریزی کے بہت اچھے ادیب اور لاہور کے مشہور روزنامے "ٹریبیون" کے سینیر اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ اردو بھی بہت اچھی لکھتے تھے۔ افسوس کہ ۱۹۳۶ء میں عین شباب میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ایسے قابل اور ہونہار بیٹے کی موت، جتنا صدمہ

بھی ہوتا کم تھا۔ لیکن کیفی صاحب نے اس روح فرسا سانحے پر جس حوصلہ مندی اور صبر و شکر کا مظاہرہ کیا، وہ واقعی حیرتناک تھا۔ مرحوم کے دو لڑکے رام موہن اور برج موہن زندہ ہیں۔ کیفی صاحب کے منجھلے صاحبزادے پنڈت سریندر موہن ہیں جو ۱۹۵۷ء میں محکمۂ تعلیم سے پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ آج کل سنگرور میں مقیم ہیں۔

مرحوم نے اپنی ستّر سالہ ادبی زندگی کی یادگار دو درجن کے قریب کتابیں چھوڑی ہیں ان میں سے زیادہ مشہور حسبِ ذیل ہیں:

نظم : واردات (کلیاتِ اردو و فارسی)؛ بھارت درپن (مسدّس)؛ آئینۂ ہند؛ جگ بیتی (مثنویاں)؛ خمخانۂ کیفی؛ پریم ترنگنی؛ مرأتِ خیال؛ شوکتِ ہند؛ توزکِ قیصری؛ چند نظمیں۔

نثر : منشورات؛ کیفیہ، خمسۂ کیفی (نظم و نثر)؛ عورت اور اس کی تعلیم؛ رہنمائے سالک (انگریزی سے ترجمہ)

ڈراما : راج دلاری؛ مراری دادا

ناول : نہتّا رانا؛ پریم دیوی؛ افسانچے

متفرق مضامین کے دو ضخیم مجموعے مرتّب حالت میں موجود ہیں، جن کے کتابی شکل میں شائع ہونے کی نوبت نہ آئی۔ اسی طرح اور بھی کئی مسودے غالباً ضائع ہو گئے۔

اردو علم و ادب کی تاریخ میں کیفی کی خدمات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ مختصراً اتنا کہنے میں باک نہیں کہ اس صدی کے پہلے نصف میں اردو کی ایسی کوئی قابلِ ذکر تحریک نہیں تھی، جس میں انھوں نے دامے، درمے، قدمے، قلمے حصّہ نہ لیا ہو۔ ان کی تصنیفات ہمارا سرمایۂ ناز ہیں۔ ان کی تحقیق مدّتوں مزید کام کرنے والوں کے لیے شمعِ ہدایت کا کام دیگی۔

کسی نے تری طرح سے، اے انیس!
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

۲

۱۷- علی پور روڈ
سول لائنز
دہلی
۱۷- فروری ۱۹۵۱ء

جناب
آپ کہینگے، یہ عجیب شخص ہے کہ تعارف کے بغیر خط لکھنے کی جرأت کرتا ہے۔
میں بہت بوڑھا آدمی ہوں اور چھ برس سے مختلف بیماریوں کا تختۂ مشق ہوں - شاید آپ کو معلوم ہو، میری تمام زندگی ادبی مصروفیت میں گزری —— میرے بہت مسودے ہیں، خطوط ہیں، مضامین ہیں —— غرض کہ نثر اور نظم کی بہت سی چیزیں ہیں، اور خطوط جن کی ترتیب کی ضرورت ہو- پندرہ نوٹ بک ہیں، جو میں آپ کے حق میں وصیّت کر جانا چاہتا ہوں۔
میرا ایک بیٹا اور دو پوتے موجود ہیں، لیکن وہ اس کام کے اہل نہیں۔ اس لیے میری تجویز ہے کہ اگر آپ منظور فرمائیں، تو آپ کا نام وصیّت میں لکھ جاؤں۔ وصیّت ہوگی ہی میری ادبی جائداد کے متعلق، اور ہے بھی، بس اللہ کا نام۔
آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔
جب ہندوستان تشریف لائیں، تو ضرور درشن دیں۔

تصدیع معاف
نیاز مند - برجموہن دتاتریہ کیفی

بسلسلۂ کارِ منصبی ان دنوں بغداد میں مقیم تھا۔ جب یہ خط مجھے ملا، تو واقع یہ ہے کہ مجھے بہت تعجب ہوا۔ میں کیفی صاحب کی شاندار قلمی فتوحات اور ان کے ادبی مقام سے ناواقف نہیں تھا۔ اس میں کسی قسم کا انکسار نہیں کہ اگرچہ میں نے اِدھر اُدھر کے چند مضامین ضرور لکھے ہیں، لیکن مجھے اپنی بے بضاعتی اور ہیچ مدانی سے متعلق کبھی کوئی شبہہ پیدا نہیں ہوا۔ ہائے، حالی مرحوم نے کیا پتے کی بات کہی ہے!

کر دیا، مر کے، یگانوں نے، یگانہ ہم کو

ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز۔

اس لیے جب یہ خط مجھے ملا، تو میں سوچنے لگا کہ اس کا کیا جواب دوں۔ ظاہر ہے کہ بالکل انکار ممکن نہ تھا کہ اس سے ان کی دلشکنی ہوتی۔ اور ادھر اپنی مصروفیتوں کے پیشِ نظر یہ بھی ڈر تھا کہ اگر کام کا بیڑا اٹھا لیا اور اسے ٹھیک طرح سے انجام نہ دے سکا، تو انھیں حشر میں کیا منہ دکھاؤنگا۔ بہرحال میں نے جواب دیا کہ خدا آپ کو صد و سی سال زندہ رکھے، آپ جو بوجھ بھی میرے ناتوان کندھوں پر ڈالینگے، میں حتی الوسع اسے اٹھانے کی کوشش کرونگا۔ دعا فرمائیے کہ آپ کی زیرِ ہدایت اور نگرانی میں یہ کام کر سکوں۔ اس پر لکھا کہ "تمھارے خط نے ایک بھاری بوجھ میرے دل سے اٹھا لیا۔"

مجھے تجسس تھا کہ آخر انھیں میرا خیال کیونکر آیا اور انھیں میرا پتا کہاں سے ملا! پوچھ گچھ سے یہ راز بھی کھل گیا۔ اس سے چند مہینے پیشتر میرا ایک مضمون "میری پسند کی اردو کتابیں" کے عنوان سے "آجکل" میں چھپا تھا، جس میں ایک طرح سے اردو کے سارے نثری سرمایے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ مضمون ان کی نظر سے گزرا، تو بہت پسند کیا۔ اب انھیں ٹوہ ہوئی کہ اس کا لکھنے والا کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے رحمت قطبی صاحب کو، جو اکثر ان کے پاس آتے جاتے تھے، "آجکل" کے دفتر بھیجا۔ وہ وہاں سے میرا نام اور پتا دریافت کر کے لے آئے۔ اس پر انھوں نے یہ خط مجھے لکھا۔

ذ یہ تھی ہمارے تعارف کی ابتدا۔

اس کے دو تین مہینے بعد (یعنی اپریل ۱۹۵۱ء میں) میں مصر چلا گیا۔ خط آتے جاتے تھے۔ اسی اثنا میں انھوں نے اپنی چند اہم تصانیف کے نسخے مجھے بھیجے۔ ان میں منشورات اور کیفیہ اور واردات اور جگ بیتی بھی تھیں۔ لکھا کہ انھیں ایک نظر دیکھو۔ ان کی دو نثری کتابیں یعنی کیفیہ اور منشورات تو پہلے سے میری دیکھی ہوئی تھیں، بلکہ کیفیہ کا میرے اس مضمون میں بھی ذکر تھا، جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا۔ البتہ ان کے اردو اور فارسی کے مجموعے واردات اور جگ بیتی کے بالاستیعاب دیکھنے کا مجھے اس سے پہلے اتفاق نہیں ہوا تھا۔ یہ اب دیکھیں۔

اب ان کا تقاضا شروع ہوا کہ میری صحت زیادہ خراب رہنے لگی ہے۔ ہندستان آ ؤ اور مل جاؤ۔ مجھے بھی جلا وطن ہوئے پانچ چھ برس ہو گئے تھے۔ میں تقسیمِ ملک سے چند ماہ پیشتر یہاں سے باہر گیا تھا۔ قدرتی طور پر دل چاہتا تھا کہ آ کے سب عزیزوں سے ملوں۔ اب جو انھوں نے بار بار لکھا، تو خیال آیا کہ ایک پنتھ دو کاج؛ چلو، اس بہانے کیفی صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ چنانچہ میں اواخر جنوری ۱۹۵۲ء میں یہاں آیا۔ دس پندرہ دن عزیزوں کے پاس بمبئی میں ٹھہرا۔ وہیں ان کا خط ملا کہ اگر دلّی میں قیام کا کوئی اور ٹھکانا نہ ہو، تو میں انتظام کر دوں۔ حال آں کہ وہ خود یہاں ایک دوست کے ہاں مستقل مہمان کی طرح رہتے تھے، اس پر بھی انھوں نے نہایت محبّت سے اپنے ساتھ میرے رہنے کا انتظام کر لیا۔ لیکن میں نے لکھا کہ آپ یہ تکلیف نہ فرمائیں۔ دلّی میں میرے بہت سے عزیز ہیں، بآسانی ان میں سے کسی کے ہاں ٹھہر سکتا ہوں۔

میں یہاں پہنچنے کے اگلے ہی دن ناشتے کے بعد ان کی قیام گاہ علی پور روڈ پر حاضر ہوا۔ میں جب پہنچا ہوں، تو وہ غسل فرما رہے تھے۔ میں وہیں برآمدے میں بیٹھا اخبار کے ورق الٹ پلٹ کے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ نہا دھو کر غسل خانے سے نکلے اور میرے برابر سے گزر کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے انھیں اس سے پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا، اس لیے یقین سے تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی ہیں، لیکن چونکہ مکان کے

اس حصے میں کوئی اور مکین نہیں تھا، اور یہ مجھے ملازم سے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ غسل خانے میں ہیں، اس لیے میں نے اندازے سے خیال کر لیا کہ وہی میرے پاس سے گذرے ہیں۔

اگر انھوں نے مجھے وہاں بیٹھے دیکھا بھی، تو دریافت نہیں فرمایا۔ میں نے بھی ان سے تعرض نہیں کیا، تاکہ وہ کمرے میں پہنچ کے اطمینان سے بیٹھ لیں۔ چنانچہ دس منٹ کے بعد میں ان کے کمرے میں گیا۔ وہ آرام کرسی پر بیٹھ چکے تھے۔ ان ایام میں وہ کچھ اونچا سننے لگے تھے اور اس کا ذکر بھی مجھ سے ملازم نے پہلے ہی کر دیا تھا۔ اس لیے میں نے ذرا اونچی آواز سے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ نظر اٹھا کے دیکھا، زبان سے صرف ایک لفظ کہا: آیئے۔ اور ہاتھ کے اشارے سے اجازت دی۔ میں اندر گیا، تو مجھے غور سے دیکھ کر فرمایا: آپ کا اسم گرامی؟ میں نے عرض کیا: مالک رام۔ تو فوراً کھڑے ہو گئے، اور لپٹا لیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان کے قلب سے گرمی کی ایک لہر نکل کے میرے جسم میں داخل ہو رہی ہے۔

ذرا حلیہ سنیے:

بہت مختصر قد، پانچ فٹ سے کسی طرح زیادہ نہیں ہوگا۔ آفتابی چہرہ، فراخ پیشانی؛ سر پر مختصر کھچڑی بال، سفید زیادہ، سیاہ کم؛ اندر دھنسی ہوئی نیلگوں آنکھیں؛ تیکھی ناک، چھوٹے چھوٹے نتھنے؛ جھریوں بھرا چہرہ، کلوں کے نیچے اور گردن پر لٹکتا ہوا گوشت؛ ڈاڑھی مونچھ کا صفایا؛ تنگ دہانا؛ مصنوعی دانت۔ جوانی میں رنگ ضرور کھلتا ہوا اور صاف ہوگا، لیکن اب سنولا گیا تھا۔

بہت محبت اور تپاک سے ملے۔ میرے ساتھ صرف بیوی اور بڑا لڑکا ہندستان آئے تھے۔ دوسرے بچے اور والدہ وہیں اسکندریہ میں رہ گئے تھے۔ ان کی خیریت اور مزاج کی کیفیت پوچھتے رہے۔ کہاں اترے ہو، کتنی مدت قیام رہیگا وغیرہ۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا وہ موقع تلاش کر رہے ہیں کہ اگر کسی بات کی کمی ہو، تو اسے

میں پوری کر دوں۔ ہفتے عشرے بعد پچیس تیس احباب کو مجھ سے ملانے کے لیے چائے کی دعوت دی۔ دو تین گھنٹے خوب گپ شپ رہی۔ مدعوین میں بیشتر میرے پرانے دوست تھے۔ میں ان سے مل کر خوش ہوا۔ امید ہے کہ وہ بھی مجھ سے مل کے خوش ہوئے ہونگے۔

میں جتنے دن یہاں رہا، حتی الوسع روزانہ، ورنہ ایک دن چھوڑ کر ضرور، حاضر خدمت ہوتا رہا۔ وہ صبح بہت سویرے اٹھ جانے کے عادی تھے۔ ضروریات سے فارغ ہو کر کرسی پر آ بیٹھتے۔ اتنے میں ملازم حقہ تازہ کر کے لا رکھتا۔ تھوڑی دیر میں اخبار آ جاتا۔ کبھی صرف انگریزی، کبھی انگریزی اور اردو دونوں۔ انھیں پورے غور اور توجہ سے پڑھتے۔ خبریں تو درکنار، بالعموم اشتہار تک اہتمام سے دیکھتے۔ اس وقت ان کی عمر ۸۶ برس کے لگ بھگ تھی، لیکن ہمیشہ انھیں چشمے کے بغیر پڑھتے دیکھا۔ اگر اخبار میں کوئی علمی یا ادبی دلچسپی کی چیز نظر آتی، تو اس پر نشان کر دیتے؛ یہ بعد کو اخبار سے کٹ کر ان کی کسی یادداشت کے سفینے میں رکھی جاتی۔

وہ شاذ و نادر کہیں باہر جاتے تھے۔ گٹھیا کے پرانے مریض تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاؤں کی انگلیاں سوج کے اینٹھ گئی تھیں، اس لیے جوتا نہیں پہن سکتے تھے۔ گھر پر بھی سلیپر یا چپل میں رہتے، اور اگر کسی مجبوری سے باہر جانے کی ضرورت پیش آ جاتی، تو چپل ہی پہن کے نکلتے۔ دوست احباب گھر پر آ جاتے اور مل لیتے تھے۔ میں پہنچتا، تو بات یا تو اس دن کی کسی خبر سے شروع ہو جاتی، یا کوئی اور مسئلہ زیر بحث آ جاتا۔ ایک دن مجھے بازی بازیش یا باہم بازی کی سوجھی۔ میں نے عرض کیا کہ میں آپ کی مثنوی جگ بیتی دیکھ رہا تھا، دو ایک جگہ مجھے شبہ ہوا ہے۔ اجازت ہو، تو عرض کروں۔ فرمایا: خوب! کہو۔ میں نے ہنس کے کہا: قبلہ! میں نے تو آپ کے کلام پر اصلاح دی ہے۔ کہا: بھائی! میں تو طالب العلم ہوں۔ اگر کوئی جائز اور درست بات ہو گی، تو اسے کیوں نہ تسلیم کروں گا۔ میں نے دو چار جگہ کی نشاندہی کی، تو فوراً اتفاق کیا۔

میں ایک ضرورت سے اچانک مارچ کے آخر میں واپس مصر چلا گیا۔ وہاں پہنچ کے

میں نے خیال کیا کہ اس مثنوی پر ایک مضمون لکھنا چاہیے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر میں نے اس کا زیادہ غور و خوض سے مطالعہ کیا۔ اب مجھے اور بھی جگہ زبان و بیان سے متعلق گفتگو کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پہلے تجربے کی بنا پر میں نے اپنے تمام شبہات اور اصلاحات لکھ کر انھیں بھیج دیں۔ ان میں سے بھی بیشتر انھوں نے منظور کر لیں۔ یا تو میری مجوزہ تبدیلی ہی سے اتفاق کیا، یا شعر کسی اور طرح تبدیل کر دیا۔

یہ ان کے کردار کا بہت روشن پہلو ہے۔ وہ اردو کے مسلّمہ استاد تھے۔ اس زبان کی ابتدا، اور اس کے نشو و نما، اس کے الفاظ کی بناوٹ اور مزاج پر ان کی بہت گہری نظر تھی۔ اپنی دونوں کتابوں منشورات اور کیفیہ میں اس پہلو سے جیسی منڈی کی چندی انھوں نے نکالی ہے، وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے باوجود ان کا میرے مشورں کو تسلیم کر لینا، اور اپنے اشعار کو تبدیل کر دینا، ان کی وسعتِ قلب اور حق جوئی اور راست پسندی کی بیّن دلیل ہے۔

لیکن بدقسمتی سے بعد کو اسی مثنوی کے سلسلے میں وہ مجھ سے بہت خفا بھی ہوئے۔ ہوا یہ کہ میں نے مقالہ لکھا، جو بمبئی کے ماہی رسالے "نوائے ادب" میں چھپا۔ میں نے شامتِ اعمال سے اس میں ایک جگہ یہ بھی لکھ دیا کہ اس میں بعض بہت مشکل لفظ آگئے ہیں، جو نظم تو درکنار، نثر میں بھی بہت کم استعمال ہوتے ہیں۔ اس پر وہ بہت بگڑے۔ مجھے بھی بہت برا بھلا کہا اور بعض دوسرے اصحاب سے بھی اس امر کی شکایت کی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی نظرِ عنایت بدستور مجھ پر مبذول رہی۔

مجھے ان کی حق جوئی کا ایک اور سلسلے میں بھی تجربہ ہوا۔ انھوں نے مختلف رسالوں میں بیسیوں مضمون لکھے تھے، لیکن یہ بدقسمتی سے آج تک کتابی صورت میں جمع نہیں ہوئے۔ ان میں ہر طرح کے مضمون ہیں۔ زبان کی تحقیق سے متعلق قدرتی طور پر زیادہ ہیں، لیکن کچھ تنقیدی چیزیں بھی ہیں، بعض میں اُن اصحاب سے متعلق ان کے تاثرات ہیں، جن سے وہ ملے تھے۔ اور بھی متفرق چیزیں ہیں۔ میں جب آیا تو انھوں

نے یہ پشتارہ میرے حوالے کر دیا کہ اسے اشاعت کے لیے مرتّب کر دو، ساتھ ہی یہ اجازت دی کہ اگر کسی جگہ ردّ و بدل کی ضرورت محسوس کرو، تو تمھیں کھلی چھٹی ہے۔ چنانچہ میں نے یہ تمام مضمون پڑھے۔ انھیں ایک خاص ترتیب سے مدوّن کیا۔ بعض مضمون میرے خیال میں اس قابل نہیں تھے کہ انھیں مجموعے میں شامل کیا جاتا۔ یہ میں نے الگ رکھ دیے۔ جب میں نے ان سے اس کا ذکر کیا، تو بے جھجک انھوں نے میرا مشورہ قبول کر لیا اور فرمانے لگے کہ بعض اوقات خود لکھنے والے کو اس بات کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا کہ کونسی چیز کس پائے کی ہے۔ یہ تو نقّاد کا کام ہے کہ وہ کھرے کھوٹے کو پرکھے۔ اگر تمھاری نظر میں یہ مضمون شاملِ اشاعت نہیں ہونا چاہییں، تو انھیں رد کر دو۔ چنانچہ وہ میں نے الگ کر دیے۔ ان کی اس قربانی کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کوئی لکھنے والا ہی کر سکتا ہے۔ مصنّف کو اپنے لکھے سے جو محبّت ہوتی ہے، وہ والدین کی اپنی اولاد سے زیادہ نہیں، تو کم بھی نہیں ہوتی۔ اور کون ماں باپ ہیں، جو اپنی اولاد کو، خواہ وہ کتنی ہی ناکارہ اور بدصورت کیوں نہ ہو، قربان کر دینگے؟

میں چاہتا تھا کہ ان پر ایک مقدمہ لکھوں، لیکن جیسا کہ میں نے بیان کیا، مجھے یکایک واپس جانا پڑا اور وہ کام درمیان میں رہ گیا۔ اور افسوس ہے کہ ان کے بعد وہ سارا ذخیرہ ایسے لوگوں کی تحویل میں چلا گیا، جنھیں اس کی اہمیت کا اندازہ تھا، نہ کیفی صاحب سے دلچسپی۔ شاید وہ اس کے اہل بھی نہیں تھے۔

ان کی بڑی زبردست خواہش تھی کہ ان کی شاعری کا صحیح جائزہ لیا جائے۔ انھوں نے جو تجربے اردو شاعری میں کیے ہیں، وہ بہت اہم ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے مجموعۂ کلام (واردات) پر تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ جب دسمبر ۱۹۵۳ء میں دلّی والوں نے ان کی ۸۸ ویں سالگرہ منائی تو اس موقع پر پڑھنے کے لیے بعض اصحاب نے مقالے بھی لکھے تھے۔ میرے پاس بھی کیفی سالگرہ کمیٹی کے سکریٹری کا خط پہنچا کہ اس تقریب کے لیے مقالہ لکھیے۔ چونکہ وقت تنگ تھا، اور ان دنوں میں خود بھی بہت

عدیم الفرصت تھا، اس لیے کوئی بسیط مقالہ قلمبند کرنے کا موقع نہیں تھا۔ دوسرے مجھے یہ بھی خیال تھا کہ اس طرح کی محلسوں میں لمبا مقالہ پڑھا نہیں جا سکتا۔ ان تقریبوں میں لوگ باگ مروّت کے مارے یا تفریحِ طبع کے لیے آجاتے ہیں۔ اگر آپ کوئی طویل یا ٹھوس چیز سنانے لگیں، تو بدقسمتی سے سامعین فوراً جماہیاں لینا شروع کر دینگے۔ چنانچہ میں نے ان کی دونوں نثری کتابوں منشورات اور کیفیہ پر پانچ ایک صفحے کا مختصر مضمون لکھا، جس میں ان کی خصوصیات اور زبان کی تاریخ میں ان کا مقام متعین کیا گیا تھا۔ اس پر انھوں نے لکھا:

> میں دیکھ رہا ہوں کہ لوگ اس موقع پر مقالہ لکھنے کے لیے منشورات اور کیفیہ کی طرف زیادہ دوڑ رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ دونوں کتابیں میرے بعد کچھ نہ کچھ مدّت تک زندہ رہینگی۔ مگر ایک شاعر کی حیثیت سے جو میرا کام ہے، اس کی جانچ ابھی تک کسی نے نہیں کی۔ یا تو لوگ "واردات" کی ضخامت سے مرعوب ہو کر رہ جاتے ہیں، یا میرے اجتہادات اور خدمات کو قدر کے قابل نہیں سمجھتے۔
>
> آپ نے اتنی قلیل مدّت میں ایسی اچھی چیز بھیجی ہے، جو مجھے بہت پسند آئی۔ امید ہے تقریبِ معلومہ کے موقع پر سامعین بھی محظوظ ہونگے۔ آپ دیکھتے ہی ہیں، لوگوں کے مزاج میں سہل انگاری اور آسان پسندی بہت ہے۔ اصل بات کے مغز کو پہنچنا ان کے لیے جوئے شیر لانا ہے۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ "واردات" کی ضخامت بڑی ڈراونی ہے۔ یہ بڑے سائز کی ۵۰۰ صفحے کی کتاب ہے۔ اب زمانہ ہے عجلت کا، کاتا اور لے دوڑی۔ سو دو سو صفحے سے زیادہ کی چیز پڑھنے پر کوئی آسانی سے آمادہ نہیں ہوتا۔ اسی لیے ان کا ارادہ تھا کہ "واردات" کو چند حصوں میں تقسیم کر دیا جائے: قومی نظمیں، قطعات، غزلیات، فارسی کلام،

وغیرہ - اس طرح پڑھنے والوں کو آسانی ہو جائیگی اور وہ اس خاص میدان میں بھی ان کی نمایاں خصوصیات کا صحیح اندازہ کر سکیگا - افسوس کہ انھیں اس کی فرصت نہ ملی ؛ اور اب تو زمانے کا رنگ ہی بدل گیا ، اب یہ کام کون کریگا؟

۱۹۵۴ء کے شروع میں میری وطن کو واپسی کے امکانات پیدا ہو گئے ، تو میں نے انھیں اطلاع دی کہ خدا چاہے ، تو میں غالباً جون تک قدمبوسی کے لیے حاضر ہونگا - اس پر لکھا :

> میں تمھاری اس محبت کا حد درجہ ممنون ہوں کہ تم نے میری طبیعت کو خوش کر دیا یہ لکھ کر کہ جون کے مہینے میں تم مستقل طور پر دلی آ رہے ہو - میری حالت رفتہ رفتہ خراب تر ہوتی جا رہی ہے - خود غرضی سمجھو یا کچھ ، تمھارا پچھلا خط پڑھ کر میرا دل چاہتا ہے کہ جیوں ، جب تک تم کو مع الخیر دلی میں نہ دیکھ لوں - ورنہ میں اس زندگی سے تنگ آ گیا تھا -

مجھے چلتے چلتے کچھ دیر ہو گئی - آخر کار میں دسمبر ۱۹۵۴ میں یہاں پہنچا - وہ اگست میں آنکھیں بنوانے کے لیے علی گڈھ گئے تھے ـــــ علاج بہت کامیاب رہا - لیکن کچھ عمر کا تقاضہ اور کچھ متواتر بیماری کی کھکھیڑ ، اس پر یہ عمل جراحی ؛ بہت کمزور ہو گئے - چونکہ اس حالت میں وہ اکیلے نہیں رہ سکتے تھے ، اس لیے جب پٹی کھلی ، تو وہ دلی آنے کی بجائے چند دن کے لیے غازی آباد میں اپنے بھتیجے پنڈت اودکا ناتھ صاحب کے پاس چلے گئے - خیال تھا کہ وہاں گھر میں رہنے اور مناسب دیکھ بھال سے ان کی معمولی طاقت جلد عود کر آئیگی - ہائے کسے معلوم تھا کہ اب وہ دلی کبھی نہیں آ سکینگے اور غازی آباد ہی زندگی میں ان کا آخری مسکن بننے والا ہے ، اور یہیں کی مٹی میں ان کی مٹی ملنے والی ہے -

میں یہاں پہنچتے ہی غازی آباد گیا - بہت خوش ہوئے - لیکن ان کی حالت دیکھی

نہیں جاتی تھی۔ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ نواسی برس کا کوئی آدمی بھی سامِ نریمان کا مقابلہ تو نہیں کیا کرتا، لیکن چونکہ ان کا جسم کسرتی تھا اور عمر بھر انھوں نے کسی قسم کی بد اعتدالی کو پاس نہیں پھٹکنے دیا تھا اس لیے ان کی عام تندرستی ہمیشہ اچھی رہی۔ لیکن اب ان کی حالت دیکھ کر میں کچھ ڈر سا گیا۔ وہ محض ہڈیوں کا پنجر ہو کے رہ گئے تھے۔ کوئی چیز ہضم نہیں ہوتی تھی اور انھیں چوکی پر بیٹھنے اور اٹھنے میں بھی ایک ہفتخوان طے کرنا پڑتی تھی۔ غرض ۱۹۵۴ء کی سردیوں کا زمانہ بڑی تشویش میں گزرا۔ اور تو اور وہ خود بھی مایوس ہو گئے تھے۔ لیکن کچھ لیا دیا آڑے آ گیا۔ خدا نے اپنا فضل کیا اور وہ اس حملے سے بچ نکلے۔ جاڑا ختم ہوا، تو ان کی حالت اور بھی سنبھلنے لگی۔ خود بخود چل کے باہر صحن میں دھوپ میں آ بیٹھتے اور چشمہ لگا کے اخبار یا کتاب دیکھتے رہتے۔

میں اس زمانے میں پہلے تو ہر اتوار کے دن حاضر ہوتا رہا، لیکن بعد کو وقفہ لمبا ہونے لگا۔ میری مصروفیتیں روز بروز بڑھتی گئیں، اور یہاں سے نکلنا مشکل ہو جاتا، تو کبھی کبھی دو دو تین تین ہفتے گزر جاتے۔ لیکن جب بھی جاتا، بہت خوش ہوتے۔ گفتگو کسی نہ کسی علمی ادبی موضوع پر ہوتی۔ اس بیماری سے پہلے تک ان کا حافظہ بالکل درست تھا؛ وہ کتابوں کے حوالے اور سند کے اشعار بہت آسانی سے پیش کر دیتے تھے۔ خواہ کسی مسئلے پر گفتگو ہو، وہ دیر تک مسلسل اس سے متعلق تقریر کر لیتے۔ اس بیماری کے ایام میں بھی وہ بات چیت ہمیشہ نہایت گوش و ہوش سے کرتے رہے۔ واقعی حیرت ہوتی تھی کہ ایسی سخت بیماری اور جسمانی کمزوری کے زمانے میں بھی ان کا دماغی توازن بالکل نہیں بگڑا۔ لیکن اب یہ اثر نمودار ہو گیا کہ وہ کبھی کبھی کوئی بات بھول جاتے۔ لیکن اس کے باوجود اگر کچھ کہتے، تو اس میں کسی قسم کی کوئی غلطی نہیں ہوتی تھی۔

ایک دن گیا تو پوچھا تم نے کتاب "مرقّع دہلی" دیکھی ہے؟ میں نے جواب نفی میں دیا۔

اندر سے اپنا سفری بکس منگوایا۔ جیب سے اس کی کنجی نکالی اور اسے کھول کر اس میں سے کتاب نکال کر میرے حوالے کی۔ یہ ایک دکنی امیر کی دلّی کے قیام کی سرگزشت فارسی زبان میں ہے۔ فرمانے لگے جہاں بیدل کے مزار پر عرس وغیرہ کا حال لکھا ہے، وہ حصّہ پڑھو۔ میں نے پڑھا۔ یہاں لکھا ہے کہ مزار کا مجاور بیدل کا بھتیجا ہے، وہ بالکل جاہل ہے۔ عقیدت مند زائرین آتے ہیں اور وہ ان کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے۔ جب اس کے بعد پھر گیا تو حکم دیا کہ بھائی، اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کر ڈالو۔ میں نے عرض کیا کہ پوری کتاب کے ترجمے کی ضرورت ہے، نہ اس سے کچھ فائدہ ہی ہو گا۔ البتہ اگر حکم ہو، تو اس کے اس حصّے کا ترجمہ کر دوں، جہاں دلّی والوں کی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ فرمایا، بہت اچھا، یہی کرو۔ افسوس کہ یہ کام بھی ان کی زندگی میں پورا نہ ہو سکا (پھر اس کا ترجمہ ایک اور صاحب نے کر کے حیدرآباد سے چھپوا دیا)

انھیں پڑھنے لکھنے کا گویا جنون تھا اور واقعہ یہ ہے کہ جب تک کسی انسان کو اپنے کام سے جنون کی حد تک شغف نہ ہو، وہ اس میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا زندگی کے دوسرے شعبوں کو چھوڑیے، علم و ادب ہی کو لیجیے، تو آپ کو معلوم ہو گا کہ دنیا کے جس فاضل نے بھی اس میدان کی کسی شاخ میں نام پیدا کیا، اسے اپنے کام کے سوا کسی اور چیز سے کام نہیں رہا۔ میر و مرزا سے لے کر فانی و فراق تک بیسیوں حضرات کے نام مثال میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ کیفی صاحب کا بھی اوڑھنا بچھونا علم اور حصول علم تھا۔ انھیں سوتے جاگتے ایک ہی دُھن تھی۔ اردو کا ملک میں کیا حال ہے؟ اس کے خلاف کیا کیا چالیں چلی جا رہی ہیں؟ کن کن ذرائع سے اس کی بقا اور ترقی کا سامان مہیا ہو سکتا ہے؟ جب بھی ان سے ملاقات ہوئی، یہی باتیں موضوع گفتگو رہیں۔ کتابوں کا تو گویا انھیں خبط تھا۔ ان کے پاس ہندستان اور پاکستان کے درجنوں اخبارات اور رسالے آتے تھے۔ وہ ان میں سے ہر ایک کو التزام سے دیکھتے۔ ان میں اگر کسی دلچسپ اور کام کی کتاب پر تبصرہ چھپتا، تو اسے منگواتے

اور پڑھتے۔ موت سے کوئی دو تین ہفتے قبل مجھ سے کہا کہ "اپنی موج میں" (از آزاد) کا ایک نسخہ بھجوا دو۔ بھیج دیا۔ پھر گیا تو فرمایا لاہور والوں نے فغانِ دہلی اور دیوان شیفتہ کے نئے ایڈیشن چھاپے ہیں، وہ منگوا دو۔ بالکل آخری ایام میں پنڈت جواہر لال نہرو کی امنِ عالم کے لیے سرگرمیوں سے متاثر ہو کر ایک طویل نظم "ایشیا" کے عنوان سے لکھی، جو شائع نہیں ہوئی۔ یاد آگیا۔ اس کے لیے مجھے لکھا کہ انڈونیشیا کے شہر بانڈونگ کا، جہاں اس سال کے شروع میں ایشیائی اور افریقی ممالک کی کانفرنس ہوئی تھی، صحیح تلفظ کیا ہے۔ کیا ہمارے جدید ادیب اور شاعر اپنی زبان کے لفظوں کے تلفظ معلوم کرنے کے لیے کبھی اتنی احتیاط اور محنت کرتے ہیں، جو یہ جوان ہمت بوڑھا کرتا تھا؟ غرض کس کس بات کا ذکر کیا جائے!

کیفی صاحب نے علم و ادب میں جو مقام حاصل کیا، یہ انھیں راہ چلتے نہیں مل گیا تھا بلکہ اس کے لیے انھوں نے مسلسل محنت اور ریاض کیا تھا۔ اردو اور ہندی تو خیر ان کی مادری زبانیں تھیں ہی، ان کے علاوہ برج اور کھڑی بولی اور دوسری پراکرتوں پر بھی ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ انگریزی بھی بہت عمدہ لکھتے اور بولتے تھے۔ چونکہ فارسی میں منتہی تھے، اس لیے عربی سے بھی نابلد نہیں تھے۔ اور اتنا کچھ حاصل کر لینے کے بعد کہیں وہ یہ سارے پاپڑ بیلنے کے قابل ہوئے، جن کی تعریف میں ہمارے سب چھوٹے بڑے رطب اللسان ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی کامیابی کا اصل راز ان کی محنت کی عادت میں مضمر تھا۔ انھوں نے ایک ایک لفظ کی کھوج میں اتنی چھان بین اور محنت کی ہے، جتنی ہمارے نوجوان پوری کتاب لکھ ڈالنے میں نہیں کرتے۔ نتیجہ بھی ظاہر ہے۔ مرحوم کی کسی تحریر میں آپ جھول نہیں پائیں گے۔ وہ اپنا مافی الضمیر بڑی آسانی سے چند لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس طول کلامی اور ژولیدہ بیانی ہماری نئی پود کی تحریر کا طرۂ امتیاز ہے۔ بقول خواجہ غلام السیدین مرحوم دونوں میں فرق ہے، ہضم کرنے اور اُگلنے کا۔ کیفی صاحب کو جس موضوع پر لکھنا ہوتا،

پہلے وہ اس کے مالۂ وما علیہ کا پوری طرح مطالعہ کرتے، پھر اس پر غور و فکر کرتے، اور جب اس کے سب اطراف پر پوری طرح حاوی ہو جاتے، تو اس پر قلم اٹھاتے۔ لیکن اب کیا ہو رہا ہے؟ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہر ایک کے سر پر مصنّف او، شاعر کہلانے کا بھُوت سوار ہے۔ جو شخص بھی دو چار الٹی سیدھی سطریں لکھ سکتا ہے، وہ سیدھا چھاپے خانے کی طرف دوڑتا ہے۔ ہمارے نوجوانوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ اگر وہ کچھ کرنا چاہتے ہیں، تو انھیں محنت اور صبر و استقلال سے جی نہیں چُرانا چاہیے۔ چھپنے چھپانے کے لیے بہت وقت پڑا ہے لیکن

بسیار سفر باید، تا پختہ شود خامے

مرحوم کی زندگی ضابطے اور اصول کی زندگی تھی، جس میں وقت کے ضائع کرنے کا خیال بھی نہیں آسکتا تھا۔ ہر ایک کام کا وقت تھا اور ہر ایک چیز کی جگہ مقرر تھی۔ گرمیوں میں پانچ بجے اور سردیوں میں چھ بجے صبح اٹھتے۔ ضروریات سے فارغ ہو کر آرام کرسی پر آ بیٹھتے۔ پہلے ایک پیالی چائے پیتے، پھر حقّہ تازہ دم آجاتا۔ سٹک منہ میں ہے اور اخبار آنکھوں کے سامنے۔ جب اسے دیکھ چکتے، تو کوئی رسالہ یا کتاب اٹھا لیتے۔ اگر کوئی ملنے والا آجاتا، تو اس سے بات چیت ہوتی۔ ورنہ دوپہر تک کتاب دیکھتے رہتے، دوپہر کو ہلکا سا کھانا۔ جب تک معدے نے ساتھ دیا، گوشت کھاتے رہے۔ لیکن آخری ایام میں یہ کھچڑی اور ترکاری تک محدود ہو گیا تھا۔ کھانے کے بعد سگار پیتے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر استراحت کے لیے لیٹ جاتے۔ تین ساڑھے تین بجے جاگتے اور پھر آرام کرسی پر آ بیٹھتے اور دوبارہ وہی پروگرام شروع ہو جاتا۔ پہلے چائے اور پھر مطالعہ، بیچ میں حقّہ پیتے رہتے۔ سرِ شام کھانا کھا لیتے۔ آخری ایام میں بالعموم رات کو جلد سو جاتے تھے۔

ہر ایک چیز کی جگہ مقرر تھی۔ رومال، چشمے کا خول، تولیا، جوتا، سلیپر، جرّاب، کنجیوں کا گچھا — غرض ان کی ہر ایک استعمال اور ضرورت کی چیز کا ایک مقام تھا۔

مجال ہے کوئی چیز اپنی جگہ سے ہٹا کر کہیں دوسری جگہ رکھ دی جائے۔ اگر آپ کہیں بیخیالی میں مثلاً چشمے کی ڈبیا کو ان کے بائیں طرف سے اٹھا کر دائیں طرف رکھ دیں، تو وہ آپ سے تو کچھ نہیں کہینگے، لیکن چند منٹ بعد خموشی سے اسے اٹھا کر پھر اس کی اصلی جگہ پر رکھ دینگے۔ اس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی زندگی کس حد تک منتظم اور مرتب تھی، وہیں اس کا ایک عملی فائدہ بھی تھا کہ انھیں کسی چیز کی تلاش کرنے میں دقّت نہیں ہوتی تھی، نہ وقت ہی ضائع ہوتا تھا۔ انھیں، بلکہ اُن کے روز کے ملنے والوں کو بھی معلوم تھا کہ فلاں چیز کہاں پر رکھی ملیگی۔ اندھیرے میں بھی ہاتھ بڑھا کے اٹھا لیجیے۔

یہی حال ان کے وعدوں کا تھا۔ صرف ایک واقعے کا بیان کافی ہوگا۔

فروری یا مارچ ۱۹۵۲ء کا ذکر ہے۔ انھیں انجمن ترقی اُردو کے ایک جلسے میں شمولیت کے لیے علی گوڑھ جانا تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ جانے والا تھا، لیکن عین وقت پر ایک نہایت ضروری کام کے باعث مجھے اپنا پروگرام تبدیل کرنا پڑا۔ طے ہوا کہ رحمت قطبی صاحب ان کے ساتھ جائینگے۔ اتفاق یہ ہوا کہ جس دن وہ یہاں سے روانہ ہونے والے تھے، یہ ہولی کا دن تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہولی میں کیسا اودھم ہوتا ہے، اور کون سی بدتمیزی ہے، جو اس دن نہیں کی جاتی۔ انھیں تو علی پور روڈ سے ریل کے اسٹیشن تک پہنچنا تھا۔ قطبی صاحب نے کہا بھی کہ قبلہ، انجمن کے جلسے میں ابھی دو دن باقی ہیں، سفر ملتوی کر دیجیے، آج نہیں تو کل چلے جائینگے۔ لیکن توبہ صاحب، وہ بھلا ماننے والے تھے۔ فرمایا: میاں، کیا کہتے ہو! ہولی ہے، تو کیا ہوا؟ جب جانے کا فیصلہ ہو چکا، تو اب یہ تبدیل کیسے ہو سکتا ہے۔ جاؤ، جا کے رکشا لے آؤ۔ قطبی غریب تعمیلِ حکم میں رکشا لے آئے۔ آخر وہی ہوا، جس کا اندیشہ تھا۔ لدے پھندے مشکل سے بڑے دروازے سے نکل کے سڑک پر آئے ہونگے کہ کچھ لونڈوں نے انھیں تاڑا اور چاروں طرف سے گھیر کر رنگ اور پانی کی بوچھار کر دی۔ قصّہ کوتاہ، کشمیری دروازے

تک پہنچتے پہنچتے پانی سے شرابور ہو گئے۔ جاڑے کا زمانہ اور بڑھاپا اور گیلے کپڑے۔ مگر صاحب آفرین ہے ان پر، ان کے ماتھے پر بل تک نہیں آیا، نہ سفر کا ارادہ متزلزل ہوا۔ اسی سکون اور اطمینان سے، جس سے رکشا لانے کا حکم دیا تھا، ٹکٹ خرید گئے ریل کے ڈبے میں بیٹھے اور کپڑے بدل لیے۔ اس عزم اور ارادے کے لوگ زندگی کے کسی میدان میں بھی ہیٹے نہیں رہ سکتے۔ وہ حالات کے ماتحت نہیں ہوا کرتے، بلکہ حالات خود ان کے اشارے پر بدل جایا کرتے ہیں۔ عزم اور ارادے کی استواری اصلِ ایمان ہے اور

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

وہ جہاں بھی رہے ان کا درِ فیض ہر ایک کے لیے کھلا رہا۔ شاگرد کلام پر اصلاح لینے کو آتے۔ کوئی طالب علم مقالہ یا کتاب لکھنا چاہتا، تو اس کے لیے مسالہ جمع کرنے کے لیے مشورہ کرنے کو آجاتا۔ کسی کو روزمرّے یا محاورے میں شبہ ہوا، تو وہ اس کی تحقیق کے لیے رجوع کرتا۔ مصنّف اور شاعر حضرات اپنی تصنیفات پر مقدمے اور دیباچے اور تبصرے لکھوا کر لے جاتے۔ غرض کہ کوئی اس دروازے سے محروم اور خالی ہاتھ نہ جاتا۔ کہاں پیدا ہوں گے ایسے لوگ اب، جن کا وجود سر تا سر خیر اور صدقۂ جاریہ تھا۔ یہ علم و فضل، یہ انکسار و تواضع، یہ محبت و نوازش! خواب و خیال ہو گئیں وہ باتیں۔

وے صورتیں، الٰہی! کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

میرزا یگانہ چنگیزی

میں نے مارچ ۱۹۲۶ء میں گورنمنٹ انٹر کالج، گجرات سے انٹر کا امتحان دیا۔ چونکہ اس کے بعد بی اے میں داخلے کے لیے لاہور جانے کا ارادہ تھا، میں نے سوچا کہ جب تک نتیجے کا اعلان نہیں ہوتا، کیوں نہ لاہور کا ایک چکر لگا یا جائے! چنانچہ میں ایک ہم جماعت دوست کی معیت میں لاہور پہنچا۔ میں ایک مرتبہ اس سے پہلے ۱۹۱۷ء میں جب کہ میری عمر دس گیارہ برس کی تھی، ایک تقریب میں شمولیت کی خاطر لاہور آیا تھا؛ لیکن ایک تو وہ کم عمری کا زمانہ تھا، اور اب اس پر بھی بہت دن گزر چکے تھے، اس لیے میں صحیح معنوں میں اس ۱۹۲۶ء کے سفر ہی کو لاہور سے اپنا سابقہ خیال کرتا ہوں۔

یہاں لاہور میں میرے عزیز دوست احمد حسن پہلے سے موجود تھے۔ ہم دونوں نے ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۴ء وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول، وزیر آباد میں یکجا تعلیم پائی تھی۔ وہ روہتاس (ضلع جہلم) سے ورنیکلر مڈل کر کے آئے تھے اور میں اپنے وطن پھالیہ (ضلع گجرات) سے۔ دو سال جونیر اور سینیر اسپشل کے اور دو نویں اور دسویں درجے کے۔ یہ چار برس ہم ایک ساتھ رہے۔ تعلیم کی یکسانیت کے باعث ہمارے پسند اور ناپسند کے بیشتر موضوع ایک سے تھے۔ پسند میں منجملہ اور باتوں کے اردو اور فارسی کا ذوق بھی تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم گھنٹوں سوائے اردو ناول یا مختلف اساتذہ کے دیوان پڑھنے کے اور

کچھ نہیں کرتے تھے۔ اور نواں اور دسواں درجہ میں بھی (جہاں ہم دونوں ایک ہی بنچ پر ساتھ ساتھ بیٹھتے تھے) یہی شغل رہتا تھا۔ اس شوق نے ہمیں ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا، اور ہم سارا وقت اکٹھا گزارتے تھے۔

۱۹۲۴ء کے اوائل میں ہم نے دسویں درجے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وہ اپنے حالات کی مجبوری سے آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکے، لاہور چلے آئے اور ملازمت اختیار کر لی۔ میں نے گجرات کالج میں داخلہ لے لیا، جہاں سے اب ۱۹۲۶ء میں انٹر کا امتحان دیا تھا۔ ان ایام میں وہ مشہور انگریزی روزنامے "مسلم آؤٹ لک" میں ملازم تھے اور اس کے دفتر سے قریب ہی محلہ چابکسواراں میں رہتے تھے۔ ہم یہاں آئے، تو سیدھے ان کے کمرے پر پہنچے۔

ہمارے یہاں آنے کے دوسرے یا تیسرے دن اتوار تھا۔ احمد حسن نے کہا: چلو، مشاعرے چلیں۔ یہ مشاعرہ موری دروازہ کے باہر ایس، پی، ایس کے ہال میں ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں یہاں دو ادبی محاذ تھے۔ ایک، "انجمنِ اربابِ علم و ادب" کا ــ اس کے سرخیل مولانا تاجور نجیب آبادی مرحوم تھے۔ وہ مقامی دیال سنگھ کالج میں اردو اور فارسی اور عربی کے شعبے کے صدر تھے۔ اور دوسرا "بزمِ ادب، پنجاب" کا ــــ اس کے کرتا دھرتا نیازمندانِ لاہور یعنی سالک، تاثیر، پطرس وغیرہ تھے۔ تاجور عمر میں سب سے بڑے تھے۔ ان کی دنیوی سوجھ بوجھ اور انتظامی قابلیت بہت اچھی تھی۔ ۱۹۲۵ء میں انھوں نے لاہور کے مشہور ناشرِ کتب عطر چند کپور کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ لگا کے ایک ادارہ "اردو مرکز" کے نام سے قائم کریں۔ مقصد یہ تھا کہ مستند مصنفین سے اردو کتابوں کا ایک سلسلہ اور انتخاب تیار کرایا جائے، جسے صوبے کے مدارس میں نصاب کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ پنجاب کے محکمۂ تعلیم کے بااثر حلقے بھی غالباً اس منصوبے کی پشت پر تھے کیونکہ ظاہر ہے، اگر کتابیں شائع

ہونے کے بعد مدارس کے لیے منظور ہی نہ ہوں، تو یہ پوری اسکیم بیکار تھی۔ بعد کو ادارہ دو مرکز سے یہ منتخبات ۳۶ جلدوں میں شائع ہوئے تھے۔

تاجور خود اس ادارے کے مہتمم بنے اور انھوں نے اس میں کام کرنے کے لیے متعدد مقامی حضرات کے علاوہ باہر کے بعض مشاہیر کو بھی لاہور میں جمع کر لیا۔ ان باہر سے آنے والوں میں اصغر گونڈوی، میرزا یاس عظیم آبادی ثم یگانہ لکھنوی (جو ابھی چنگیزی نہیں بنے تھے) جگر مرادآبادی، سیماب اکبرآبادی، مہر محمد خان شہاب مالیرکوٹلوی اور بعض اور اصحاب بھی تھے۔ ماشاءاللہ ان میں کثرت شعرا حضرات کی تھی۔

دونوں پارٹیاں اپنے ہفتہ واری مشاعرے کرتی تھیں۔ عام لوگوں کو ان پڑھے لکھے جنتوں کی ذاتی مخالفتوں اور رنجشوں سے کیا سروکار! وہ بے جھجک دونوں کے مشاعرو میں خاصی تعداد میں آتے۔ ایک طرف ملک کے مشاہیر کا گروہ تھا، تو دوسری طرف پنجاب کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا۔ یہی زمانہ ہے، جب ابوالاثر حفیظ جالندھری منصۂ شہود پر آئے، یہ دوسری پارٹی کے گل سرسبد تھے۔

تو خیر، جس مشاعرے میں ہم لوگ اس اتوار کے دن گئے، یہ تاجور پارٹی یعنی انجمن ارباب علم وادب کا مشاعرہ تھا۔ یہیں میرزا یاس یگانہ کو پہلی مرتبہ دیکھا اور سنا۔ مشاعرے کی صدارت سر شیخ عبدالقادر مرحوم نے کی تھی۔ انھوں نے میرزا سے اپنا کلام سنانے کو کہا، تو وہ منبر پر تشریف لائے۔ لگ بھگ ۴۵ برس کا سن، متوسط قد، سانولا رنگ تیکھا ناک نقشہ، بڑی بڑی ذہین اور چمکدار سیاہ آنکھیں، چشمہ لگائے ہوئے، یہ بڑی گھنی مونچھیں جنھیں بھرپور تاؤ دے رکھا تھا، سر پر اونچی دیوار کی سیاہ کپڑے کی ٹوپی اور گلے میں معمولی سپید کپڑے کی شیروانی تھی، جس کی بائیں طرف کی جیب کے باہر گھڑی کی زنجیر دکھائی دے رہی تھی، نیچے سپید لٹھے کا پاجامہ، پیروں میں سیاہ رنگ کا پمپ شو اور ہاتھ میں ہلکی سی بید کی چھڑی۔ یہ تھے میرزا یاس عظیم آبادی۔

غائبانہ طور پر میں انھیں بہت دن سے جانتا تھا، میں نے مخزن (دورِ اول) میں، اور بعض دوسرے رسائل میں بھی، اُن کا کلام پڑھا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ غالب کے مخالف ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے میں بھی، خود انھیں اچھا شاعر قبول کر لینے کے باوجود، مجھے ان کی غالب دشمنی پسند نہیں تھی۔ اس لیے غیر شعوری طور پر میں انھیں بھی کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔

قصّہ کوتاہ، وہ کلام پڑھنے کو منبر پہ آئے۔ انھوں نے ایک پرانی غزل سُنائی۔ مطلع تھا:

چلے چلو، جہاں لے جائے ولولہ دل کا دلیلِ راہِ محبّت ہے فیصلہ دل کا[۵]

اور مقطع تھا:

پیالہ خالی اٹھا کر، لگا لیا منہ سے کہ یاس! کچھ تو نکل جائے حوصلہ دل کا

سات آٹھ شعر سے زیادہ نہیں ہونگے۔ انھوں نے پوری غزل ترنّم سے کچھ ایسے دلکش انداز سے پڑھی کہ کیا عرض کروں! ان کے ہاتھ میں کوئی کاغذ نہیں تھا، وہ حافظے سے پڑھ رہے تھے۔ پڑھتے میں وہ کبھی کبھی سیدھا ہاتھ یوں اُٹھاتے، جیسے دنیا کی نافہمی سے نالاں اور شاکی ہوں۔ وہ نیم وا آنکھوں سے حاضرین پر کچھ ایسی کھوئی کھوئی نگاہ ڈالتے، جیسے اس بھری مجلس میں اپنے آپ کو اکیلا اور غریبِ شہر سمجھتے ہوں، اور کسی سخندان کی تلاش میں ہوں، تاکہ اس کے سامنے سخنہائے گفتنی کہہ سکیں۔ یہ واقع ہے کہ میں ان کی غزل سے بہت متاثر ہوا تھا۔ حاضرین نے

---

۵ یہ زمین غالباً آفتاب الدولہ خواجہ ارشد علی خان قلق لکھنوی کی ہے۔ ان کی غزل کا مطلع ہے:

ادا سے دیکھ لو، جاتا رہے گلا دل کا
بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

لکھنؤ کے اور کئی شاعروں کی بھی اس زمین میں غزلیں موجود ہیں۔

داد دینے میں بخل نہیں کیا۔ لیکن اس کے باوجود، ان کے لب و لہجہ اور ان کے انداز سے، میں نے کچھ ایسا محسوس کیا کہ وہ اس سے مطمئن نہیں اور اپنے آپ کو اس سے زیادہ کا مستحق خیال کرتے ہیں۔

اب عمر کا تقاضا خیال کیجیے، یا کلام کی بلندی، یا ان کے پڑھنے کے انداز کا اثر۔ اس کے بعد میری تمام پوشیدہ اور غیر شعوری مخالفت ہوا ہو گئی اور اس کی جگہ ہمدردی نے لے لی۔ میں نے اس کے بعد ان کا کلام ان کے منہ سے ۔۔۔۔ خلوت میں اور جلوت میں بیسیوں مرتبہ سنا، لیکن حال آں کہ اس واقعے پر آج ۴۶۔ ۴۷ برس گزر چکے ہیں، اس پہلی مرتبہ کے نقوش اتنے گہرے ہیں کہ ان کی ایک ایک ادا اور ایک ایک اُنوٹ مجھے یاد آ رہی ہے، اور یوں محسوس ہوتا ہے، گویا ان کی آواز اب بھی فضا میں گونج رہی ہے۔

جب ہم مشاعرے سے نکلے، تو میں نے احمد حسن سے کہا کہ کسی سے پوچھیے، کہ یہ رہتے کہاں ہیں؟ ممکن ہوا، تو واپس جانے سے پہلے ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ اتنے میں ہال کے پشت والے دروازے سے شاعر حضرات بھی برآمد ہونے لگے تھے۔ احمد حسن نے آگے بڑھ کے خود میرزا صاحب سے ان کے مسکن کا پتا پوچھا اور اگلے دن شام ملنے کا وقت طے کر لیا۔

میرزا صاحب جنگڑ محلے میں رہتے تھے۔ یہاں انھوں نے پیسہ اخبار گلی میں ایک کمرہ کرایے پر لے رکھا تھا۔ اس زمانے میں میرزا فہیم بیگ چغتائی بھی ان کے کہیں قریب ہی مقیم تھے۔ جب ہم اگلے دن شام کو وہاں پہنچے تو ان دونوں کے علاوہ جناب حفیظ الرحمٰن سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ لاہور ہی کے رہنے والے تھے، اور غالباً منشی محبوب عالم بانیٔ مدیر پیسہ اخبار کے عزیزوں میں تھے۔ وہ اپنے نام کی مناسبت سے ان دنوں "حفیظ العلوم" کے نام سے ایک اردو انسائیکلوپیڈیا مرتب کر رہے تھے۔ انھوں نے ردیف وار مختلف پٹھوں میں متعدد مضامین سے متعلق اپنا جمع کردہ مواد دکھایا تھا۔ یہ ابھی خاصی

مقدار میں تھا۔ لیکن انسائیکلوپیڈیا کا کام کسی ایک آدمی کے بس کی بات تو ہے نہیں؛ نہ ہر شخص دنیا جہان کے سارے علوم کا ماہر ہو سکتا ہے، نہ کسی کے پاس اتنا وقت ہی ہے کہ وہ اور سب کام کاج چھوڑ کر بس اسی کا ہو رہے۔ اس لیے میں نے ان سے کہا کہ آپ اکیلے اتنا بڑا کام مکمل نہیں کر سکیں گے، ممکن ہو، تو کچھ اور اصحاب کا تعاون حاصل کیجیے، بلکہ حکومت اور محکمۂ تعلیم کو بھی توجہ دلائیے، ورنہ آپ کی یہ ساری محنت رائگاں جائیگی۔

خدا معلوم ان کے جمع کیے ہوئے ذخیرے کا کیا حشر ہوا!

میرزا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بہت بےتکلفی اور تپاک سے ملے۔ میرا اور میرے ساتھیوں کا حال پوچھا۔ اپنا بتایا کہ "اردو مرکز" میں کام کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔ ان کا حال اور ماحول دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ یا تو ان کا مشاہرہ بہت کم ہے، یا پھر ان کی نجی ذمہ داریاں اتنی ہیں کہ وہ اپنی ذات پر زیادہ خرچ کرنے سے معذور ہیں۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ دونوں باتیں صحیح تھیں۔

گھنٹہ آدھ ٹھہرنے کے بعد ہم نے اجازت چاہی اور واپس چلے آئے۔ فرمایا: اگر اور کچھ دن یہاں قیام ہو، تو بے تامّل آیئے، میں شام بالعموم گھر ہی پر رہتا ہوں، اور کہیں جاتا آتا نہیں۔

دو تین دن بعد پھر ایک شام حاضر ہوا۔ فہیم گوالیاری، ان کے صبح و شام کے جلیس، اس دن بھی موجود تھے۔ دو تین اور مقامی دوست بھی بیٹھے تھے۔ بات اردو زبان اور ان کے کلام سے متعلق چھڑ گئی۔ فہیم کی اردو محاورے اور روزمرے پر اچھی نظر تھی۔ میں نے میرزا صاحب سے کہا: کسی نے آپ کے شعر

وحشت آبادِ جہاں کی دلفریبی دیکھیے
سیکڑوں آزاد پابندِ سلاسل ہو گئے!

پر اعتراض کیا ہے کہ جمع فاعل (سیکڑوں) کے ساتھ فعلِ واحد (ہو گیا) ٹھیک نہیں ہے۔ میرزا صاحب نے تو کوئی جواب نہیں دیا، سنی اَن سنی کر دی۔ لیکن فہیم چمک کے بول اٹھے: اس سے معترض نے اپنی اردو روزمرے سے ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے، بول چال میں عام طور پر اسی طرح سے بولتے ہیں۔ مثلاً وہاں میدان میں سیکڑوں آدمی جمع ہو گیا۔ آتش کا شعر سند میں پیش کیا جا سکتا ہے:

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

اتنے میں حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ آپ کا مطلع ہے:

کہاں تلک دلِ غمناک پر وہ وار رہے
زبانِ حال پہ جب کچھ نہ اختیار رہے

کیا تلک اب متروک نہیں ہے؟ اب کے مرزا صاحب نے جواب دیا۔ کہنے لگے کہ تلک کو کس نے متروک قرار دیا، اور یہ کہاں لکھا ہے؟ صرف یہی نہیں، میں پوچھتا ہوں، کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ جس لفظ کو چاہے، متروک قرار دے دے؟ حضرت، حال آنکہ ہم اہلِ زبان ہیں، ہم بھی یہ نہیں کر سکتے کہ کسی لفظ کو زبان سے خارج کر دیں۔ ہاں، اگر رفتہ رفتہ کسی لفظ کا استعمال کم ہو جائے، یا بالکل نہ رہے تو ہم اعتراض نہیں کرینگے۔ زبان لوگوں کے لیے ہو کہ وہ اس سے اپنا مافی الضمیر ایک دوسرے سے کہہ سکیں۔ اگر وہ کسی لفظ کو کسی وجہ سے مفید مطلب نہیں پاتے، تو اُن کا حق ہے کہ اس کی جگہ کسی اور لفظ کو بازار کا سکہ بنا لیں۔ لیکن بڑے سے بڑے اہلِ زبان اور استاد کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ تحکّم سے کوئی لفظ زبان سے خارج کر دے۔ پس اگر اس شعر میں "تلک" کا استعمال اپنے لغوی معنوں میں درست ہے، تو مجھے پروا نہیں کہ کوئی صاحب اسے متروک خیال کرتے ہیں۔

دو مہینے بعد ہمارے امتحان کا نتیجہ نکل آیا اور اب میں مستقل طور پر لاہور آ گیا۔ یہاں میں نے ڈی، اے، وی کالج میں بی اے کے درجے میں داخلہ لیا اور کالج کے ہوسٹل میں رہنے لگا۔ میرزا صاحب سے تعارف تو ہو ہی چکا تھا! جونہی یہاں جم گیا، میں نے اولیں فرصت میں ان سے رابطہ قائم کر لیا۔ رفتہ رفتہ ہمارے تعلقات بہت گہرے ہو گئے۔ چونکہ ان کا مسکن چنگڑ محلہ میرے ہوسٹل سے دور نہیں تھا، اس لیے آسانی سے ہر دوسرے تیسرے ملاقات ہونے لگی۔

جب ہم بےتکلف ہو گئے، تو لا محالہ سب سے پہلے غالب پر بحث ہوئی۔ میں نے ایک دن ذرا شکوے کے انداز میں ان سے پوچھا کہ آخر آپ غالب کے اتنے مخالف کیوں ہیں؟

فرمایا:

یہ کس نے آپ کو بہکا دیا کہ میں غالب کا مخالف ہوں! وہ یقیناً بہت بڑا شاعر ہے۔ صاحب! غالب کی صحیح قدر و منزلت مجھ سے زیادہ کون سمجھیگا۔ مجھے غصہ اس بات پر آتا ہے کہ لوگ اس کے جائز مقام سے زیادہ اسے دینا چاہتے ہیں۔ اور پھر ستم یہ ہے کہ یہ بھی وہ لوگ نہیں، جو اس کا صحیح مقام سمجھتے ہوں، بلکہ وہ جو تقلیداً اسے بڑا سمجھتے ہیں۔ یعنی اس لیے نہیں کہ انھوں نے خود سوچ سمجھ کے، اور اس کے کلام کی خوبیوں کا اندازہ کر کے، یہ فیصلہ کیا ہو، بلکہ اس لیے کہ زید یا بکر ایسا کہہ رہے ہیں۔ ایسے دکانی مذہب لوگوں کی دوران کی رائے کیا وقعت! اور اگر یہ لوگ غالب کو بڑا کہیں، تو اس سے ان کی عزت میں کیا اضافہ ہو جائیگا! میں اسے تحسینِ ناشناس سے زیادہ نہیں سمجھتا۔

میں نے جب دیکھا کہ لکھنؤ کے بعض چھٹ بھیئے محض بھیڑ چال میں غالب کی تعریف کر رہے ہیں، تو اس پر مجھے دو وجہ سے غصہ آیا۔ ایک تو اس لیے، کہ وہ غالب کی بیجا تعریف کر کے دوسرے واقعی قابلِ قدر شاعروں کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ دوسرے اس لیے کہ،

اس سے مطلب سعدی دیگر تھا۔ وہ اس پردے میں اپنی خامیاں چھپانا اور اپنی تعریف کرانا چاہتے تھے۔ میں نے دونوں پہلوؤں سے ان کی قلعی کھول کے رکھ دی۔

آتش بہت بڑا شاعر ہے، اتنا بڑا کہ آج تک لکھنؤ نے اتنا بڑا شاعر پیدا نہیں کیا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ پوری اردو شاعری میں، شاید میرؔ کو چھوڑ کر، اس کا جواب نہیں۔ میں نے غالب کا آتش سے مقابلہ کیا اور ثابت کر دیا کہ آتش کو ہر پہلو سے غالب پر فوقیت حاصل ہے۔ دوسرے میں نے ان اناڑیوں کے میرِ کارواں عزیز کی شاعری پر تنقید کر کے اس کے ڈھول کا پول کھول کے رکھ دیا۔ اس پر عزیز اور اس کے چیلے چانٹے بہت تلملائے اور انھوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، لیکن کسی سے میرے اعتراض اٹھائے نہ اٹھ سکے۔

تو صاحب! میں غالب کے خلاف نہیں تھا، اور نہ ہوں۔ لیکن میں اس کی جائز جگہ سے زیادہ اس کے حوالے کر دینے پر تیار نہیں۔ اب ان سورماؤں سے اور کچھ تو ہو نہ سکا، کھسیانی بلی کھمبا نوچے، سازش کر کے چڑھ آئے۔ عوام کو میرے خلاف بھڑکایا کہ میں غالب کی ہتک کر رہا ہوں۔ بیرونی کہ کر میرا بائیکاٹ کیا۔ میری بے عزتی کی گئی۔ یہاں تک کہ میرے بیوی بچوں کا گھر سے نکلنا محال ہو گیا۔ غرض بہت فضیحتا ہوا۔ لیکن کیا اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ غالب واقعی آتش سے بڑا شاعر ہے؟ یا عزیز کی خرافات کسی توجہ کے قابل ہیں؟ میری یہ دونوں باتیں آج بھی جوں کی توں اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ اور اکھی کیا ہے! اور سو پچاس برس میں اردو زبان اور ادب کا مؤرخ جو فیصلہ کرنے والا ہے، اس کا بھی مجھے یقین ہے۔

انھوں نے غالب کی نسبت سے دو لفظ بھی وضع کیے تھے: ایک غلبانا مصدر۔ اگر کوئی شخص غالب سے غیر معمولی طور پر مرعوب ہو جائے، یا اس کی تعریف کرنے لگے،

تو فرماتے: لیجیے، فلاں صاحب بھی غلبا گئے، دوسرا غلبچی، وہ شخص، جو اٹھتے بیٹھتے غالب کا ڈھنڈورا پیٹے اور اس کی بڑھ بڑھ کر تعریف کرے یعنی غالب کا مؤید، مدّاح وغیرہ۔

اس پر مجھے ایک بات یاد آگئی:۔

میرزا یگانہ نے کہا تھا کہ میں نے عزیز کی شاعری پر تنقید کی۔ یہاں ان کا اشارہ اپنے مختصر رسالے "خرافاتِ عزیز" کی طرف تھا۔ بہت دن کی بات ہے، کوئی پندرہ سولہ برس کی، ایک دن میں جناب گوپی ناتھ امن کے ساتھ تھا۔ باتوں باتوں میں یگانہ اور عزیز کی اس چپقلش کا ذکر آگیا۔ جیسا کہ معلوم ہے، امن صاحب نے منشی بیج ناتھ فگار کے علاوہ عزیز سے بھی اپنے کلام پر اصلاح لی ہے۔

جس زمانے میں لکھنؤ کے شعرا نے یلغار کر کے یگانہ پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا، امن صاحب بھی وہیں لکھنؤ میں تھے اور ان واقعات میں ان کی حیثیت گویا عینی شاہد کی ہے۔ فرمانے لگے: "صاحب! عزیز میرے استاد تھے اور ہمارا فرض تھا کہ ہم ان کی حمایت اور یاس کی مخالفت کریں۔ لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ یاس صاحب کے اعتراضات کا جواب ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ ہمیں کچھ کرتے بن نہ آئی"۔

یہ امر واقع ہے کہ لکھنؤ کے شاعروں نے اس زمانے میں یاس سے جو سلوک کیا، اسی نے رفتہ رفتہ انھیں یگانہ بنا دیا۔ اس کا حال بھی انھیں کے لفظوں میں سنیے۔ ایک دن باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے پوچھا: آخر آپ کی لکھنؤ والوں سے بگڑی کیوں اور کیسے؟ کہنے لگے:

میں ۱۹۰۹ء میں اپنے علاج کے لیے لکھنؤ آیا۔ علاج سے جسم تو ٹھیک ہو گیا، لیکن اس کی جگہ ایک ذہنی روگ نے لے لی۔ اس زمانے میں لکھنؤ کی فضا شعر و شاعری سے معمور تھی۔ یہاں کی خاک کچھ ایسی دامنگیر ہوئی کہ عظیم آباد واپس جانے کو جی نہیں چاہتا تھا

حسنِ اتفاق سے کچھ مدت بعد یہیں ایک شریف گھرانے میں، حکیم میرزا محمد شفیع کی بیٹی سے میری شادی ہو گئی، لیجیے، پاؤں میں ایک اور بیڑی پڑ گئی۔ یہ ۱۹۱۳ء کی بات ہے۔ اس کے بعد میں وطن گیا اور بزرگوں سے جو تھوڑا بہت ورثے میں ملا تھا، اسے اونے پونے داموں پر ٹھکانے لگا، مستقل طور پر لکھنؤ چلا آیا۔ یہاں جو مشاعرے ہوتے تھے، میں ان میں برابر شریک ہوتا۔ اب اس میں میرا کیا قصور! یہ خدا کی دین ہے، میرا کلام پسند کیا جانے لگا۔ باہر کے مشاعروں میں بھی اکثر جانا پڑتا۔ میری یہ ہر دلعزیزی اور مقبولیت ان تھڑدلوں سے دیکھی نہ گئی۔ اسی زمانے میں، ان لوگوں کو مخاطب کر کے میں نے ایک فخریہ قطعہ کہا تھا۔ آپ بھی سنیے:

کون ہوں، کیا ہوں، مجھے بھی دیکھ لیں اہلِ نظر
کوچہ گردِ لکھنؤ، خاکِ عظیم آباد ہوں
مردِ جاہل ہوں، مگر جہلِ مرکب سے بری
شخص خود بیں ہوں، نہ میں خود ساختہ استاد ہوں
ہوں ادب پروردۂ بیتاب فخرِ روزگار
ناز اس پر ہے کہ خاکِ آستانِ شاد ہوں
خسرو رنجور و تمنا و مبارک کا غلام
خادم امداد ہوں، میں بندۂ آزاد ہوں
میرے محسن ہیں: نہال و شائق و شیدا اور راز
یاد ہیں مجھ کو تو سب، میں بھی کسی کو یاد ہوں؟
جان سے بڑھ کر سمجھتے ہیں مجھے، یاس اہلِ دل
آبروے لکھنؤ، خاکِ عظیم آباد ہوں

بعد کو میں نے شوخی سے داماد کے قافیے میں اس پر ایک شعر کا اضافہ کر دیا،

یگانہ چنگیزی

لکھنؤ کے فیض سے، ہیں دو دو سہرے میرے سر

اک تو استاد یگانہ، دوسرے داماد ہوں

یہ قطعہ میں نے علی الاعلان عظیم آباد کے ایک مشاعرے میں پڑھا، اور لکھنؤ واپس آ کر روزنامہ ہمدم، میں شائع کرا دیا۔ اب تو ان خودرو استادوں کے تلووں سے لگ گئی! یہ کون ہوتا ہے، اپنے آپ کو آبروے لکھنؤ کہنے والا! تخلص یاس سے یگانہ کرنے کی ابتدا بھی اسی سے ہوئی۔ یہ ۱۹۲۰ کی بات ہے۔

اب ان اصحاب نے جتھا بنالیا۔ ہر طرف سے میرے خلاف پروپگنڈا ہونے لگا جہاں کہیں سے مشاعرے کا دعوتنامہ آتا، یہ لوگ کہتے کہ اگر یاس کو بلایا جائیگا، تو ہم شرکت نہیں کرینگے۔ ایک مرتبہ پنڈت مدن موہن ناتھ رینہ نے الہ آباد سے ہم سب لوگوں کو مشاعرے کا دعوتنامہ بھیجا۔ صفی نے کہا کہ اگر یگانہ اس مشاعرے میں ہونگے تو ہم نہیں جائینگے۔ یہ خبر مجھ تک بھی پہنچ گئی۔ میں نے کہلا بھیجا کہ آپ پریشان نہ ہوں، میں نہیں جانے کا۔ اور رینہ صاحب کو لکھ دیا کہ آپ میرے دوست ہیں، مجھے آپ کا مشاعرہ خراب کرنا منظور نہیں ہے۔ اس لیے میں نہیں آؤنگا، آپ شوق سے ان حضرات سے مشاعرہ کیجیے۔ یہ اوچھی حرکتیں ان لوگوں نے اور بھی کئی جگہ کیں۔ لیکن کبھی کبھی انھیں منہ کی بھی کھانا پڑتی تھی۔ داعی حضرات ان کی دھمکی کی پروا نہ کرتے اور کہہ دیتے کہ یاس تو ضرور آئیگا۔ آپ چاہیں، آئیے، چاہے، نہ آئیے۔

۱۹۱۴ء میں میرا پہلا مجموعۂ کلام نشترِ یاس شائع ہوا۔ دنیا انصاف پسندوں سے خالی نہیں ہو گئی۔ اسی لکھنؤ کے بعض اصحاب نے اس پر تقریظیں لکھیں۔ یہ لوگ وہ تھے جنھیں معیار پارٹی بھی استاد تسلیم کرتی تھی۔ سید حامد علی خان بیرسٹر نے ایک بسوط دیباچہ لکھا۔ حضرت علی محمد عارف، سید محمد کاظم جاوید، قبلہ محمد جعفر اوج خلف دبیر اعلی اللہ مقامہ اور حضرت پیارے صاحب رشید نے تقریظیں لکھی تھیں۔ یہ نشترِ یاس

کے ساتھ چھپی ہوئی موجود ہیں۔ اب اور کچھ تو ہو نہ سکا، یہ حضرات ان بزرگوں کے خلاف ہو گئے کہ انھوں نے ایک "بیرونی" کی تعریف کر کے لکھنؤ والوں کی ناک کاٹ دی ہے۔

میں اس زمانے میں محلہ باغ قاضی میں رہتا تھا۔ یہیں میرے پڑوس میں سید بہادر حسین انجم بھی رہتے تھے، خاصے شعر کہہ لیتے تھے۔ میرے ان سے اچھے مراسم تھے۔ ان کی نوشتہ چند سطریں بھی نشتریاس کے شروع میں ہیں۔ جب معیار پارٹی نے ان اساتذہ کی مخالفت شروع کی، تو انجم سے نہ رہا گیا۔ انھوں نے ایک رباعی کہی، جس میں ان اساتذہ کی تائید کی تھی۔ رباعی تھی:

اس عہد میں ہیں پانچ شاہانِ سخن حقا کہ انھیں کے دم سے ہو شانِ سخن
جاوید و عروج و عارف و اوج و رشید یہ پنجتن پاک ہیں ایمانِ سخن

اس زمانے میں لکھنؤ سے ایک ہفتے وار "سیارہ" نکلتا تھا۔ انجم نے یہ رباعی اس میں چھپوا دی۔ بس پھر کیا تھا، ایک ہنگامہ بپا ہو گیا؛ خاص طور پر لفظ "پنجتن" پر بہت لے دے کی گئی۔ چونکہ یہ لفظ ایک خاص تعلق سے ہمارے عقائد سے وابستہ ہو گیا ہے، اس لیے اس کی آڑ میں غریب انجم پر بہت پھبتیاں کسی گئیں۔ دنیا کی بھیڑ چال تو آپ جانتے ہی ہیں، عوام کا کیا قصور! معیار پارٹی کا اس زمانے میں پڑھے لکھے حلقوں میں بہت چرچا تھا، اور یہ پارٹی چاہتی ہی یہ تھی کہ کسی طرح سے عوام کو بھڑکا کر مجھے دق کیا جائے۔ چنانچہ ان حضرات نے اس لفظ پر گرفت کی، تو جہلا نے یقین کر لیا کہ یقیناً انجم نے کوئی بیدینی کی بات کی ہے۔

اس پر میں نے پوچھا کہ آخر عوام کو پتا کیسے چلا؟ کیا کوئی مضمون شائع کیا گیا تھا؟

فرمایا:

نہیں صاحب! صفی کے چھوٹے بھائی ظریف کا نام تو آپ نے سنا ہوگا، مہدی حسین مقبول۔

یگانہ چنگیزی

اس مسخرے نے "سبع سیّارہ" کے عنوان سے سات رباعیاں کہیں۔ سنیئے:

(۱)

زیبا ہے، کہو گر انھیں شاہانِ سخن — یا فارس و یکہ تازِ میدانِ سخن
گر پنجتنِ پاک سے دوگے تشبیہ — انجم! تمھیں سب کہینگے شیطانِ سخن

(۲)

جب مدح سرائی کی لیاقت نہ رہی — پیری میں عبث نظم کی تکلیف سہی
زیبا نہیں اس طرح کی پھبتی، انجم! — پنجتنِ پاک کی بھی ایک کہی

(۳)

تعریف کے دائرے میں یوں حد سے بڑھے — کیا خوب! نئے پنجتنِ پاک گڑھے
سیّارے میں دیکھ کر رباعی ایسی — انجم پہ نہ کیوں ہر ایک لاحول پڑھے

(۴)

گو مومنو! شاعرہ ہے بڑھیا انجم — معلوم نہیں بکتی ہے کیا کیا انجم
جاوید و عروج و عارف و اوج و رشید — ان پنجتنِ پاک کی فضّا انجم

(۵)

مدّاح ہیں پنجتن کے یہ مطلق پانچوں — شیعہ ہیں علی کے سب یہ برحق پانچوں
خود پنجتنِ پاک بنیں اور خوش ہوں — انجم کی طرح نہیں ہیں احمق پانچوں

(۶)

مذہب ہے تمھارا کیا؟ بتاؤ، انجم! — کچھ اپنے عقائد تو سناؤ، انجم!
تصنیف کیے پنجتنِ پاک، تو خوب — اب بارہ امام بھی بناؤ، انجم!

(۷)

ہوا ایسا خوشامدی تو کیا چارہ ہے — انجم میں ہوا بھری ہے، غبّارہ ہے
آتی ہے یہ نقارۂ گردوں سے صدا — "تو مرثیہ گو نہیں بھٹیارا ہے"

ظریف اس سے پہلے شفق لکھنوی کے مشاعرے میں خود یگانہ کی موجودگی میں ان کی ہجو پڑھ چکے تھے۔ حاضرین میں لکھنؤ کے جملہ اساتذہ موجود تھے! کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ اسے ٹوکے، سب کے سب چپ سادھے سنتے رہے۔ خود یگانہ نے بھی ان مغلظات کا نوٹس نہیں لیا۔ فرماتے تھے: میرا کیا بگڑا! اس احمق نے خود ہی اپنے آپ کو ذلیل ثابت کیا۔ ہاں ذلیل وہی تو ہے، جو ذلیل کام کرتا ہے؛ انسان کسی کے کہے سے ذلیل نہیں ہو جاتا۔

۳

ایک دن اصغر گونڈوی مرحوم کا ذکر آگیا۔ لیکن پہلے ایک واقعہ سنیے!

اصغر مرحوم کا پہلا دیوان "نشاطِ روح" غالباً ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا غلغلہ سنا، تو میں نے بھی اسے دیکھا۔ میری عمر اس وقت یہی ۱۶۔۱۷ سال کی تھی۔ اب جو شعر سمجھ میں آگئے، وہ تو بہت پسند آئے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کئی شعر سمجھ میں نہیں آئے اور مجھے کھینچ تان کر ان کے معنی سمجھنا پڑے۔ میری نظر میں یہ کلام کا نقص تھا اور ہے کہ شعر خود بخود سمجھ میں نہ آئے۔ غرض اس سے طبیعت کچھ منغض ضرور ہوئی۔ لیکن مجموعے کے شروع میں دو صاحب علم حضرات کے لمبے لمبے مقدمے شامل تھے، اور انھوں نے کلام اور صاحبِ کلام کی بہت تعریف کی تھی۔ لہٰذا میں نے یہی خیال کیا کہ اگر کچھ شعر میری سمجھ میں نہیں آئے، تو یہ میری کم علمی یا کوتاہ فہمی کے باعث ہے۔ لیکن یہ بات تو اپنی جگہ رہی، ان دونوں مقدموں کے پڑھنے سے مجھ پر خود اصغر کے ذاتی کردار کی بلندی کا بہت گہرا اثر قائم ہوا۔

اس کے کچھ دن بعد "نیرنگِ خیال" (لاہور) میں "نشاطِ روح" سے متعلق ایک مضمون شائع ہوا۔ مضمون پر کسی کا نام نہیں تھا۔ ٹھیک سے یاد نہیں، غالباً "ادب آموز" یا کسی اسی طرح کے نام سے چھپا تھا۔ بہر حال مضمون مخالفانہ تھا۔ اس حد تک

تو اعتراض کی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی چیز مجھے پسند آئے، تو وہ آپ کی نظر میں بھی اچھی ٹھہرے۔ اختلافِ رائے بشرطیکہ وہ نیک نیتی پر مبنی ہو، بسا اوقات اصلاح کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے اور اس لحاظ سے مستحسن ہے۔ لیکن اس مضمون کا لہجہ ٹھیک نہیں تھا۔ خاص طور پر اس میں جو عامیانہ محاورے استعمال کیے گئے تھے، ان سے مجھے بہت کوفت ہوئی۔ چنانچہ جب میں لاہور آیا (جس کا میں نے شروع میں ذکر کیا ہے) تو میں "نیرنگ خیال" کے دفتر گیا۔ ایڈیٹر حکیم محمد یوسف حسن صاحب تو موجود نہیں تھے۔ البتہ جناب محمد دین تاثیر سے ملاقات ہوئی۔ وہ اس زمانے میں رسالے کے ادارۂ تحریر میں شامل تھے، بلکہ بعد کو کسی نے مجھے بتایا کہ کام سارا تاثیر ہی کرتے ہیں، حکیم صاحب تو صرف انتظامی معاملات اور اخراجات کے لیے روپیہ مہیا کرنے کے ذمے دار ہیں کیونکہ پرچے کے مالک وہی ہیں۔ غرض میں نے تاثیر سے شکایت کی کہ اس مضمون کی زبان بہت عامیانہ اور قابلِ اعتراض ہے، آپ کو اسے شائع نہیں کرنا چاہیے تھا۔ حقیقت میں مجھے زیادہ اندیشہ اس بات کا تھا کہ اصغر یوپی کے رہنے والے ہیں، اور مضمون پنجاب کے پرچے میں چھپا ہے؛ لوگ اسے صوبائی تعصب پر محمول کرینگے۔ تاثیر نے میرے اعتراض پر کہا کہ مضمون تنقیدی ہے۔ اگر کوئی شخص اس کا جواب لکھنا چاہے، تو ہم اسے "نیرنگ خیال" میں شائع کرنے کو تیار ہیں وغیرہ۔ انھوں نے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی بتایا کہ مضمون نگار بھی یوپی کے ایک صاحب ہیں، جنھوں نے مصلحتاً اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ میں نے پھر بھی یہی کہا کہ کسے باشد، یہ مضمون آپ کو نہیں چھاپنا چاہیے تھا۔

اب جو یگانہ سے اصغر کا ذکر آیا تو بولے، صاحب! اصغر صوفی ہونگے، ولی اللہ ہونگے، صاحبِ الہام ہونگے؛ مجھے ان کی بزرگی تسلیم کر لینے میں قطعاً کوئی عذر نہیں ہے۔

وہ صورتیں الٰہی

وہ اور سب کچھ ہونگے، لیکن شاعر یقیناً نہیں۔ ذرا ان کا کلام دیکھیے۔ کیا یہ شعر ہیں؟ کسی تصوف یا اخلاق کی کتاب کا شعر میں ترجمہ کر دینے سے کوئی آدمی شاعر نہیں ہو جاتا۔ یوں ہوتا، تو مولانا روم فارسی زبان کے سب سے بڑے شاعر گنے جاتے!

پھر فرمایا:

بات یہ ہے کہ سیاست کی طرح، بعض لوگوں نے ادب میں بھی اپنے اپنے جتھے اور گروہ بنا رکھے ہیں۔ جب کوئی اپنے فریق کا آدمی کتاب چھاپتا ہے، تو پہلے تو اس پر لمبے لمبے مقدمے لکھینگے، پھر اس پر تعریفی تبصرے اور تنقیدیں چھپوائینگے۔ اس سے جہلا کو تو مرعوب ہونا ہی چاہیے، خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی دھوکا کھا جاتے ہیں۔ ہر فرعونے را موسیٰ۔ وقت آنے پر کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ کھڑا ہو جاتا ہے اور سارا طلسم چاک کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس وقت یہ مقدمے اور تقریظیں اور تبصرے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ بتائیے، چند روزہ واہ واہ سے حاصل؟

اس پر مجھے وہ "نیرنگ خیال" والا مضمون یاد آ گیا۔ میں نے کہا کہ ایک مخالفانہ مضمون "نیرنگ خیال" میں چھپا تھا، تو کہنے لگے: "وہ میں نے لکھا تھا"۔ اس پر مجھے کچھ تعجب ہوا۔ حالانکہ تاثیر نے کہا تھا کہ مضمون ایک یو پی کے ادیب کا لکھا ہوا ہے؛ لیکن میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی؛ اور یقیناً اس کا تو مجھے گمان بھی نہیں ہوا تھا کہ اسے یگانہ نے لکھا ہوگا۔

جب انھوں نے خود اعتراف کیا، تو میں نے اعتراض کیا کہ صاحب! اس میں جو زبان استعمال کی گئی ہے، وہ کسی سنجیدہ تنقید کے شایان شان نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ تنقید سے زیادہ اس کا مقصد مقدمہ نگاروں اور خود شاعر کا مضحکہ اڑانا تھا۔ کہنے لگے:

آپ کا خیال بالکل درست ہے، جزاک اللہ، آپ نے واقعی میرے مقصد کی صحیح

ترجمانی کی ہے۔ چونکہ میں اصغر کو شاعر مانتا ہی نہیں، نہ ان کی فکر شاعرانہ ہے، نہ زبان شاعرانہ، اس لیے میں انھیں شعر و سخن کی کسوٹی پر کسنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مضمون میں میرا لہجہ شروع سے آخر تک غیر سنجیدہ رہا۔

میں الٰہیات اور تصوّف و روحانیت کے مضامین کو نظم میں لکھنے کا مخالف نہیں ہوں ـــــ خود میرے یہاں ان کی کمی نہیں ہے۔ مجھے اصرار اس پر ہے کہ نظم کی زبان، اردو کے محاورے اور اردو غزل کی روایت اور اسلوب کے مطابق ہونا چاہیے۔ آخر معرفت کا وہ کونسا نکتہ ہے، جو غزل کی مجازی زبان میں ادا نہیں ہو سکتا! میرا کلام دیکھیے، کیسے کیسے اُدق مضامین، کتنی شگفتہ زبان میں، فصاحت اور بلاغت کی تمام رعایتوں کے ساتھ ادا ہوئے ہیں۔ جہاں آپ نے مضامینِ حقیقت کو تصوّف کی زبان میں لکھا، غزل غائب ہو گئی۔ یہ قدرتِ بیان نہیں، عجز کی دلیل ہے۔

غرض میں اصغر کی شاعری کا اس باعث قائل نہیں ہوں کہ ان غریب کو غزل کی زبان پر قدرت حاصل نہیں ہے۔ یوں مجھے ان کے اچھا اور شریف آدمی ہونے میں کلام نہیں۔ اردو مرکز میں مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے انھیں ہمیشہ ہمدرد، بااخلاق اور منکسر مزاج پایا ہے۔ لیکن اس وقت گفتگو ان کی شاعری کے بارے میں ہو رہی ہے۔

۴

۱۹۲۶ء کے آخر کی بات ہوگی، یہی نومبر یا دسمبر کا مہینا۔ یگانہ ابھی تک لاہور میں تھے۔ اردو مرکز سے ان کا تعلق ختم ہو چکا تھا۔ بیشتر اصحاب جنھیں تاجور نے اس کام کے لیے نہ جانے کہاں کہاں سے جمع کر لیا تھا، ایک ایک کر کے واپس جا رہے تھے۔ میرزا ایک دن آئے اور بتایا کہ بیوی بچوں کو لکھنؤ بھیج رہا ہوں؛ میں نے چنگڑ محلے کی سکونت ترک کر دی ہے، اور بھاٹی دروازے کے باہر میلا رام کے منڈوے کے مقابل

کونے والے مکان میں منتقل ہو رہا ہوں۔ اس مکان کی شکل کچھ عجیب بے ڈھنگی سی تھی۔ ممکن ہے اسی باعث اس کا کرایہ بھی کچھ سستا ہو اور اسی کفایت کے سبب انھوں نے اُسے لے لیا ہو۔ میرزا یگانہ کو ٹھٹھول کی سوجھی، انھوں نے اس کا نام ٹیڑھا بنگلہ رکھ دیا، اور اپنے خطوط میں بھی یہی نام استعمال کرنے لگے۔ پتا لکھتے: میرزا یاس یگانہ لکھنوی، ٹیڑھا بنگلہ، بیرونی بھاٹی دروازہ، لاہور۔ اس علاقے کا جو ڈاکیا تھا؛ اس سے کہہ دیا کہ 'میاں' ذرا خیال رکھنا؛ اس عنوان سے کوئی خط آئے، تو وہ ہمارا ہے۔ دو چار خط جو اس پتے سے آئے، تو اس کے بعد یہ گویا "رجسٹرڈ" ہو گیا۔

اب بظاہر ان کا کوئی ذریعۂ معاش نہیں تھا اور انھیں لاہور میں ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن رُکنا پڑا۔ اس اثنا میں انھوں نے لاہور کے مشہور تاجر کتب، شیخ مبارک علی صاحب سے اپنا دوسرا دیوان (آیاتِ وجدانی) چھاپنے کا معاملہ کر لیا۔ طے پایا کہ وہ ایک اڈیشن کے پانچ سو ادا کریں گے؛ سو روپیہ پیشگی ادا کیا، بقیہ کتاب کے چھپ جانے کے چھ مہینے کے بعد دینے کا وعدہ کیا۔ غرض دیوان شائع ہو گیا۔ اس کے بعد تشریف لائے، تو میرے لیے ایک جلد ساتھ لیتے آئے۔ اس دن بہت خفا تھے۔ ہوا یہ کہ انھوں نے کتاب کا انتساب جرمن قوم کے نام کیا تھا کہ "آج ان سے بڑا مشرقی علوم وفنون کا قدردان اور ایسے دقیق اور فلسفیانہ مضامین کا سمجھنے والا کوئی نہیں۔" لیکن ناشر کی بددیانتی اور بدتمیزی دیکھیے کہ اس نے کتاب سے انتساب کی عبارت ہی حذف کر دی ہے۔ جب میں نے اصرار کیا، اور اپنے ہاتھ سے کتابت کے کاغذ پر انگریزی میں جرمن قوم کے نام انتساب لکھ کر اسے اُن کے حوالے کیا کہ اسے چھپوا کر کتاب میں چسپاں کر دیا جائے، تو شیخ صاحب نے ایک اور ستم ظریفی کی ہے کہ جہاں دیوان ختم ہوا تھا، اس کے بعد

اپنی مطبوعات کا اشتہار لکھوایا اور بالکل آخری صفحے پر انتساب کی عبارت رکھ دی۔" ظاہر ہے کہ یہ کتاب کے شروع میں ہونا چاہیے تھی۔ میرزا صاحب اسی لیے بہت ناراض تھے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے ناشر نے اس کے بعد انھیں صرف ایک سو روپیہ اور ادا کیا تھا، بقیہ تین سو حساب دوستاں کی مد میں چلا گیا۔

آیاتِ وجدانی کے اس ایڈیشن کے شروع میں میرزا مراد بیگ شیرازی کے نام سے خاصا طویل دیباچہ تھا، جس میں یگانہ کے حالات کے بعد ان کے شعری نظریے اور کلام پر کچھ رائے زنی کی گئی تھی۔ پھر دیوان میں غزلوں اور شعروں کے درمیان بھی جابجا نثر میں دادِ کلام دی گئی تھی۔ جیسا کہ میں نے کہا، سرورق پر چھپا تھا کہ یہ محاضرات، میرزا مراد بیگ شیرازی نے لکھے ہیں۔ جس لب ولہجہ اور غیر متوازن اسلوب میں یہ ساری عبارت قلمبند ہوئی تھی، اس کے پڑھنے سے میرے دل میں یہ خیال گزرا کہ کاش کہ یہ نثر دیوان میں نہ چھپی ہوتی۔ اب میں ان کی خدمت میں کافی بےتکلف، بلکہ کسی حد تک گستاخ ہو چکا تھا۔ ایک دن میں نے ان "محاضرات" کا ذکر چھیڑا۔ راہ صاف کرنے کو میں نے پوچھا کہ یہ میرزا مراد بیگ شیرازی کون صاحب ہیں، جنھوں نے یہ محاضرات لکھے ہیں؟ کہنے لگے: ایک ہمارے عزیز دوست ہیں۔ لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، یہ سب کے سب انھیں کے خیالات نہیں، بلکہ انھوں نے کئی دوسرے احباب سے مشورہ کرنے کے بعد انھیں اپنے الفاظ میں قلمبند کر دیا ہے۔ اب میں نے براہِ راست حملہ کیا، اور کہا: حضرت! یہ جابجا "اللہ اللہ"، "اللہ اکبر"، "سبحان اللہ" وغیرہ کا استعمال جس فیاضی سے کیا گیا ہے، وہ مذاقِ سلیم پر بہت گراں گزرتا ہے۔ اور ساتھ ہی اس میں خود آپ کے بارے میں تعریفی کلمات اور جملے جس تواتر سے اور جس زبان

میں لکھے گئے ہیں، وہ بہت بھدّے معلوم ہوتے ہیں۔

فرمایا: ظاہر ہے کہ ہر ایک شخص اپنے خیالات اور ان کے اظہار میں آزاد ہے۔ لیکن اصلی بات یہ ہے کہ اردو والوں نے جس بھونڈے طریقے سے میری مخالفت کی ہے اور پچھلے بیس برس میں جو کچھ میرے خلاف کہا اور لکھا گیا، اس میں کون سا مذاقِ سلیم کا مظاہرہ ہوا ہے! اب اگر کسی نے ردِّ عمل کے طور پر میری تعریف میں مبالغہ کر دیا، تو کونسا پہاڑ ٹوٹ پڑا! اسے بھی معاف کر دینا چاہیے۔ اور ظاہر ہے کہ میں تو اس کے لیے ذمّہ دار ہوں ہی نہیں۔ بہر حال، آئندہ ایڈیشن میں اسے حذف کرا دوں گا۔

غالباً ۱۹۲۷ء کے وسط میں وہ لاہور سے روانہ ہوئے۔ اٹاوہ، علی گڑھ، آگرہ اور دوسرے مقامات پر قیام کرتے ہوئے حیدر آباد پہنچ گئے۔ وہاں مہاراجا سر کشن پرشاد شادؔ، اپنے جدِّ اعلیٰ مہاراجا چندو لال شاداں کے حقیقی معنوں میں جانشین موجود تھے۔ ملک کے گوشے گوشے سے، شاعر اور ادیب اور فنکار کھنچ کھنچ کر ان کے دربار میں پہنچ رہے تھے اور مہاراجا بہادر ان کی پذیرائی فرماتے تھے۔ یگانہ کو بھی توقع تھی کہ اس سرکار میں ان کی بھی مناسب آؤ بھگت ہو گی۔ لیکن ان کی توقّعات پوری نہیں ہوئیں۔ ہو بھی نہیں سکتی تھیں۔ میرزا یگانہ بھلا کیا جانیں دربارداری کے آداب اور طور طریقے! اور جانتے بھی، تو ان کے لیے ان پر عمل کرنا محال تھا۔ دربار داری اور مصاحبت کے بنیادی اصول ہیں: خوشامد، تملّق، ہر جائز ناجائز پر آمنّا و صدّقنا کہنا، صبح شام ہر وقت طبیعت کو حاضر رکھنا کہ فرمایش بلکہ اشارے پر بھی فوراً کچھ عرض کر دیا جائے۔ میرزا ان میں سے کسی بات کے بھی اہل نہیں تھے۔ ایسے میں ان کی یہاں کیسے نبھ سکتی تھی۔ بارے، مہاراجا بہادر نے نواب بشیر یار جنگ (انسپکٹر جنرل رجسٹریشن و اسٹامپ) کو اشارہ کیا اور یگانہ کو ان کے محکمے میں ملازمت مل گئی، اور وہ اضلاع میں سب رجسٹرار

مقرر ہو گئے۔ اولاً عثمان آباد میں تقرر ہوا، بعد کو لاتور تبادلہ ہو گیا۔ وہ آخر تک لاتور ہی میں رہے، اور یہیں سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ مشاہرہ اگرچہ زیادہ نہیں تھا، غالباً ساٹھ روپے حالی۔ لیکن یہی کیا کم تھا کہ جان و تن کا رشتہ برقرار رکھنے کو ایک باعزت اور کم و بیش مستقل انتظام ہو گیا تھا

افسوس کہ نواب بشیر یار جنگ کا عین عالم شباب میں، اس کے تین چار سال بعد انتقال ہو گیا۔ چونکہ وہ یگانہ کے محسن تھے، انھوں نے اس موقع پر دو رباعیاں کہیں:

بیرنگ ہے آج دل کا رنگ، آہ یہ کیا
پھر ہونے لگی درد سے جنگ، آہ یہ کیا
دکھ درد کے ماروں کو کہاں چھوڑ چلے؟
نواب بشیر یار جنگ، آہ، یہ کیا!

کیا ہنستے ہیں بیکسوں پہ، ہنسنے والے
آنسو کہیں تھمتے ہیں برسنے والے
کس دل سے بشیر جنگ کو مُردہ کہوں
مرتے ہیں کہیں دلوں میں بسنے والے

۵

میں جب تک لاہور میں رہا، بہت حد تک اُن سے خط و کتابت باقاعدگی سے جاری رہی۔ وہ اس دوران میں دو (یا شاید تین مرتبہ) لاہور آئے بھی، اور ان کے قیام لاہور کے دنوں میں ان سے ملاقات رہی۔ ۱۹۳۹ء میں مجھے بسلسلۂ ملازمت ہندستان سے باہر جانا پڑا۔ میری کاہل انگاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو تین سال کے بعد اُن سے رسل و رسائل کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ تاہم ان کی یاد رہ رہ کے ہمیشہ آتی رہی۔

میں جب تک طالبعلم تھا، بلکہ اس کے بعد بھی بہت دن تک، میرا ہاتھ کبھی اتنا نہیں کھلا کہ کسی کی کچھ مدد کر سکتا۔ افلاس میں کئی قباحتیں ہیں۔ جسمانی اور ذہنی تکلیف تو ہونا ہی چاہیے کہ پریشان حالی کا اور کیا نتیجہ ہو گا! لیکن اس سے ایک نقصان

یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ کتنی نیکیوں سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ جو غریب اپنا اور اپنے بیوی بچّوں کا پیٹ پالنے کے قابل نہیں، وہ کسی اور کی کیا مدد کریگا اور کسی کا بہ خیر میں کیا حصّہ لیگا! یہ سارا زمانہ کم و بیش یہی میری حالت رہی۔ رہ رہ کے خیال آتا کہ میرزا کی کچھ خدمت کرنا چاہیے۔ لیکن حالات کی مجبوری سے دل مسوس کے رہ جاتا۔

جب سرکاری ملازمت میں شامل ہوا اور اتنی آمدنی ہو گئی کہ گھر کا اُجلا خرچ چلنے کے بعد کچھ پس انداز بھی ہونے لگا، تو پھر یگانہ کی یاد آئی۔ یہ تو میرے علم میں تھا کہ وہ حیدرآباد میں ہیں؛ لیکن اس کا یقین نہیں تھا کہ ہنوز ملازم ہی ہیں۔ اتنا البتہ جانتا تھا کہ کہیں بھی ہوں، ان کی تنخواہ اتنی نہیں ہو سکتی کہ فارغ البالی سے اپنی اور اپنے گھر بار کی دیکھ بھال کر سکیں۔ ان کی خودداری، دیانت اور راستبازی اور فرض شناسی بھی اجازت نہیں دے سکتی تھی کہ وہ اپنی مقررہ تنخواہ کے علاوہ کسی بالائی آمدنی کے روادار ہوتے۔ کنبہ بہت بڑا تھا۔ اس وقت ان کے سات بچے تھے (چار بیٹے، تین بیٹیاں)، دو خود میاں بیوی۔ سماں لاکھ سستا سہی، نو آدمیوں کو کھانا کپڑا تو چاہیے ہی۔ آمدنی صرف ساٹھ روپے ماہانہ۔ وہ تو بیوی بڑی سلیقہ شعار اور وفادار ملی تھی، ورنہ ناک میں دم کر دیتی۔

القصّہ، میں نے دوار کا داس شعلہ کو لاہور خط لکھا اور ان کا پتا پوچھا۔ شعلہ سے ان کے تعلقات بہت عزیزانہ تھے اور مجھے یقین تھا کہ ان سے خط و کتابت ضرور ہوگی۔ تھوڑے دن بعد ان کا جواب ملا۔ اور معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک ملازم ہی ہیں۔ اس پر میں نے براہِ راست ان کی خدمت میں لکھا۔ فوراً جواب آیا۔ حال آنکہ تقریباً دو سال سے میں نے کوئی خط نہیں لکھا تھا، انھوں نے اس پر نہ خفگی کا اظہار کیا، نہ کبیدگی کا؛ بلکہ تجدیدِ مراسلت پر اظہارِ مسرّت کیا۔ بارے، وہی پرانے اخلاص

مودّت کے تعلقات از سرِ نو قائم ہو گئے۔

اس کے تھوڑے دن بعد عید الفطر تھی۔ میں نے اس تقریب کو غنیمت خیال کیا، اور ڈرتے ڈرتے ایک معمولی سی رقم منی آرڈر سے ان کی خدمت میں بھیجی اور لکھا کہ کاش، میں وہاں ہوتا، اور عید کی خوشی میں بچّوں کو مٹھائی کھلاتا۔ اب آپ میری نمایندگی کیجیے اور انھیں عید کی مٹھائی لا دیجیے۔ انھوں نے اس پر کسی ناراضی کا اظہار تو نہیں کیا، بلکہ رسمی طور پر شکریہ ادا کیا؛ لیکن بین السطور سے یہ بھی عیاں تھا کہ انھوں نے اسے پسند نہیں کیا۔ چونکہ میں نے وہ رقم بچّوں کے لیے بھیجی تھی، وہ انکار نہ کر سکے؛ اور یہی میرا مقصد تھا۔ بہر حال میں نے محسوس کیا کہ پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ میں ان کی افتادِ طبع سے خوب واقف تھا، اور نہیں چاہتا تھا کہ وہ بدک جائیں۔ میری مخلصانہ خواہش یہ تھی کہ حتی الوسع ان کا بوجھ کچھ ہلکا کیا جائے؛ ان پر احسان رکھنا یا اپنی داد و دہش کی نمایش میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھی۔ اسی لیے مجھے اطمینان تھا کہ میری کوشش رائیگاں نہیں جائیگی۔

قصّہ کوتاہ، میں کبھی کبھار اسی بہانے خدمت کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ ان کا ذہنی تناؤ کم ہو گیا، اور ہم اپنایت کے اس مقام پر پہنچ گئے، جہاں ایک دوسرے سے کچھ طلب کرنے میں تامّل یا تکلّف نہیں رہتا۔

مجھے معلوم ہے کہ ان کے ایسے ہی تعلقات دوارکا داس شعلہ سے بھی تھے۔ یہ بھی ان کی خدمت میں دلی مسرت محسوس کرتے تھے۔ نیز میرا گمان بجدِ یقین ہے کہ بمبئی کے ہاشم اسمٰعیل مرحوم بھی گاہے ماہے مدد کرتے ہونگے۔

۶

میں جولائی ۱۹۳۹ء کا گیا ہوا، کہیں دسمبر ۱۹۴۶ء میں وطن واپس آیا تھا۔ میں یہ پورا زمانہ اسکندریہ (مصر) میں مقیم رہا تھا، جو دوسری عالمی جنگ کے دوران میں ہٹلر

اور مسولینی کی افواج کی یلغار کا ہدفِ اوّلیں رہا تھا۔ خیر، یہ دوسرا موضوع ہے اور اس کا یگانہ سے کوئی تعلق بھی نہیں، اس لیے میں اس کے بیان سے احتراز کرتا ہوں۔ میں اگرچہ یہاں تین چار مہینے رہا، لیکن اس دوران میں یگانہ سے ملاقات کی کوئی صورت پیدا نہ ہوسکی۔ اس زمانے میں ملک بھر میں فرقہ وارانہ فسادات اور کشت و خون کا بازار گرم تھا۔ پنجاب میں صورتِ حال خاص طور پر بہت مخدوش تھی۔ میں لمبی غیر حاضری کے بعد ہندستان آیا تھا، اس لیے مجھے رشتہ داروں سے ملنے کی خاطر کئی جگہ جانا پڑا۔ اسی میں رخصت کا بیشتر زمانہ نکل گیا اور میں وسطِ اپریل، ۱۹۴۷ء میں پھر باہر چلا گیا۔ جون میں اعلان ہوگیا کہ ملک تقسیم کردیا جائیگا اور اس کی آزادی کے لیے ۱۵ اگست، ۱۹۴۷ء کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ اس کے بعد یہاں جو ناگفتہ بہ حالات پیش آئے، وہ ہم میں سے اکثر کے چشم دیدہ ہیں۔ اُن کے دُہرانے سے حاصل!

آیاتِ وجدانی طبعِ اول (شیخ مبارک علی، لاہور) کا جو نسخہ یگانہ نے اپنے دستخط کرکے لاہور میں دیا تھا، وہ تقسیمِ ملک کی نذر ہوگیا۔ میں باہر جانے سے پہلے اپنا سارا ذخیرۂ کتب جس میں کم و بیش چار ہزار جلدیں ہونگی، لاہور میں اپنے ایک عزیز کے وہاں چھوڑ گیا تھا۔ نہ جانے تقسیمِ ملک کے بعد اس پر کیا بیتی! اس کے بعد میں لاہور جا ہی نہیں سکا۔ بعض مواقع پیدا ہوئے۔ پاکستان کے دوست احباب نے بھی بہت اصرار کیا کہ آؤ، مل جاؤ۔ لیکن کیا کہوں! دونوں ملکوں کے سیاسی تعلقات جیسے کچھ غیر یقینی رہے ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ شاید عمر کے ساتھ اب زیادہ نقل و حرکت کی خواہش میں بھی کچھ کمی آگئی ہو۔ بہرحال، میں پاؤں توڑ کے بیٹھا رہا اور وہاں نہیں جاسکا، ورنہ شاید کوئی سراغ نکل سکتا کہ ان کتابوں کا کیا حشر ہوا۔

غرض میرے پاس "آیاتِ وجدانی" کا کوئی نسخہ نہیں تھا۔ میں نے یگانہ کو لکھا کہ اگر

کہیں سے ایک جلد مل سکے، تو بھجوا دیجیے۔ خدا معلوم، ان کے جی میں کیا آئی! انھوں نے پورا کلیات، جس میں آیاتِ وجدانی اور ترانہ (رباعیات) کے بعد کا کلام بھی تھا، اپنے ہاتھ سے نقل کر کے بھیج دیا۔ اس کے ملنے پر جو مسرت ہوئی، آپ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ بے بہا نسخہ آج بھی میرے پاس ہے اور میرے کتابخانے کی زینت ہے۔

۷

اس کے بعد جنوری ۱۹۵۲ء میں چھٹی پر وطن آیا، اور لکھنؤ گیا۔ میرزا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کے بڑے صاحبزادے آغا جان آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ملک کے وقت آغا جان نے اپنی ملازمت کے لیے پاکستان کا انتخاب کیا۔ اس پر سارے خاندان نے ان کے ساتھ پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے میرزا صاحب سے بھی ساتھ چلنے کی درخواست کی اور کہا کہ آپ اکیلے یہاں کس کے ساتھ رہیںگے! لیکن یہ ٹس سے مس نہ ہوئے اور جانے سے انکار کر دیا۔

اس زمانے میں وہ بر عکس نہند نامِ زنگی کافور سلطان گنج کے ایک حصے میں تن تنہا رہتے تھے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں ان کے مسکن پر پہنچا۔ ان کی زدہ حالت دیکھ کر واقعی بہت دکھ ہوا۔ آمدنی مفقود، بڑھاپا، تنہائی ـ یہ سب باتیں بجائے خود کیا کم تھیں کہ ان پر بیماری کا اضافہ ہو گیا۔ ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی لیکن کیا ہو سکتا تھا! میں دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہا۔

وہ مذہب کے معاملے میں کچھ آزاد خیال تھے۔ غالباً میں جس زمانے میں بغداد میں تھا، انھوں نے ایک خط میں تحویلِ قبلہ سے متعلق ایک رباعی لکھی، جس کا لہجہ میرے نزدیک ٹھیک نہیں تھا۔ چونکہ ہمارے درمیان بے تکلفی کا تعلق تھا، میں نے اس پر انھیں توجہ دلائی، اور مشورہ دیا کہ جہاں ہر شخص کسی مسئلے کے بارے میں اپنی آزادانہ رائے

رکھنے کا حقدار ہے، وہیں اس کے اظہار میں اسے اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس سے کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ انھوں نے اس پر کوئی بحث نہیں کی، اور ظاہرا مجھ سے اتفاق کیا۔ بہرحال بات اسی پر ختم ہوگئی۔

اب جو ان سے ملاقات ہوئی، تو ہم مختلف مسائل پر گفتگو کرنے لگے۔ وہیں قریب ایک چوکی پر ان کے کلام کا مجموعہ رکھا تھا (اب یاد نہیں رہا گنجینہ تھا، یا آیاتِ وجدانی کا کوئی ایڈیشن) میں نے بےخیالی میں کتاب اٹھالی، تو دیکھا کہ اس کی پیشانی پر بسم اللہ کے بعد ۹۲/۸۶ لکھا ہے۔ میں نے فوراً کہا کہ یہ رسول کے نام کے ساتھ آپ کو اپنا نام لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ مسکرائے اور کہا کہ بڑے زود رس ہیں آپ! ایک نظر میں نکتہ پا گئے۔ میں اس پر کیا کہتا۔ لیکن مجھے اس پر افسوس اور تشویش ضرور ہوئی۔ لامحالہ اس سے بات کا رخ مذہب کی طرف ہوگیا۔

میں نے دیکھا کہ مذہب کے بارے میں ان کی رائے میں بہت شدت آگئی ہے۔ وہ جس طرح سے اور جس لہجے میں بات کر رہے تھے۔ اس سے میرے دل میں ایسا شبہہ گزرا کہ کم ازکم اس پہلو سے ان کے دماغ کا توازن بگڑ گیا ہے۔ جب مجھے یہ احساس ہوا، تو ظاہر ہے کہ اس کے بعد میں نہیں چاہتا تھا کہ اس موضوع پر زیادہ بات چیت ہو، کیونکہ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ جذبات سے مغلوب ہو کر اناپ شناپ باتیں نہ کرنے لگیں۔ لہٰذا میں نے بلطایف الحیل گفتگو کا موضوع بدل دیا اور ہم ان کے کلام پر باتیں کرنے لگے۔ لیکن یہ بھی میری غلطی تھی۔ کیونکہ اگر وہ مذہب کے بارے میں ایک انتہا پر تھے، تو اپنی شاعری کے بارے میں دوسرے سرے پر تھے۔ اس پر بھی انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا، ان سے، ان کے پورے پس منظر کو جانتے ہوئے بھی، مجھے کچھ تعجب ہوا۔ ان کی باتوں سے یوں معلوم ہوتا تھا گویا شعر ان سے پہلے کسی نے کہا ہی نہیں، اور آیاتِ وجدانی، اردو شاعری کا پہلا مجموعہ ہے۔ میں

دل ہی دل میں افسوس کر رہا تھا کہ کتنا طباع شاعر، کیسا ذہین اور قابل دماغ، کتنا وسیع المطالعہ اور فاضل شخص زمانے کی بےمہری اور غفلت کے ہاتھوں تباہ ہوا ہے کہ آج وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ میں اس کے لیے لکھنؤ اور اہلِ لکھنؤ اور خاص کر ان کے معاصر شعراے لکھنؤ کو ذمّہ دار گردانتا ہوں، جنھوں نے سالہا سال تک ان کا بائیکاٹ کر کے اور انھیں ذہنی اور جسمانی کوفتوں میں مبتلا رکھ کر انھیں اس حالت کو پہنچا دیا تھا۔

میں جب ان سے رخصت ہوا ہوں، تو واقعہ یہ ہے کہ میرے ذہن میں یہ خیال تھا کہ اگر یہ اسی انداز پر سوچتے رہے، تو یقیناً بہت جلد پاگل ہو جائیںگے۔ اور یہی ہوا۔

۸

نیاز فتحپوری مذہب کے بارے میں بہت آزاد خیال تھے۔ بعض لوگوں نے ان کے اسلام پر شبہے کا اظہار کیا ہے۔ یہ بےبنیاد ہے۔ میرے ان کے برسوں کے تعلقات تھے۔ میں پورے اطمینان اور شرحِ صدر سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کا اسلام کے بنیادی عقاید پر پورا اطمینان تھا۔ وہ خدا اور رسول پر ایمان رکھتے تھے۔ البتہ یہ درست ہے کہ وہ لفظی الہام کے قائل نہیں تھے؛ وہ قرآن کو کلامِ الٰہی مانتے ہوئے بھی کئی مقامات پر اس کی تفسیر و تشریح میں قدما کی آرا کے پابند نہیں تھے لیکن ہر زمانے میں اس قسم کے اختلاف رہے ہیں، اور تاویل کرنے کا ہر کسی کو حق ہے۔

بہرحال، نیاز کے ایمان پر کسی تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔

یگانہ کی جو شامت آئے، انھوں نے نیاز کو ایک خط میں چند رباعیاں لکھ بھیجیں، جن پر مذہبی مسائل پر شوخی، بلکہ بیباکی اور گستاخی سے رائے زنی کی تھی۔ انھوں نے شاید نگار کی تحریروں سے قیاس کیا کہ نیاز بھی ان کے ہمخیال ہونگے اور داد دینگے۔ یہ ان کی غلط فہمی تھی اور اس کا انھیں بڑا ہی الم ناک خمیازہ بھگتنا پڑا۔

جب یہ خط نیاز کو ملا تو انھیں شرارت کی سوجھی۔ انھوں نے وہ خط اٹھا کر مولانا عبدالماجد دریابادی کے پاس بھیج دیا۔ غالباً مولانا دریابادی کا ہفتہ وار اخبار "صدق جدید" اس زمانے میں نیاز فتحپوری ہی کے مطبع میں چھپتا تھا۔ مولانا مذہب کے معاملے میں جیسے متشدد اور قدامت پرست ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ انھوں نے یہ رباعیاں دیکھیں تو بیحد خفا ہوئے۔ رباعیوں کا موضوع اور لب و لہجہ دیکھتے ہوئے خفا ہونے کی بات بھی تھی۔ اس پر انھوں نے صدق جدید (۲۷ مارچ ۱۹۵۳ء) میں اداریہ لکھا:

ایک شاتم رسول و طاعنِ قرآن

"مسلمان"

کل ہی ڈاک سے مجھے ایک لفافہ (منصور نگر، سلطان بہادر روڈ لکھنؤ سے) موصول ہوا۔ خط تین صفحے کا ہے، جس کی ایک سطر بھی کوئی مسلمان بغیر اپنا خون کھولائے ہوئے اور بے انتہا جوش میں آئے ہوئے نہیں پڑھ سکتا۔ خط ایک نام کے مسلمان کا ہے، جو شاید اصلاً تو بہاری ہے، مگر اب مدت سے لکھنؤ پر مسلط ہے۔ دوسرے مضمون اور کے خط کی چند سطریں، جو نسبتاً ہلکی ہیں، دل پر شدید جبر کر کے صدق میں دے رہا ہوں، تاکہ سب مسلمان، خصوصاً شیعہ حضرات (اس لیے کہ اس بدبخت کا پیدائشی تعلق فرقہ شیعہ سے ہے) اسے پڑھیں، اور اپنی ذمہ داری محسوس کریں کہ کس طرح اپنے اندر ایک آستین کے سانپ اور خبث مجسم کو پرورش کر رہے ہیں۔

(یہاں سے کچھ حصہ حذف کر رہا ہوں، جس میں کچھ نثر ہے، کچھ نظم، لیکن سب کی سب قابلِ اعتراض)

پورے تین صفحے کی گندگی بکھیرنے کے بعد غلاظت کی پوٹ کا خاتمہ اپنی اس شاعری

پر کرتا ہے:

سچا نقاد اور سچا شاعر مردانہ صفت بت شکنی میں ماہر

کس دل سے یگانہ کو بھلا دے کوئی قرآں پہ بھی چوٹ دھنک دیں آخر

اب تو واقفکار ناظرین نے پہچان لیا ہوگا کہ یہ وہی شخص ہے، جو کسی زمانے میں مرزا واجد حسین عظیم آبادی کہلایا، اور مرزا غالب اور عزیز لکھنوی وغیرہ کے خلاف مسلسل اپنے خرافات شائع کرتا رہا۔ پھر اور ترقی کرکے اقبالؒ کے خلاف اس نے زہر اگلنا شروع کیا، اور کوئی بدتمیزی ان کے حق میں اٹھا نہیں رکھی۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنا تخلص یگانہ رکھا، اور اپنا نسب نامہ چنگیز جہانسوز سے ملا کر اپنے آپ کو فخر سے چنگیزی لکھنا شروع کر دیا۔ سیاہ بختی کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب کئی سال سے برابر شتم رسولؐ و طعنِ قرآن مجید کے ہذیان میں مبتلا ہے، اور مسلمانوں کے دل و جگر پر اپنے زہریلے تیر چلا رہا ہے۔ جنون کی حد یہ ہے کہ ابتدا بسم اللہ کے جوڑ پر ان الفاظ سے کی ہے!

بنام یگانہ جل جلالہٗ

فرعونِ بے ساماں کی مثال اس سے بہتر اور کیا ملیگی:

بہرحال خباثت و شیطنت کا یہ تازہ شاہکار کل مسلمان قوم کے سامنے حاضر ہے جمیعۃ العلماء اور سارے مسلم اخبارات، خواہ وہ کسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہوں، اپنی ذمے داری محسوس کریں۔ سوال نفسِ عقاید کا نہیں، وہ کیسے ہی ہوں بہرحال وہ برداشت کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن شرافت اور رزالت کے ڈانڈے بہرحال الگ الگ ہیں، اور شرافت کا یہ یکسر فقدان کوئی کیسے برداشت کرلے؟

خاص لکھنؤ میں شیعہ حضرات میرے علم میں ایک دو نہیں، کثرت سے ایسے ہیں،

جو غیرتِ توحید و احترامِ ناموسِ رسولؐ میں ہرگز کسی سے پیچھے نہیں، مولانا سید علی نقی اور دوسرے علماءِ مجتہدین ہیں، شمس العلماء مولوی مہدی حسن ہیں، راجہ احمد علی خاں والیِ سلیم پور ہیں، ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسین کامونپوری ہیں، شیخ ممتاز حسین جونپوری ہیں، ایڈوکیٹ سید کلب مصطفےٰ ہیں وغیرہم ۔ ایسے حضرات اگر آمادہ ہوں، تو ایسے بدزبان کو سبق سکھا سکتے ہیں ۔ شیعہ فقہ سے مجھے کچھ زیادہ واقفیت نہیں، لیکن اتنا یقین ہے کہ شتمِ رسول، اور طعنِ قرآن پر طرح دے جانے والے ان کے علماء بھی ہرگز نہیں ۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے یگانہ غریب کو مستوجبِ سزا ثابت کرنے کے لیے، اس مضمون میں ان کے خلاف فردِ جرم اچھی خاصی طویل کر دی ہے :

۱ ۔ وہ بہاری ہے، اگرچہ مدت سے لکھنؤ پر مسلّط ہے ۔

۲ ۔ وہ مرزا غالب اور عزیز لکھنوی وغیرہ کے خلاف مسلسل اپنے خرافات شائع کرتا رہا ہے ۔

۳ ۔ اور ترقی کر کے اقبالؒ کے خلاف اس نے زہر اگلنا شروع کیا، اور کوئی بدتمیزی ان کے حق میں اٹھا نہ رکھی ۔

۴ ۔ اپنا نسب نامہ چنگیز جہانسوز سے ملا کر اپنے آپ کو فخر سے چنگیزی لکھنا شروع کیا ۔

۵ ۔ اب کئی سال سے شتمِ رسول اور طعنِ قرآن مجید کے ہذیان میں مبتلا ہے اور مسلمانوں کے دل و جگر پر اپنے زہریلے تیر چلا رہا ہے ۔

۶ ۔ بسم اللہ کے جوڑ پر اس نے "بنام یگانہ جل جلالہٗ" کی ترکیب وضع کی ہو ۔

آپ نے دیکھا کہ لکھنؤ والوں نے روزِ اول سے جن اسباب کی بنا پر یگانہ کی مخالفت کی تھی، مولانا عبدالماجد نے وہ سب ایک ایک کر کے گنا دیے ۔ اس تحریر میں انھوں نے تمام گڑے

مُردے اکھیڑ ڈالے ہیں۔ ۱۹۲۰ء اور اس کے لگ بھگ کے سارے ہنگامے اور معرکے تازہ ہوگئے، حال آں کہ ان میں حصّہ لینے والے بیشتر حضرات اللہ کے ہاں پہنچ چکے تھے۔ لیکن ماہرِ نفسیات مولانا عبدالماجد دریابادی جانتے تھے کہ پرانے زخموں میں کچوکے دے کر انھیں تازہ کر دینے کا عوام پر کیا اثر ہوگا۔

تو خیر، اس فردِ جرم کے بعد وہ اولاً مسلمان قوم اور پھر خصوصیت سے (۱) جمعیۃ العلماء اور (۲) سارے مسلم اخبارات سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنی ذمّہ داری محسوس کریں۔

یہاں تک مخاطب پوری مسلم قوم اور غالباً اہل سنت والجماعت حضرات تھے۔

اس کے بعد (۳) خاص لکھنؤ کے شیعہ حضرات سے نام بنام خطاب کیا ہے کہ اگر وہ آمادہ ہوں، تو ایسے بدزبان کو سبق سکھا سکتے ہیں۔ (۴) اور سب سے آخر میں شیعہ حضرات کو توجہ دلائی ہے کہ ان کے فقہ کی رُو سے شاتم رسول اور طاعنِ قرآن کی جو سزا ہے، اسے نافذ کریں۔

نیّتوں کا جاننے والا علّام الغیوب خدا ہے۔ کوئی کسی کے دل کو چیر کر نہیں دیکھ سکتا کہ اس میں کیا ہے۔ مولانا دریابادی نے جو کچھ لکھا، خدا ہی جانتا ہے، اس سے ان کا کیا مقصود تھا اور وہ یگانہ کو کیا سزا دلانا چاہتے تھے! یگانہ نے اس خط میں (جو مضمون برائے اشاعت نہیں تھا) جو رباعیاں لکھی تھیں، ان کی شناعت سے انکار نہیں۔ ان پر مولانا کا مشتعل ہو جانا بھی قدرتی بات تھی۔ لیکن سب سے پہلے تو ہمیں الاعمال بالنیّات کا اصول سامنے رکھنا چاہیے۔ یگانہ نے وہ خط مولانا عبدالماجد دریابادی کی خدمت میں لکھا ہی نہیں تھا، اگرچہ مولانا نے یہی دعویٰ کیا ہے؛ یگانہ نے یہ "نجی خط" نیاز فتحپوری کے نام لکھا تھا۔ اس لیے ثابت کرنا پڑے گا کہ یہ انھوں نے مسلم قوم کی دل آزاری کی نیّت سے لکھا تھا۔

پھر مولانا دریابادی خود مانتے ہیں کہ یگانہ "جنون کی حد تک" پہنچ چکے تھے، اور وہ

"ہذیان" بک رہے تھے۔ دنیا کا کوئی قانون یا فقہ ایسے شخص کو اپنے قول و فعل کے لیے "ذمہ دار" نہیں گردانتا۔

اس کے علاوہ ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے۔

اس ملک میں ایک منتظم حکومت ہے؛ اور مسلّمہ قانون اور تعزیرات کا ضابطہ ہے۔ یگانہ نے جو قصور کیا تھا، اس کے لیے ان پر باقاعدہ مقدمہ چلنا چاہیے تھا۔ اگر عدالت، مجاز ان کی دماغی کیفیت دیکھنے کے بعد انھیں مجرم اور سزا کا مستحق ٹھہراتی، تو کسی کو اعتراض کی گنجائش نہ رہتی۔ اگر یوں ہر کوئی اپنی صوابدید پر فیصلہ کرے کہ فلاں شخص نے میری یا میرے بزرگوں کی ہتک کی ہے، اور اسے پیٹ ڈالے یا موت کے گھاٹ اتار دے، تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کا کیا نتیجہ ہوگا! ملک کا امن و امان غارت نہ ہو جائیگا؟

بہرحال صدقِ جدید کے اس اداریے کا بیحد افسوسناک نتیجہ نکلا۔ مولانا دریابادی نے اپنے مضمون میں شیعی حضرات کو خاص طور پر غیرت دلائی تھی۔ چنانچہ شیعی اخبار "سرفراز" نے معاملہ اٹھایا، بلکہ شاید صدقِ جدید کا پورا مضمون لفظ بلفظ اپنے ہاں نقل کیا۔ اب کیا تھا۔ شہر میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، عوام کے مشتعل ہو جانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے! دو تین دن بعد کچھ نوجوان جلوس کی شکل میں یگانہ کے مسکن پر پہنچے؛ انھیں پکڑ کر ایک رکشا پر بٹھایا، منہ پر کالک تھوپ دی، گلے میں جوتیوں کا ہار پہنا دیا، اور انھیں بازاروں میں گھمانے لگے؛ قدم قدم پر لونڈے اُن کے منہ پر تھوکتے اور فقرے کستے جا رہے تھے۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد پولیس پہنچ گئی اور انھوں نے یگانہ کو ان ظالموں کے چنگل سے نجات دلائی۔

میں اس زمانے میں اسکندریہ (مصر) میں تھا۔ مجھے اس سانحے کی خبر پہلے ایک دوست نے دی؛ تھوڑے دن بعد خود ان کا خط ملا؛ اس میں خاصی تفصیل تھی۔ اور آخر میں لکھا

تھا کہ بالآخر ربع صدی بعد اہلِ لکھنؤ نے اپنی کینہ توزی اور حسد کی جلن کی تسکین کر ہی لی۔ لیکن اس کے باوجود کسی کے خلاف کوئی ناروا کلمہ نہیں لکھا۔ اس طرح کے حالات میں انسان کے مزاج میں قدرتاً تلخی پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ درشتی سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ لیکن آفرین ہے یگانہ پر کہ ایسے شرمناک اور جان لیوا حادثے پر بھی ان کی پیشانی پر بل نہیں آیا اور انھوں نے کسی کے خلاف کچھ نہیں کہا۔

اب کے میں ۱۹۵۴ء کے اواخر میں ہندستان آیا اور جنوری ۱۹۵۵ء میں لکھنؤ گیا۔ وہ اس زمانے میں شاہ گنج میں مقیم تھے۔ میں نے اپنے آنے کی اطلاع انہیں دی تھی۔ جب پہنچا ہوں تو وہ لیٹے ہوئے تھے۔ میرے پہنچنے پر اٹھ کر بستر ہی پر بیٹھ گئے۔ میں ان کی حالت دیکھ کر دھک سے رہ گیا۔ ہڈیوں کا پنجر ہو کر رہ گئے تھے۔ دمے کا عارضہ تھا۔ بات کرتے میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد کھانسی کا دورہ پڑ جاتا تھا جس سے نڈھال ہو جاتے۔ میں نے یہ حالت دیکھی، تو خیال کیا کہ بہتر ہو، وہاں سے چلا جاؤں کیونکہ جب تک بیٹھا رہونگا، وہ باتیں ضرور کرینگے، اور اس سے ان پر کھانسی کا دورہ بھی ضرور ہوگا۔ لیکن وہ اس پر کسی طرح راضی نہ ہوئے، اصرار کر کے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ کیا کرتا، بیٹھا رہا۔ اس پر میں نے یہ کیا کہ اب انہیں زیادہ بات چیت کرنے کا موقع نہیں دیا۔ خود ہی اپنے سفر کے حالات، آیندہ کا پروگرام، موسم اور کیا کیا الّم غلّم باتیں کرتا رہا۔ یوں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ نکل گیا۔ اب میں نے اجازت چاہی۔

یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ میں ان کے پاس سے یہ احساس لے کر اٹھا کہ اب ساحل صرف دو چار ہاتھ دور رہ گیا ہے۔

خبر ملی کہ ۴ فروری ۱۹۵۶ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

پروانے اپنی آگ میں جل کر ہوئے تمام
اب کوئی بارِ خاطرِ محفل نہیں رہا

جگر مراد آبادی

آزادی سے قبل جس زمانے میں ہندستان کی مرکزی حکومت کے دفتر شملے جایا کرتے تھے، یہاں کی "بزم ادب" ہر سال اچھے بڑے پیمانے پر ایک مشاعرے کا انتظام کیا کرتی تھی۔ اس بزم کے کرتا دھرتا بیشتر سرکاری ملازم تھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جب ان حضرات کے دماغ دفتری مسلوں کی خشکی اور یبوست سے ماؤف اور بیکار ہو جاتے، تو یہ اُسے شعر و سخن کی رنگینی سے تازگی بخشنے کی کوشش کرتے تھے۔ ماشاءاللہ خود بزم کے اراکین میں شاعروں کی کمی نہیں تھی، لیکن مشاعرے کو موقر اور وقیع بنانے کے لیے ہر سال باہر سے بھی دو چار نامی اور مشہور اساتذہ کو دعوت دی جاتی تھی۔

اتفاق سے ۱۹۳۶ء کے مشاعرے کے موقع پر میں شملے میں تھا۔ مشاعرہ ستمبر کے آخری اتوار کے دن ہوا تھا۔ اس سے پہلے دن سہ پہر کے وقت میں اور جلیل قدوائی اور بدرالدین صاحب لوئر بازار کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں چوڑا میدان میں ایک صاحب رکشا پر آتے ہوئے مل گئے۔ ہمیں دیکھ کر انھوں نے رکشا رکوائی اور بڑھ کے جلیل صاحب سے بڑے تپاک سے بغلگیر ہو گئے۔ جلیل نے میرا تعارف کرایا۔ معلوم ہوا کہ آپ جگر مرادآبادی ہیں اور خصوصی دعوت پر مشاعرے میں شرکت کے لیے تشریف لائے ہیں۔ شعلۂ طور کے ساتھ مجھ او یاما کی بنائی ہوئی جو

تصویر[٥] چھپی ہے، بالکل وہی ناک نقشا؛ لیکن چونکہ اس میں محض خطوط ہیں اس لیے اس

---

[٥] یہ تصویر اودیاما مرحوم کا شاہکار ہے، بلکہ بہت حد تک ان کی عام شہرت اسی کی مرہون منت ہے۔

اس سے متعلق ایک لطیفہ یاد آگیا۔

ہمارے ایک دوست تھے، حمید عرفانی؛ انھیں بھی تصویر کشی سے بہت دلچسپی تھی۔ انھوں نے اودیاما کی اس تصویر کی نقل تیار کی اور ایسی عمدہ کہ باید و شاید۔ اس پر انھوں نے خود جگر سے ان کا ایک فارسی شعر لکھوایا اور دستخط لیے۔ جب میں نے یہ تصویر ان کے ہاں دیکھی، تو میری نیت خراب ہوگئی۔ اب مجھے ٹھیک سا یاد نہیں کہ انھوں نے میرا شوق دیکھ کے خود ہی اسے میرے حوالے کر دیا، یا میں نے ہی کچھ حیلہ بہانہ کر کے یہ ان سے ہتھیا لی؛ بہرحال تصویر میرے قبضے میں آگئی۔ ۱۹۳۹ء میں اپنے کتابخانے کے ساتھ میں اسے اپنے عزیز دوست ملک احمد حسن مرحوم (ایڈیٹر دو رجدید) کے پاس چھوڑ آیا۔ لطیفہ یہ ہوا کہ جب احمد حسن نے اسے دیکھا تو پوچھا: کیوں بھائی، واقعی یہ جگر صاحب کی ٹھیک شبیہ ہے۔ میں نے کہا: واہ صاحب! یہ آپ نے کیا کہا۔ اصل تو یہ تصویر ہے، جگر صاحب تو اسے دیکھ کر بنائے گئے ہیں۔ یعنی یہ اصل ہے اور جگر صاحب نقل۔ پس یہ سوال تو ہو سکتا ہے کہ کیا جگر اس تصویر کے مطابق ہیں یا نہیں، لیکن آپ یہ نہیں پوچھ سکتے کہ یہ تصویر جگر کی ہے یا نہیں۔ اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

افسوس کہ میرے قیمتی کتابخانے کے ساتھ یہ تصویر بھی لاہور کے ۱۹۵۳ء کے فسادات کی نذر ہو گئی۔

رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو

بعد کو میری ملاقات خود اودیاما سے بھی ہوئی، بلکہ انھوں نے میری تصویر بھی بنائی تھی۔ تو خیر، ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ یہ آپ کا جاپانی نام اودیاما کیونکر رکھا گیا، تو انھوں نے بتایا کہ میری ولادت ۱۹۰۵ء میں روس اور جاپان کی جنگ کے زمانے میں ہوئی تھی۔ اس جنگ میں جاپان نے روس کو شکست دی تھی، میرے والد کو اس سے بڑی خوشی تھی کہ ایک ایشیائی مٹھی بھر کے ملک نے روس کے سے دیوزاد یورپی ملک کو شکست دی ہے۔ اس جنگ میں جاپانی بحری بیڑے کا امیر البحر اودیاما نامی تھا۔ والد نے میرا نام اسی کے نام پر محمد اودیاما رکھ دیا۔

سے اصلیت پورے طور پر واضح نہیں ہوتی۔ میانہ قد، خاصا سانولا رنگ، چپٹی ناک؛ چھوٹی چھوٹی نیم وا آنکھیں اور ان میں سرخی کی جھلک، ہونٹوں پر پان کا لاکھا جما ہوا؛ ترشی ہوئی کھچڑی داڑھی جس میں چاول کم اور دال زیادہ تھی؛ سر پر لمبے لمبے بے ترتیب پٹھے، جو ٹوپی سے باہر نکلے پڑتے تھے، گلے میں سیاہ رنگ کی شیروانی اور نیچے چوڑیدار چست پاجامہ؛ سر پر سلیٹی رنگ کی بالوں والی اونچی دیوار کی ٹوپی اور پاؤں میں سیاہ رنگ کا پمپ پہنے تھے۔ طبیعت میں حد درجہ بےچینی اور وحشت، حال آنکہ وہ صرف چند منٹ کے لیے رکے، لیکن اس دوران میں بھی انھوں نے جو باتیں کیں، کچھ عجیب اکھڑی اکھڑی سی۔ یوں معلوم ہوتا تھا، گویا اپنے سایے سے بھڑک رہے ہوں۔ یہ تھے جگر صاحب!

اگلے دن مشاعرہ گاہ میں پہنچے۔ خدا بخشے منتظمین کو، ان کی خوش انتظامی کے صدقے، یہ دس کی جگہ گیارہ بجے شروع ہوا تھا۔ تاجور تھے، جن سے پہلے کی ملاقات تھی۔ حسرت موہانی اور روش صدیقی سے پہلی ملاقات یہیں ہوئی۔ حسرت سے میرا تعارف تاجور مرحوم اور جلیل نے کرایا؛ اور دونوں نے مبالغے سے کام لیا۔ سائل صاحب دلّی سے تشریف لائے تھے۔ مجھے ان کی خدمت میں پہلے سے نیاز حاصل تھا۔ انھوں نے بعض پرانی غزلیں سنائی تھیں۔ زبان کے پہلو سے واقعی ان کا جواب نہیں تھا۔ احسان دانش نے اپنی نظم "مزدور کی عید" سنائی تھی۔ حسبِ معمول انھوں نے پاٹ دار آواز میں ترنّم سے پڑھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس کے بعض مقامات ایسے دردناک تھے کہ بے اختیار میری آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ حسرت نے مشاعرے میں چار غزلیں سنائیں۔ ہر ایک میں غالباً چھ چھ سات سات شعر تھے اور سب تازہ کلام۔ یہ کاغذ کے چند پرزوں پر لکھی تھیں۔ مشاعرہ ختم ہونے پر یہ کاغذ انھوں نے مجھے دے دیے۔ ان کے پڑھنے کا انداز کچھ عجیب سا تھا۔ ناک میں تو وہ بولتے ہی تھے۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ گلے میں کسی خرابی کی وجہ سے آواز اتنی

نچی تھی کہ شاید ہی دور بیٹھے ہوئے کسی شخص کے پلے کچھ پڑا ہو۔ اور پھر انھوں نے شعر کا ہے کو پڑھے، گھاس کاٹ کے رکھ دی، نظم اور نثر میں کوئی امتیاز نہیں رہا۔ کوئی اور ہوتا، تو ہلڑ مچ جاتا اور بدتمیز بے فکرے اسے زبردستی بٹھا دیتے۔ لیکن ان کی بزرگی اور شاعرانہ عظمت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ ہوئی۔ سب ادبا کے مارے خاموش بیٹھے رہے۔ ان کے پڑھنے کے وقت ایک لطیفہ بھی ہوا۔

پہلی ہی غزل تھی۔ انھوں نے مطلع پڑھا۔ اگلی صف میں بیٹھے ہوئے ایک بزرگ نے داد دی اور اسے پھر پڑھنے کی فرمائش کی۔ حسرت نے مطلع دوبارہ پڑھ دیا۔ حسنِ مطلع پڑھا، انھوں نے پھر داد دی اور مکرر پڑھنے کی درخواست کی۔ اب کے حسرت نے ناک کی پھنگی پر آئی ہوئی عینک کے اوپر سے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور شعر پھر پڑھ دیا۔ تیسرے شعر پر ان کے برابر بیٹھے ہوئے صاحب کی جو شامت آئی، انھوں نے یکبارگی "واہ" کہ کے ہاتھ اٹھایا اور "پھر ارشاد ہو" کا نعرہ لگایا۔ اب حسرت کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ انھوں نے دیکھا بھی نہیں اور "کوئی ضرورت نہیں" کہ کے اگلا شعر پڑھ دیا۔ اس کے بعد کسی کو مکرر کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

جگر صاحب نے بعض پرانی غزلوں کے علاوہ ایک غیر مکمل تازہ غزل کے چند شعر سنائے تھے، جس کا یہ بے پناہ مطلع آج تک میرے حافظے میں محفوظ ہے:

آکہ تجھ بن اس طرح، اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے جگر کو پڑھتے سنا۔ انھوں نے بڑے والہانہ انداز میں ترنم سے کلام سنایا۔ یہ حقیقت ہے کہ محفل میں سماں بندھ گیا۔ میں نے اپنی زندگی میں دو ہی ایسے شاعر دیکھے، جنھیں سن کے بڑے بڑے ثقہ اور تقدس مآب ڈاڑھی بردار مولویوں تک کو وجد آگیا۔ ایک حفیظ جالندھری اور دوسرے جگر مرادآبادی۔

(۲)

میں ۱۹۳۶ء کے جاڑوں میں دلّی آگیا۔ یہاں میں نے ایک مختصر سا مکان قرول باغ میں اجمل خاں روڈ پر لے لیا۔ جن لوگوں نے آج سے ۳۵۔۴۰ برس پہلے کا قرول باغ نہیں دیکھا اور ان کی نظر میں صرف اس کی موجودہ چہل پہل اور گہما گہمی ہے، وہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس زمانے میں یہاں کیا خاک اڑتی تھی! بلا مبالغہ، اجمل خاں روڈ، غالب کی "سرحدِ ادراک" معلوم ہوتی تھی۔ اس سڑک پر بھی بس گنتی کے چند مکان تھے؛ اس کے ایک سرے پر جامعۂ ملّیہ کے دفتر اور اس کے عملے فعلے کے سکونتی مکان تھے اور دوسرے سرے پر طبیہ کالج کی عمارت۔ کوئی فرلانگ بھر کی دوری پر "گندہ نالہ" تھا جو یوں سمجھیے کہ تہذیب و تمدن کی آخری سرحد تھی۔ اس کے اُس پار خانہ بدوش، رنگڑوں اور بازیگروں کے پھوس کے چھپر اور جھونپڑیاں تھیں؛ اور یہ واقعہ ہے کہ لوگ اِکّا دکّا رات کی تاریکی تو درکنار دن کی روشنی میں بھی اُس علاقے میں جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ یہاں دن دہاڑے مسافر لٹ جاتے، بلکہ بعض اوقات قتل تک کی واردات ہو جاتی تھی۔

تو خیر، چونکہ میں کسی ایسی ہی جگہ کی تلاش میں تھا "جہاں کوئی نہ ہو" اس لیے میں نے سوچا کہ اس سے بہتر اور کونسا مقام ہوگا! اور مکان اسی اجمل خاں روڈ پر لے لیا۔

میں یہاں روزانہ صبح کے وقت ایک صاحب کو تیز تیز مکتبۂ جامعہ کی طرف جاتے دیکھتا؛ گندمی رنگ، متوسط قد، دوہرا جسم، گول آفتابی چہرا، بڑی بڑی شربتی آنکھیں، اونچی چوڑی پیشانی بھروال سیاہ ڈاڑھی اور مونچھیں، نیچے علی گڑھ فیشن کا پاجامہ، گلے میں شیروانی اور سر پر گاندھی ٹوپی۔ وہ جب بھی ملے، منہ میں گلوری اور بغل میں پاندان دبائے ہوئے۔ کئی مرتبہ جی میں آئی کہ آدمی دلچسپ معلوم ہوتے ہیں، ان سے راہ و رسم پیدا کرنا چاہیے۔ یوں بھی پڑوس کا معاملہ ہے، آخر بالکل الگ تھلگ رہ کے تو زندگی کے دن کٹنے سے رہے۔ لیکن میری فطری کم آمیزی ہمیشہ مانع آئی۔ جرأت نہ پڑی کہ خود اپنا تعارف کرادوں۔ آخر، خدا معلوم

کیسے خود انھیں خیال آیا۔ ایک دن آمنے سامنے آتے ہوئے ہماری مڈبھیڑ ہوگئی۔ رک گئے، علیک سلیک ہوئی؛ پوچھا: آپ یہاں نئے آئے ہیں، کوئی تکلیف تو نہیں۔ معلوم ہوا ان کا نام ہے محمود علی خان۔ یہ وہی محمود علی خان (جامعی) تھے، جنھوں نے ہمارے ہاں سو شعروں کی جدت یا بدعت شروع کی۔ میر کے سو شعر، غالب کے سو شعر، مومن کے سو شعر۔ غرض اس طرح انھوں نے نئے پرانے شاعروں کے کوئی دس پندرہ کتابچے شائع کیے تھے۔ اس کے بعد یار لوگ اسے لے اڑے جب یہ دیکھا کہ پورا دیوان چھپنا مشکل ہے، کون اسے چھاپےگا اور کون پڑھےگا، اس نے اپنا تعارف کرانے کے لیے یہ کم خرچ بالا نشین نسخہ استعمال کیا اور اپنے سو شعر چھپوا کے دوستوں میں تقسیم کر دیے، تاکہ سند رہیں۔ یوں چھپنے کی ہوس بھی پوری ہوگئی اور سستے بھی چھوٹے۔ چنانچہ باز کے سو شعر، گلہری کے سو شعر اور نہ جانے کس کس کے سو شعر چھپ چکے ہیں۔ لیکن محمود صاحب نے اس کے علاوہ متعدد انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ چونکہ انھیں انگریزی اور اردو دونوں پر پوری قدرت حاصل تھی اور آدمی ٹھہرے بےحد محنتی، اس لیے وہ ترجمے میں ہمیشہ کامیاب رہے۔

غرض اس کے بعد ان سے تعلقات بہت گہرے اور مخلصانہ ہوگئے۔

ایک دن شام کے وقت اُن کا آدمی آیا کہ "خان صاحب" بلاتے ہیں۔ میں پہنچا، تو دیکھا کہ جگر صاحب تشریف فرما ہیں۔ محمود صاحب کو معلوم نہیں تھا کہ میں اُن سے پہلے مل چکا ہوں۔ جگر صاحب اور محمود صاحب کے بہت پرانے مراسم تھے، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ اگر محمود اور جلیل قدوائی نہ ہوتے تو غالباً اُن کا کلام کبھی شائع ہی نہیں ہو سکتا تھا اور اگر ہوتا بھی، تو کم از کم اس کی یہ ضخامت نہ ہوتی۔ جگر جس طرح کے لاابالی اور بےپروا شخص تھے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ انھوں نے کبھی باقاعدگی سے اپنا کلام، ایک جگہ جمع نہیں کیا۔ وہ تو خوش قسمتی سے ان دونوں صاحبوں نے شروع سے حفاظت کا اہتمام کیا، ورنہ خدا معلوم کس قدر ضائع ہو گیا ہوتا۔ چنانچہ جیسا کہ شعلۂ طور کے دیباچے میں جگر نے اعتراف کیا ہے، انھی

دونوں کی بیاضوں سے یہ دیوان مرتب ہوا تھا۔

(۳)

جگر صاحب یہاں کوئی دس بارہ دن رہے اور اس کے بعد اگلے برس کے دوران میں بھی جب میرا قیام قرول باغ ہی میں تھا، اکثر یہاں آتے رہے۔ ان ایام میں مجھے اچھی طرح قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا اور رفتہ رفتہ ہمارے آپس کے تعلقات بہت دوستانہ اور عزیزانہ ہو گئے۔

وہ اس زمانے میں پیتے تھے اور بےحساب! اور ستم بالائے ستم کہ اس کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ جوش بھی پیتے تھے! لیکن ان کا یہ اصول ہے، جس سے انھوں نے کبھی انحراف نہیں کیا کہ وہ دن میں ہرگز نہیں پییں گے۔ صرف مغرب کے وقت، وہ بھی دو تین جام۔ اگر کبھی خاص دوست احباب کا مجمع ہوا۔ تو ایک آدھ زیادہ سہی۔ اختر شیرانی اور مجاز نے بھی کبھی کسی کی پروا نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں قبل از وقت چل بسے۔ جگر کا بھی یہی حال تھا۔ ایک تو جب مل گئی، اور دوسرے جتنی چاہا پی لی۔ پھر اس کا بھی خیال نہیں کہ کس قسم کی ہے۔ اچھی یا بری، بس شراب ہو۔ وہ تو خدا نے اپنے فضل و کرم سے انھیں توبہ کی توفیق دے دی کہ انھوں نے اسے ترک کر دیا، ورنہ جو حشر ان کا ہوا ہوتا، ظاہر ہے۔ تاہم آخر عمر میں ان کی صحت جو اتنی خراب رہتی تھی، تو اس کی اصل وجہ یہی اوائلِ عمر کی نامراد شراب نوشی اور دوسری بےاعتدالیاں تھیں۔

ایک دن سرِ شام پینے بیٹھے اور تھوڑی تھوڑی مقدار میں نصف بوتل کے قریب پی گئے۔ آدھی رات کے بعد کہنے لگے: چلو! جوش کے ہاں چلیں (جو وہیں قرول باغ میں تھوڑے فاصلے پر رہتے تھے) ہم نے بہت کہا کہ وہ سو چکے ہونگے، اب اس وقت اتنی رات گئے انھیں دق کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ لیکن انھوں نے کسی کی ایک نہ سنی بلکہ ہمارے کہنے پر بگڑ گئے۔ آخر سب نے عافیت اسی میں دیکھی کہ جس طرح یہ کہتے ہیں، اسی طرح کیا جائے۔ چنانچہ

آگے آگے جگر اور انھیں سہارا دینے کو محمود صاحب اور ان کے پیچھے ہم چھ سات آدمی، جلوس کی شکل میں روانہ ہوئے۔ سردیوں کی ڈھلتی رات اور اس زمانے کا قرول باغ، آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کیسا ہُو کا عالم ہوگا۔ وہ تو خیر گزری کہ پولیس کا سپاہی راستے میں نہیں مل گیا، ورنہ یقیناً وہ خیال کرتا کہ یہ مشٹنڈے شراب پی کر کہیں واردات کو جا رہے ہیں، یا کم از کم آوارہ گرد ضرور ہیں اور ہمیں جوش کے مکان کے بجائے تھانے پہنچا دیتا۔ اب ایک لطیفہ ہوا۔ جگر صاحب چند قدم چلیں اور سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر تقریر کرنا شروع کر دیں۔ اس پر کتّوں اور سؤروں نے (جن کی اس زمانے میں یہاں بڑی کثرت تھی) ادھر ادھر سے نکل کر بھونکنا اور چیخنا اور بھاگنا شروع کر دیا۔ اس پر ہم سب بلطایف الحیل انھیں آگے چلنے کی ترغیب دیتے۔ قصّہ کوتاہ، خدا خدا کر کے وہ تین چار سو گز کا فاصلہ کوئی آدھ پون گھنٹے میں طے ہوا اور ہم لدے پھندے جوش کے مکان کے بیرونی برآمدے میں داخل ہوئے۔ یہاں پہنچتے ہی جگر نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے بڑبڑا کے آواز آئی: "کون؟" انھوں نے جواب دیا۔ "جگر"۔ "کون؟" "ارے ایک مرتبہ جو کہا ہو جگر؛ دروازہ کھولو"۔ "بھائی ہم سو رہے ہیں، صبح کے وقت آنا"۔ "سو رہے ہیں! آئے بڑے سونے والے۔ ارے ہم، ہم یہاں سردی میں باہر کھڑے ہیں اور تم سوئے پڑے ہو۔ جلد دروازہ کھولو۔ یہ محمود بھی ہمارے ساتھ ہے"۔ اس پر جوش غریب طوعاً و کرہاً اٹھے اور انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ انھوں نے اگلے دن مجھ سے کہا کہ میں دروازہ یوں تھوڑی کھولنے والا تھا۔ لیکن جب جگر نے محمود کا نام لیا، تو میں نے خیال کیا کہ ضرور کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے، ورنہ محمود یوں رات کے وقت قطعاً نہ آتے۔ یہ اس لیے کہ محمود صاحب پیتے نہیں تھے اور جوش صاحب کو معلوم تھا کہ وہ سنجیدہ آدمی ہیں۔

دروازے کا کھلنا تھا کہ جگر صاحب لپک کے کمرے میں داخل ہوئے اور اوپر کی گرم چادر پھینک، شڑاپ سے جوش کے لحاف میں گھس گئے، جیسے وہ گھر سے اسی کی تلاش میں

یہاں تک آئے ہوں۔ اور کہنے لگے: "محمود اب کافی دیر ہو چکی ہے۔ میں یہیں سوؤنگا۔ آپ تشریف لے جائیے۔ میں صبح کے وقت ناشتے کے بعد آجاؤنگا۔ اچھا، خدا حافظ" جوش بیچارے حیران پریشان کہ یہ بلائے بے درماں کہاں سے نازل ہو گئی! وہ کہتے ہی رہے "نہیں جگر صاحب! آپ جائیے محمود صاحب کے ساتھ" لیکن توبہ ہے، یہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ ادھر ہم سب کے ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ آخر ہم نے دونوں دوستوں کو آپس میں راز و نیاز کرنے کے لیے شب بخیر کہا اور واپس چلے گئے۔

لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ جگر نشے کی حالت میں بالکل حواس کھو بیٹھے ہوں یا بہکی بہکی باتیں فرمانے لگتے تھے۔ ابھی ایک موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں کہ یک لخت اس سے گریز کر کے کسی دوسرے مضمون پر بات چیت کرنے لگینگے، حالانکہ دونوں میں آپس میں قطعاً کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ سننے والا ہکا بکا ان کے منہ کی طرف دیکھ رہا ہے کہ یا الٰہی یہ کیا! ابھی دو منٹ پہلے تو یہ غزل کی حمایت میں دلائل بیان کر رہے تھے اور اب عینک کے تالوں کی پہچان اور ان کی مختلف قسموں پر تقریر فرمانے لگے ہیں، لیکن ان کی بلا سے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ان کا دماغ بیک وقت مختلف موضوعات کی جولانگاہ بنا رہتا تھا۔ اب اس دنگل میں کسی خاص وقت جس موضوع کا غلبہ ہو گیا، زبان پر اس کی بات آگئی۔ لیکن وہ ذہنی کشمکش برابر جاری رہتی۔ پھر اگر پہلے موضوع کی بات چیت کے دوران میں، کسی دوسرے مضمون کا پلّا بھاری ہو گیا، تو بھلا چپ ہو جائیگا اور وہ بے اختیار اسے چھوڑ کر دوسرے سے متعلق باتیں کرنے لگتے۔ سامع کو اس سے حیرت ہو، تو ہوا کرے، ان کے لیے یہ بالکل قدرتی اور معمولی اسلوب گفتگو تھا۔ اور یہ بات سرخوشی کے عالم ہی سے مخصوص نہیں تھی، وہ ہوش کے وقت بھی کچھ ایسے ہی تھے۔

بہر حال واہی تباہی بکنا یا گالی دینا کبھی اُن کا شعار نہیں رہا۔ بات یہ ہے کہ حقیقت میں ان کا مزاج دینی تھا۔ اصغر گونڈوی مرحوم سے انھیں خاص عقیدت رہی۔ بلکہ وہ ان کے

ہم زلف بھی تھے۔ اصغرؔ جس پایے کے انسان تھے، اُن کا ہر ایک ملنے والا اس کا معترف ہے۔ اصغرؔ کی طرح جگرؔ بھی حضرت شاہ عبدالغنی منگلوری سے بیعت تھے۔ یہی سبب ہے کہ لاکھ بے عملی بلکہ بدعملی کے باوجود، اساسی طور پر ان کی روح کبھی ان آلایشوں سے ملوث نہیں ہونے پائی۔ انھوں نے فسق و فجور میں بھی لذت محسوس نہیں کی۔ جو کچھ سرزد ہوا، اضطراری طور پر۔ وہ ہوش کی حالت میں ہمیشہ پشیمان ہوتے اور ندامت محسوس کرتے اور اس سے باز رہنے کے منصوبے باندھتے۔ لیکن چونکہ کثرتِ شراب نوشی سے قوتِ ارادی حد درجہ کمزور ہو چکی تھی، اس لیے اس عزم میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ اس میں بہت حد تک قصور ان لوگوں کا بھی ہے، جو ان کے ارد گرد رہا کرتے تھے۔ یہ اصحاب اپنے آپ کو ان کا بڑا دوست اور خیر خواہ کہتے تھے، وہ دراصل ان کے دشمن تھے۔ جگرؔ صاحب کہیں جاتے، تو یہ حواری خود صاحبِ خانہ سے فرمایش کر کے بوتل منگوالیتے۔ اور جام بھر کے جگرؔ صاحب کے آگے رکھ دیتے۔ اب وہ بیچارے کیا کرتے! اگر کسی شخص کی اصلاح منظور ہو، تو سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ اسے آزمایش میں نہ ڈالا جائے، تاکہ بتدریج اس کی قوتِ ارادی عود کر آئے اور رفتہ رفتہ اتنی مضبوط ہو جائے کہ وہ خود آزمایش کا مقابلہ کر سکے۔ لیکن اگر آپ قدم قدم پر اُس کا امتحان کرنے لگیں، اس کے چاروں طرف اس کی لغزش کے ساز و سامان جمع کر دیں اور پھر اس سے کہیں کہ ہم چاہتے ہیں، آپ اس بُری علت سے نجات حاصل کر لیں، تو یہ خیالِ خام ہے:

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن، ہشیار باش!

اگر اس غریب میں ان آلودگیوں سے دامن جھٹک کر الگ ہو جانے کی قوت ہوتی، تو وہ ان حالوں پہنچتا ہی کیوں!

ان کی قوتِ ارادی کے فقدان پر ایک واقعہ یاد آگیا۔ جس طرح وہ اپنے آپ کوئی فیصلہ نہیں

کرسکتے تھے، اسی طرح کسی کی دل شکنی بھی ان سے محال تھی ۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ ایک دن خاصی رات گئے ان کی ڈاڑھ میں سخت درد ہونے لگا۔ اس وقت جو چھوٹا موٹا گھریلو علاج ممکن تھا، کیا گیا، لیکن اس سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ رات انھوں نے بہت بے چینی سے کاٹی۔ اگلی صبح ان کی جو شامت آئے، مختصر سا ناشتہ کرکے اکیلے طبیہ کالج چلے گئے کہ وہاں کسی حکیم صاحب سے دکھا کے دوا لے آئیں۔ وہاں جو پہنچے، تو لڑکوں نے پہچان لیا۔ اب کیا تھا، وہ انھیں گھیر گھار کے کالج کے ہال میں لے گئے اور دو گھنٹے تک ان سے کلام سنتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علاج تو خیر کیا ہوتا، جب یہ وہاں سے لوٹے ہیں تو ان کی مظلوم صورت دیکھنے کے قابل تھی۔ نہ صرف دانت کا درد بدستور موجود تھا، بلکہ اس پر دردِ سر کا اضافہ ہوچکا تھا۔ گئے تھے روزے بخشوانے، نماز گلے پڑی۔ میں نے پوچھا کہ آخر آپ نے یہ کیوں کیا، انکار کردیا ہوتا۔ تو رونی صورت بنا کے کہنے لگے: بھائی، میں کیا کرتا، وہ طالب علم اتنی محبت سے اصرار کررہے تھے، کہ مجھ میں انکار کی ہمت نہ رہی۔

بات سے بات یاد آتی ہے۔

جگر صاحب کے ساتھ زندگی بھر ہمیشہ کوئی نہ کوئی شخص رہا۔ سفر ہو یا حضر، انھیں کسی بھروسے کے آدمی کی ضرورت ہوتی، جو ان کے روزمرہ کے معاملات کی نگرانی کرسکے، ان کی ضروریات کا خیال رکھے، روپے پیسے کا حساب رکھے۔ اس کی وجہ یہ کہ ان کے مزاج میں سکون اور اطمینان نہیں تھا، بات جلد بھول جاتے، انتظامی صلاحیت شروع میں شاید کچھ رہی ہو، بعد کو وہ بھی مفقود ہوگئی۔ اس لیے اگر دیکھ بھال کے لیے کوئی چوکس آدمی ان کے ساتھ نہ رہتا تو خدا جانے کیا ہوجاتا۔ اب اگر یہ آدمی مخلص اور دردمند اور بے غرض دوست ہوا، تو اس سے انھیں بہت آرام ملتا، اور کوئی نقصان بھی نہ ہوتا۔ لیکن بعض اوقات آدمی کے انتخاب میں غلطی بھی ہوجاتی تھی۔ اسی طرح کا حادثہ ایک مرتبہ پیش آیا۔ یہ صاحب مستعد تو بہت تھے، لیکن تھے چور۔ آج یہ چیز غائب کردی، کل وہ۔ جگر کے

دوستوں نے انھیں بہت متنبہ کیا کہ یہ آدمی اعتماد کے قابل نہیں، لیکن انھوں نے کسی کی بات پر کان نہ دھرا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ اور تو اور، جگر صاحب کو بھی ان کی کارگزاریوں کا یقین آگیا۔ کوئی اور ہوتا، تو اس کے بعد انھیں ایک لمحہ بھی اپنے ساتھ رکھنا گوارا نہ کرتا۔ لیکن اس کے باوجود کہ انھیں معلوم ہوگیا تھا کہ وہ کس قماش کے بزرگ ہیں، وہ ان سے معذرت کرنے کا حوصلہ نہ کر سکے۔ ایک دن جگر غسل خانے جانے والے تھے۔ چاہتے تھے کہ کلائی کی گھڑی اتار کر باہر بیٹھنے کے کمرے میں رکھ جائیں۔ لیکن وہ ذات شریف موجود تھے جگر کو پورا یقین تھا کہ گھڑی ان کی غیر حاضری میں غائب ہو جائیگی۔ اب یہ تذبذب میں کہ کریں تو کیا! گھڑی کو غسلخانے کے اندر لے جا نہیں سکتے اور باہر چھوڑ جانے میں جو خطرہ ہے، وہ سامنے موجود ہے۔ آخر جب مزید انتظار کرنا ناممکن ہوگیا، تو جھنجلا کے گھڑی ان صاحب کے ہاتھ میں دے کر کہا، اچھا، تو یہ بھی آپ لے لیجیے اور خود غسلخانے میں داخل ہوگئے۔

میں سمجھتا ہوں، اگر پیٹ پالنے کی مجبوری نہ ہوتی یا بعض دوسری ذمے داریاں اُن کے سر پر نہ ہوتیں، تو وہ کبھی کوئی کام نہ کرتے۔ ان کی ہستی کا خمیر جن اجزا سے اٹھایا گیا تھا، ان میں کاہلی اور سستی کچھ ضرورت سے زیادہ مقدار میں پڑ گئی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا، کہ جہاں تک شعر کا تعلق ہے، وہ واقعی روح القدس کے شاگرد تھے۔ لیکن جہاں دنیا کا کوئی معاملہ آیا، وہ بالکل کودن تھے۔ وہ ہفتوں اور مہینوں کبھی تنکا اٹھا کے نہیں توڑتے تھے۔ اس پر ایک بات یاد آگئی۔

۱۹۳۲ء میں جگر صاحب بھوپال گئے۔ محمود صاحب ان دنوں وہیں ٹکسٹائل کمشنر کے عہدے پر فائز تھے۔ یہ گرمی اور برسات کے کوئی چھ مہینے ان کے پاس ٹھہرے۔ شہر کے اکثر صاحب ذوق حضرات روزانہ شام کو اپنے اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر محمود کے مکان پر جمع ہوتے اور جگر صاحب کی صحبت کا لطف اٹھاتے۔ ادبی گپ اور لطیفہ بازی ہوتی، شعر و شاعری کا دور چلتا اور بالعموم یہ پُر لطف اجتماع رات کے نو بجے سے لے کر صبح کے

دو دو تین تین بجے تک رہتے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ دو ایک دن کی بات تو تھی نہیں، روزانہ پانچ پانچ چھ چھ گھنٹے بلکہ تمام آداب و تکلفات کے ساتھ ایک جگہ بیٹھے رہنا، ہفتخواں سے کم نہیں تھا، بالخصوص جب کہ ان میں بعض اصحاب اچھے خاصے سن رسیدہ تھے۔ کسی بے فکرے کو سوجھی کہ ایک ایسی انجمن بنائی جائے، جس میں ادب آداب کے سب قیود اٹھا دیے جائیں، تاکہ سب احباب آزادی اور بے تکلفی سے اپنا وقت گزار سکیں۔ سب نے اس تجویز پر صاد کیا۔

انجمن کا بنیادی اصول یہ طے پایا کہ آج کل دنیا میں جتنی بےچینی ہے، اس کی علتِ غائی سرعتِ رفتار ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے کہ پرانے زمانے میں لوگ بالعموم پیدل جاتے آتے تھے، تو سب طرف امن و امان کا دور دورہ تھا۔ شروع میں سواری کا رواج صرف معذوروں اور بیماروں کے لیے تھا۔ اس کے بعد ان چیزوں کا غلط استعمال ہونے لگا۔ اور اب تو نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ ان غریبوں کو تو کوئی پوچھتا تک نہیں اور ہر طرح سے چاق چوبند اور ہٹے کٹے لوگ گاڑیوں اور موٹروں اور ہوائی جہازوں میں اڑے پھرتے ہیں۔ اس برق رفتاری نے دنیا میں جنگ و جدال اور ہلاکت و تباہی آسان کر دی ہے، کیونکہ جب تک یہ سریع سامانِ نقل و حرکت معرضِ وجود میں نہیں آئے تھے، جنگ شاذ و نادر ہی ہوتی تھی، اور اگر کارِ قضا کہیں ہو بھی گئی، تو اس کی تباہ کاری کا میدان بہت محدود رہتا تھا۔ چونکہ فوج، سامانِ جنگ، اسلحہ، رسد وغیرہ کی حمل و نقل میں بڑی دشواریاں تھیں، اس لیے اگر ملکوں میں آپس میں کوئی اختلاف پیدا بھی ہو جاتا، تو وہ ان مشکلات کے پیشِ نظر حتی الوسع بات بڑھانے سے اجتناب کرتے اور ایک دوسرے سے مصالحانہ گفتگو کر کے فیصلہ کر لیتے تھے۔ جنگ صرف اس وقت ہوتی، جب اور کوئی چارۂ کار نہیں رہتا تھا۔ پھر چونکہ مسافت طے کرنے میں لامحالہ کافی وقت لگتا تھا، اس لیے حملہ آور فوج کے منزلِ مقصود تک پہنچتے پہنچتے دوسرا ملک بھی کم و بیش تیار

ہوجاتا۔ یوں فریقین کی خاطر، یکساں ہوجانے سے کسی ملک کو خاص نقصان نہ رہتا اور صلح صفائی پر خاتمہ ہوجاتا۔

لیکن اب کیا ہے؟ فاصلے کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہی۔ صبح کا ناشتہ دلی میں کیا، تو ہوائی جہاز میں بیٹھ کے دوپہر کا کھانا قاہرہ میں، اور رات کا لندن میں کھاؤ۔ اسی طرح لڑائی بھی آسان ہوگئی ہے۔ ابھی الٹی میٹم دیا اور گھنٹہ آدھ گھنٹہ بعد غنیم کے ملک پر گولہ باری شروع کردی۔ اس سے بڑی تباہی آتی ہے۔ شہر اور بستیاں پل بھر میں ویران ہوجاتی ہیں۔ بیگناہ اور ناکردہ کار لوگ گوناگوں مصیبتوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ یہ سارا عذاب ہم پر اسی سرعتِ رفتار کی بدولت نازل ہوا ہے۔ جب تک دنیا کاہلی جیسی نعمتِ خداوندی کی قدر کرتی رہی، سب کی زندگی عیش و عشرت اور آرام و آسایش سے معمور تھی۔ جب لوگوں نے کفرانِ نعمت کیا، تو بےچینی اور پریشانی کا شکار ہوگئے۔ اب نوعِ انسان کو کامل ہلاکت سے بچانے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اسے کاہلی جیسی نعمتِ الٰہی کی طرف واپس بلایا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے امن پسند لوگوں کا یہ فرض ہے کہ وہ سکون اور کاہلی کی تبلیغ کریں تاکہ مخلوقِ خدا سرعتِ رفتار کے ہاتھوں لائی ہوئی مصیبت سے نجات پاسکے۔

جب اس اصول پر سب کا اتفاق ہوگیا، تو چند "امن پسند باشندگانِ بھوپال" نے یہ اقدام کیا کہ ایک "انجمن الکھلا" (فضلاء کے وزن پر کاہل کی جمع کہلاء) کی بنیاد رکھی اور باقی دنیا کے امن پسندوں کو دعوت دی کہ وہ بھی ہر جگہ اسی طرح کی انجمنیں قائم کرکے اس مقصدِ اعلیٰ کے حصول میں تعاون کریں۔ بھوپال کی صدر انجمن کا دفتر (دارالکہلاء) محمود صاحب کے سکونتی مکان کا وہی کمرہ قرار پایا، جہاں جگر مقیم تھے۔ فرش پر پوال کی خاصی موٹی تہ اور اس پر ایک دبیز گدا ڈال دیا گیا تھا، جس پر سفید براق چاندنی بچھی رہتی تھی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ انجمن میں داخلہ آسان تھا اور ہما شما سب اس کے رکن بن گئے تھے، بلکہ اگر کوئی شخص رکنیت کی درخواست کرتا، تو انجمن کے "عظیم الشان مقاصد" پر ایمان اور ان کے مطابق عمل کرنے کی خواہش اور قابلیت معلوم کرنے کے لیے اس کی کاہلی کا امتحان لیا جاتا۔ اگر وہ اس امتحان میں پورا اترتا، تو اسے بطور رکن قبول کر لیا جاتا داخلے کی فیس ایک تکیہ تھی۔ جس دن کوئی شخص رکن مقرر ہو جاتا، وہ گھر سے ایک تکیہ لے آتا اور اسے "دار الکہلا" میں ڈال دیتا۔

انجمن کے صرف چار عہدیدار تھے۔ جناب جگر، صدر، یہ "صدر الکہلا" تھے نائب صدر حسرت لکھنوی تھے انھیں "نائب الکہلا" کہتے تھے۔ ان حضرات کو صدر اور نائب صدر اس لیے نہیں چنا گیا تھا کہ وہ بہت اچھے شاعر تھے، بلکہ انھوں نے اپنی غیر معمولی "کاہلانہ" صلاحیتوں سے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی اس اعزاز کے بجا طور پر مستحق ہیں اور اس عہدے کی کڑی ذمہ داریاں سر انجام دینے کے پوری طرح اہل ہیں۔ تیسرا عہدہ "ناظم الکہلا" کا تھا۔ اس پر محمود صاحب کا تقرر ہوا تھا۔ ان کے ذمے یہ کام تھا کہ "دار الکہلا" میں ہر طرح کا انتظام کریں، اجلاس کے لیے مطلوبہ اشیاء فراہم کریں، روزانہ کارروائی کا پروگرام بنائیں وغیرہ۔ چوتھے "نقیب الکہلا" کہلائے جنھیں آپ سارجنٹ ایٹ آرمز (SEARGENT AT ARMS) کہہ سکتے ہیں۔ اس عہدے پر جناب غلام حسین عزم بنارسی فائز تھے۔ ان کا فرض تھا کہ یہ صدر انجمن کے مختلف احکام بلند آواز سے حاضرین تک پہنچایا کریں۔ چونکہ وہ بڑے لمبے تڑنگے اور بلند آواز تھے، اس لیے یہ عہدہ جلیلہ ان کے سپرد کیا گیا تھا۔ ان عہدہ داروں کے علاوہ اکیس ارکان تھے، جن میں بھوپال کے بعض مشہور اور معزز اصحاب وقت شامل تھے۔ مثلاً میاں محمد مہدی نائب مہتمم تاریخ، سید علی اکبر کاظمی سپرنٹنڈنٹ محکمۂ صحت عامہ و تعلیمات، جناب احمد اللہ خاں نشاکی سپرنٹنڈنٹ مجلس واضع قوانین، استاد محمد کریم، ذکی بھوپالی،

فکری بھوپالی، سرِوش بھوپالی، محمد عبدالباسط بھوپالی، محمد اصغر شعری بھوپالی وغیرہ۔

ایک اور بات۔ ہر ایک رکن کو اس کی کسی ذاتی خصوصیت کی بنا پر خاص خطاب سے سرفراز کیا گیا اور اجلاس میں وہ اسی نام سے مخاطب کیے جاتے تھے۔ مثلاً محمد مہدی صاحب اپنی بزرگی اور شفقانہ رویے کی وجہ سے "اُم الکہلا" کہلاتے تھے۔ محمد شریف خان فکری کی چونکہ چھوٹی سی مگر نمایاں توند تھی، اس لیے انھیں "قبۃ الکہلا" کا خطاب دیا گیا۔ شاکر علی خان چونکہ دراز قد تھے۔ اس لیے "طویل الکہلا" کہلائے۔ ایک صاحب کا ناک نقشا خوبصورت اور رنگ بھی سانولا سلونا تھا۔ یہ "ملیح الکہلا" تھے اور ان کے مقابلے میں ایک دوسرے صاحب اپنے سفید شلجمی رنگ کی وجہ سے "صبیح الکہلا"۔ محمد اشرف (ایڈیٹر سنی روشنی، کراچی) چائے میں شکر بہت پیتے تھے، بلکہ داؤ لگے، تو دوسروں کی آنکھ بچا کر ایک آدھ چمچہ یوں بھی منہ میں ڈال لیتے تھے۔ اس لیے انھیں "قند الکہلا" کا خطاب عطا ہوا۔ پھر چونکہ پورا خطاب زبان سے ادا کرنا بھی کاہلی کے خلاف سمجھا گیا، اس لیے تخفیف کر کے یہ حضرات محض "مدل" "قندل" وغیرہ ہو کے رہ گئے۔

انجمن کے اجلاس شام کے نو بجے سے صبح کے تین بجے تک ہوتے تھے۔ "اجلاس" اس حالت کا نام تھا کہ اراکینِ عظام اپنے اپنے تکیے پر سر رکھے خاموش لیٹے ہیں۔ کاہلی کے معنی خوابِ غفلت کے نہیں تھے۔ اس لیے اجلاس کے دوران میں سونا ممنوع تھا۔ اگر اجلاس ہو رہا ہو، تو رکن لیٹ سکتا تھا یا پھر کھڑا ہو سکتا تھا، بیٹھنا سخت ترین جرم تھا، کیونکہ یہ فعل کاہلی کے سراسر منافی تھا۔ اگر کوئی صاحب اس جرم کے مرتکب ہوتے، تو انھیں یہ سزا دی جاتی کہ وہ تمام دوسرے اراکین کی خدمت بجا لائیں مثلاً پانی پلانا، پان کھلانا، اگالدان اٹھا کے دینا، چلم بھرنا وغیرہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب کوئی "کاہل" اجلاس کے دوران میں "دار الکہلا" میں تشریف لاتے، تو چونکہ بیٹھنا ممنوع تھا اس لیے وہ کھڑے کھڑے جسم تولتے اور دھڑ سے اپنے تکیے پر گر پڑتے۔

روزانہ کاہلی کے عجیب و غریب واقعات پیش آتے تھے۔ ایک دن "اُم الکھلا" لیٹے حقہ پی رہے تھے۔ کسی "کاہل" کا ہاتھ جو لگا تو چلم ان کے اوپر الٹ گئی۔ لیکن مجال ہے، جو انھوں نے کسی تشویش کا اظہار کیا ہو۔ بس ایک کروٹ لی، انگارے ان کی چھاتی پر سے نیچے گر گئے، اور وہ اسی طرح اطمینان سے لیٹے رہے۔ لیکن جب "صدر" نے دیکھا کہ اس طرح فرش میں آگ لگ جانے کا خطرہ ہے، تو انھوں نے اجلاس ملتوی کر دیا۔ اس پر لوگ اٹھ دوڑے اور انگارے اٹھا کے بجھا دیے گئے۔

اجلاس میں وہ سب کچھ ہو سکتا تھا، جو تفریح کی ذیل میں آتا، بشرطیکہ اس سے کاہلی کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ نہ ہوتا۔ اور شعر و شاعری تو روزانہ ہوتی تھی۔ چونکہ لیٹے لیٹے شعر پڑھنا اور داد دینا مشکل تھا، اس لیے جب شعر کی ترنگ اٹھتی، تو کوئی رکن یہ تجویز پیش کر دیتا کہ اب تھوڑی دیر کے لیے شعر و شاعری کا دور ہو جائے، تو "صدر" اجلاس ملتوی کر دیتے، جس کے معنی یہ تھے کہ اب لوگ اٹھ کے بیٹھ سکتے ہیں۔ ماشاء اللہ سب اراکین سخنور یا کم از کم سخن سنج تو تھے ہی، ایک دوسرے سے مقابلے کے جوش میں طبیعت پر خوب زور دے کر شعر کہتے۔ ہر ایک شخص روزانہ اپنا تازہ کلام پیش کرتا۔ یہ فضا جگر صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کے چمکانے بلکہ ابھارنے میں بھی بہت مفید ثابت ہوئی۔ ان کی بعض مشہور اور بلند پایہ غزلیں اسی "دار الکھلا" کے دور میں کہی گئی تھیں۔ مثلاً حسبِ ذیل غزلیں اسی زمانے کی یادگار ہیں:

۱۔ جواب بھی نہ تکلیف فرمایئے گا

۲۔ نظر ملا کے، مرے پاس آ کے لوٹ لیا

۳۔ ہجومِ تجلّی سے معمور ہو کر

۴۔ عشق میں لاجواب ہیں ہم لوگ

۵۔ حسنِ معنی کی قسم، جلوۂ صورت کی قسم!

۶۔ دل حریفِ حالِ بحالی نہیں

۷۔ غمِ عاشقی کا صلا چاہتا ہوں

۸۔ محبت میں یہ کیا ستم دیکھتے ہیں!

۹۔ جب تک شبابِ عشق مکمل شباب ہے

۱۰۔ سنتا ہوں کہ ہر حال میں وہ دل کے قریں ہے

۱۱۔ تڑپ کر دل انھیں تڑپا رہا ہے

۱۲۔ دل کو جب دل سے راہ ہوتی ہے وغیرہ

بھوپال میں برسات کے موسم میں بارش بہت شدید ہوتی ہے۔ یہاں کا سالانہ اوسط غالباً ۵۰ انشی میٹر ہے۔ لیکن اس زمانے میں بھی جب موسلا دھار بارش گھنٹوں رہتی اور گھر سے باہر پاؤں رکھنا محال ہوتا، سب کے سب "کاہل" وقت کی پوری پابندی سے بلاناغہ دارالکہلا میں جمع ہوتے۔ ادھر نو بجنے کے قریب ہوئے کہ ہر ایک پانی میں چوہا بنا چلا آ رہا ہے۔ اب یہ "ناظمِ" کا فرض تھا کہ ان کے گیلے کپڑے اتروائے، اور ان کی جگہ خشک کپڑے مہیا کرے۔

یوں چھ مہینے تک ہر رات تین تین بجے تک کی غیر حاضری سے ان لوگوں کے گھروں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ جو اصحاب متاہل تھے، ان میں سے بعض کی بیویوں نے تو یہ باور کرنے سے انکار کر دیا کہ جگر کوئی شاعر ہے۔ جس کے پاس یہ حضرت جا کے بیٹھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہو نہ ہو، یہ موئی کوئی طوائف ہے، جس کے کوٹھے پہ جا کر تم لوگ روزانہ رنگ رلیاں مناتے ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متعدد اصحاب کو جگر کو ساتھ لے جا کے ان کی طلعتِ زیبا اپنی بیویوں کو دکھانا پڑی، تاکہ ان کا اطمینان ہو جائے۔

شہر کے لوگ جگر کو دعوتوں میں بلاتے تھے۔ اس سے نہ صرف انہی کا وقت ضائع ہوتا بلکہ ان کی غیر حاضری سے انجمن کی معمولی سرگرمیوں میں بھی بہت کمی، بلکہ بے لطفی ہو جاتی

تھی۔ کاہلوں کو یہ کسی عنوان منظور نہیں تھا۔ اس لیے غور و خوض کے بعد اس کا سدِ باب یوں کیا گیا کہ انجمن نے یہ قرارداد منظور کی کہ چونکہ دعوتوں سے عام طور پر کاہلی کے جذبے کو نقصان پہنچتا ہے، جس کی قربانی کسی صورت گوارا نہیں کی جاسکتی، اس لیے یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ آیندہ اگر کوئی صاحب "صدرِ ل" کو چاے یا کھانے کی دعوت دیں، تو ان کے ساتھ بقیہ سب ارا کین کو بھی مدعو کریں۔ یہی نہیں، بلکہ رات کے کھانے کی صورت میں، اس دن رات کا "اجلاس" بھی نو سے تین بجے تک میزبان صاحب ہی کے مکان پر منعقد ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ نہ صرف ان اصحاب کے اکل و شرب کا انتظام کریں، بلکہ ان کے لیٹنے اور اینڈنے کے لیے اپنے مکان کا ایک کمرہ بھی خالی کر دیں۔ بے شک، اس پابندی سے دعوتوں میں بہت کمی ہو گئی، لیکن پھر بھی کبھی کبھی کوئی منچلا یہ تمام شرائط قبول کر کے دعوت کر ہی دیتا۔

جب رات کے تین بجے، جلاس ختم ہوتا، تو اس سے پہلے بے دودھ کی چاے کا دَور چلتا، جو پیالیوں کی بجاے فنجانوں میں پی جاتی تھی۔

اس انجمن کا ایک گروپ فوٹو بھی لیا گیا تھا، جو یقیناً اب بھی اکثر "کاہلوں" کے پاس موجود ہو گا۔

اس انجمن کو درہم برہم ہوئے ایک زمانہ ہو گیا۔ جو نیک مقاصد سامنے رکھ کے یہ بنائی گئی تھی، افسوس، وہ تو پورے نہ ہوئے۔ دنیا کی اور بیشمار عمدہ تحریکیں بھی ناکام رہی ہیں اور سچ پوچھیے، تو اس دنیا نے ازل سے نیکوں کی قدر کہاں کی ہے! اس لیے محض ایک انجمن کا ماتم بیکار ہے۔ لیکن میں پورے وثوق سے کہ سکتا ہوں کہ اگر آج بھی کوئی اس طرح کی انجمن یا جماعت قائم ہو، جس کا طرۂ امتیاز "کاہلی" قرار پائے، تو اسے جگر صاحب سے زیادہ فعّال صدر میسّر نہیں آسکتا۔ سچ ہے، یہ خدا کی دین ہے۔

جگر مراد آبادی
ایں سعادت بزورِ بازو نیست

(۳)

جگر کا تعلق ایک علمی خاندان سے تھا۔ بزرگوں کا وطن دراصل دلی تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ مولوی محمد سمیع، شاہجہان کے استاد تھے۔ نہ جانے کس بات پر عتاب شاہی نازل ہوا اور وہ ترک وطن کر کے مراد آباد میں جا مقیم ہوئے۔ جگر کو شاعری گویا ورثے میں ملی۔ دادا حافظ محمد نور شاعر تھے، نورؔ تخلص تھا۔ والد مرحوم مولوی بزاگ علی بھی شاعر تھے، نظر تخلص کرتے اور ناسخ کے شاگرد رشید وزیر لکھنوی سے مشورہ کرتے تھے۔ خود جگر نے ابتدا میں چندے منشی حیات بخش رسا کو کلام دکھایا، لیکن پھر داغ سے رجوع کیا، جو رسا کے بھی استاد تھے۔ داغ کی وفات (۱۹۰۵) کے بعد کچھ دن منشی امیر اللہ تسلیم سے بھی اصلاح لی۔

جگر کی ایک خصوصیت قابل تعریف ہے۔ انھوں نے غزل کے سوا کچھ نہیں کہا؛ بلکہ عین ممکن ہے کہ اگر وہ کچھ اور کہتے تو اس میں اس حد تک کامیاب بھی نہ ہوتے۔ چونکہ ان کی افتاد طبع تھی بھی غزل کے مناسب حال، اس لیے ان کا کسی اور صنف سخن پر توجہ کرنا گویا اپنی صلاحیتوں کے غلط استعمال کے مرادف ہوتا۔ ان کا اپنے آپ کو غزل سے مخصوص کر لینا، ان کے لیے بھی اچھا رہا اور غزل کے لیے بھی۔ اس میں شک نہیں کہ اردو میں غزل اتنی ہی پرانی ہے، جتنی خود یہ زبان۔ بظاہر اب اس میں کوئی جدت اور تازگی ممکن نہیں کیونکہ کونسا وہ مضمون یا موضوع ہے، جسے متقدمین بیان نہ کر گئے ہوں پس اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جگر کا کلام بھی وہی پرانے رنگ کی چیز ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان کا اسلوب اور لب و لہجہ اور رس بس خاص ان کی چیز ہے۔ اور چونکہ زمانے کا مذاق بدل گیا ہے۔ خود غزل کی ہیئت زبان اور موضوع بلکہ مقصد تک سے متعلق نئے نئے تجربے ہونے لگے ہیں، اس لیے اب یہ توقع

کرنا کہ پھر کوئی جگر کا سا غزل گو شاعر پیدا ہوگا، امید موہوم سے زیادہ نہیں۔

ان کے کلام میں دو مختلف رنگوں کا امتزاج ہے۔ جرأت اور داغ کی مادیت بھی ہے اور مومن کی معنویت بھی۔ جگر کا مزاج ان تینوں سے ملتا جلتا ہے۔ جرأت اور داغ نے عشق جسمانی کی جو تصویریں اپنے کلام میں پیش کی ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ان کے ہاں کوئی پیچیدگی نہیں، وہی روزمرہ کی باتیں ہیں، جو آئے دن ہم میں سے ہر ایک کے تجربے میں آتی رہتی ہیں۔ جگر نے ان دونوں پر یقیناً ترقی کی ہے، ایسی کہ بسا اوقات پڑھنے والے کا ذہن شعر کی مادیت کا پوری طرح احاطہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں ان دونوں کی سی صاف عریانی نہیں، بلکہ وہ اکثر اپنا مدعا ایسا پردے اور مرک سے بیان کر جاتے ہیں کہ انسان پر اس کی عارضی ہیجانیت اور ربش یا افتادگی تک گراں نہیں گزرتی اور وہ اس پر خاص توجہ دیے بغیر آگے گزر جاتا ہے۔

مومن کے ہاں حسن و عشق کی تصویریں زیادہ گہرے رنگ میں ہیں اور ان سے لطف اندوز ہونا ہر کسی کے اختیار میں نہیں۔ ان کے کلام سے پوری طرح لذت یاب ہونے کے لیے لازم ہے کہ نہ صرف قاری کے ذہن کی تربیت ایک خاص فکری ماحول میں ہوئی ہو، بلکہ اس نے "فسق و فجور" کا کچھ نظری یا عملی تجربہ بھی کیا ہو۔ مومن نے زمانۂ ہجر و وصال کی مختلف وارداتوں اور لاگ اور لگاوٹ کی گوناگوں کیفیتوں کا جو نفسیاتی نقشہ پیش کیا ہے، اس کا جواب نہیں۔ لیکن چونکہ ان کے ہاں ایک خاص طرح کا لفظی اشکال ہے، اور اس کا تعلق فی الاصل بیشتر ان کے لہجے سے ہو، جس سے بات فوراً سمجھ میں نہیں آتی، اسی لیے قاری اس کی معنویت تک پہنچنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ حقیقت میں یہی وجہ ہوئی کہ مومن نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ چونکہ جگر نے مدتوں رندی اور ہوسناکی کے کوچوں کی خاک چھانی تھی، اس لیے وہ ان مضامین کے ادا کرنے میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں، جو مومن کا طرۂ امتیاز ہیں۔ نہ صرف یہی، بلکہ ان کے ہاں لفظی اشکال نام کو نہیں،

ان کی بات فوراً ہر ایک کی سمجھ میں بھی آجاتی ہے۔

شراب کے مضامین جنھیں خمریات کا نام دیا گیا ہے، جیسے کچھ ان کے کلام میں بیان ہوئے ہیں، آپ کو اردو میں بہت کم کسی اور شاعر کے ہاں ملینگے۔ ریاض خیر آبادی کے خمریات مشہور ہیں۔ لوگ داغ کی بھی اس باب میں تعریف کرتے ہیں، حالانکہ ایمان کی بات یہ ہے کہ ریاض اور داغ دونوں کے ہاں حد درجہ سطحیت ہے۔ میں ان دونوں کی قادر الکلامی کا انکار نہیں کر رہا ہوں۔ دونوں استاد ہیں، اور زبان کی رنگینی اور شوخی میں تو ان کا جواب نہیں۔ لیکن یہاں گفتگو خمریات سے ہو۔ فقرہ چست کر دینا، یا پھبتی کہ لینا اور بات ہے، اور سرخوشی کے عالم میں بھی اپنے اندرونی احساسات اور دلی تاثرات کا بیان الگ چیز ہے۔ وہ کیفیت اور سرور جو صرف ایک رندِ میکش ہی محسوس کر سکتا ہے، نہ ریاض کے بس کی بات ہے، نہ داغ کی۔ کیونکہ کبھی ایک قطرہ بھی ان دونوں کے حلق سے نیچے نہیں گئی۔ اس پہلو سے جو مزہ جگرؔ اور جوشؔ کے کلام میں ہے، وہ آپ کو اور کہیں نہیں ملیگا۔ غالب بھی شاذ و نادر جب کبھی اس طرح کے مضامین لکھتا ہے، تو ڈوب کر، اور اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ کبھی سنی سنائی باتیں نہیں لکھتا، بلکہ ذاتی واردات بیان کرتا ہے۔

بیشک یہ ضروری نہیں کہ انسان جو لذت محسوس کرے، اسے ہمیشہ بیان کر لینے پر بھی قادر ہو۔ کئی لطیف جذبات اور احساسات ایسے ہوتے ہیں کہ زبان ان کے کامل اظہار سے قاصر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ آپ کو عجزِ بیان کی مثالیں شراب پینے والوں کے ہاں بھی مل جائینگی۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوگا کہ انسان نے کسی کیفیت کا سرے سے کبھی تجربہ کیا ہی نہ ہو اور وہ اسے کما حقہٗ بیان کر سکے۔

میں نے بارہا جگرؔ کو شعر کہتے، بلکہ پوری پوری غزلیں کہتے دیکھا۔ آپ نے وہ داغ کا شعر جھنے کا لطیفہ تو ضرور سنا ہوگا، جگرؔ کو کبھی اس طرح کا تجربہ نہیں ہوا۔ احباب کا مجمع

ہے ، مجلس جمی ہوئی ہے ، لطیفے اور ہنسی مذاق کی گفتگو ہے ، فقرے بازی اور گلچھرّے ہو رہی ہے کہ کسی نے کہا : "جگر صاحب ، اس مصرع پر مصرع یا شعر پر شعر تو کہیے ۔" اگر ان کی طبیعت کسی وجہ سے بالکل ہی غیر حاضر نہیں ، تو انھیں گرہ لگانے یا شعر کہنے میں کبھی کوئی تکلف نہیں ہوا اور اگر مجمع واقعی معقول لوگوں کا ہوا ، تو انھوں نے غزل بھی پوری کر لی ۔

انھیں درست مشورہ تک قبول کر لینے میں کبھی عذر نہیں ہوتا تھا ۔ مثلاً ان کا ایک شعر ہے :

"عرضِ غم نہ کر ، اے دل !" دیکھ ، ہم نہ کہتے تھے
رہ گئے وہ اونھ کر کے ، سُن لیا جواب اُن کا !

پہلے مصرعِ ثانی میں "اونھ کہہ کر" تھا ۔ ایک دن وہ یہ غزل سنا رہے تھے ، تو میں نے اُن سے کہا کہ اس کی جگہ "اونھ کر کے" بنا دیجیے ۔ کہنے لگے : وجہ ؟ میں نے جواب دیا کہ "اونھ" کوئی مستقل کلمہ نہیں ، جس کے لیے "کہنا" کہا جائے ، بلکہ یہ ایک آواز ہے ، اس کے لیے "کرنا" ہی مناسب ہے ۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے اس کے بعد جوشؔ سے بھی اس کا ذکر کیا تھا ۔ جوشؔ نے میری تائید کی ، اس پر انھوں نے "اونھ کر کے" بنا دیا ۔

اسی طرح ایک اور موقع پر (شعر اس وقت مجھے یاد نہیں) میرے کہنے پر انھوں نے "اچھلنا" کی جگہ "ابھرنا" بنا دیا ۔ اس ہرزہ گوئی سے خودستائی مقصود نہیں ، بلکہ مدّعا یہ ہے کہ باوجود صفِ اول کا غزل گو اور شاعر ہونے کے ان میں وہ غلط پندار نہیں تھا ، جو ہمارے بعض "اساتذہ" کا نمایاں شعار ہے ۔

۶

میں ۱۹۳۸ء کے اوائل میں دلّی سے اور اگلے برس ملک ہی سے باہر چلا گیا اور ایک لمبے عرصے تک باہر رہا ۔ ملک کی آزادی اور تقسیم میری غیر حاضری میں عمل میں آئی ۔ اس زمانے میں جگرؔ سے براہِ راست تعلقات منقطع ہو گئے (یوں بھی وہ خط و کتابت کے زیادہ عادی نہیں تھے) البتہ سنتا رہا کہ اب بفضلہٖ انھوں نے شراب سے توبہ کر لی ہے ، اور بہت محتاط زندگی بسر کر رہے ہیں ۔

۱۹۵۳ء کے آغاز میں اچانک مجھے کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں منجملہ اور احباب کے محمود صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ کہنے لگے: جگر آج کل یہیں کراچی میں ہیں۔ میں نے کہا: چلیے، ان سے ملیں۔ شام کا وقت تھا کہ ہم دونوں ان کی قیامگاہ پر پہنچے۔ زینے پر چڑھتے ہوئے میں نے محمود صاحب سے کہا کہ آپ میرا نام نہ لیجیے گا، دیکھیں، پہچانتے ہیں یا نہیں۔ اوپر پہنچے تو دیکھا کہ جگر صاحب کرسی پر براجمان ہیں اور ارد گرد حسب معمول آٹھ دس آدمی کرسیوں اور مونڈھوں اور تخت پر بیٹھے ہیں۔ بجلی کی روشنی اچھی خاصی تیز تھی۔ محمود صاحب سے علیک سلیک ہوئی۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ سر کو کوئی (۳۰) درجے داہنی جانب جھکا کر چندھیائی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ پیشانی کے بل کہہ رہے تھے کہ حافظے کے منفی اور مثبت تار تیزی سے جمع ہو رہے ہیں۔ بارے، دیر نہیں لگی "ارے، مالک رام ہیں!" کہہ کے کھڑے ہو گئے۔ تپاک سے معانقہ کیا اور پوچھا: "بھائی، بہت دن کے بعد ملے۔ کہو کیسے ہو؟" میں نے کہا: "صاحب، داد دیتا ہوں آپ کے حافظے کی کہ چودہ پندرہ برس کے بعد یوں آسانی سے پہچان لیا، حالانکہ وہ عالم اور تھا اور اب اور ہے۔" کہنے لگے: "اس میں کسی حد تک آپ بھی معاون ثابت ہوئے۔ آخر انسان کی شخصیت اتنی جاندار تو ہو اور وہ اتنا پائیدار اثر تو چھوڑ جائے کہ دوسرا شخص چاہے بھی، تو اسے بھلا نہ سکے۔" چونکہ میں جانتا تھا کہ جگر تملق کے روادار نہیں اور لوگوں کی بیجا مدح اُن کا شعار نہیں، اس لیے ان کی اس بات سے مجھے خوشی محسوس ہوئی۔

میں اواخر ۱۹۵۴ء سے مارچ ۱۹۵۸ء تک ہندستان میں رہا تھا۔ ان تین برس میں ان سے کئی مرتبہ ملاقات ہوئی، یہاں دلّی میں بھی اور باہر بھی۔ آخری ملاقات ۱۹۵۷ء میں میرٹھ میں حکیم سیف الدین احمد سلمہٗ کے مکان پر ہوئی۔ اس زمانے میں میرے ایک بزرگ میرٹھ میں مقیم تھے؛ میں ان سے ملنے کو اکثر وہاں جایا کرتا تھا۔ ایک دن میں دوپہر کے کھانے پر حکیم صاحب کے ہاں مدعو تھا۔ کھانے کے بعد حکیم صاحب اور تسکین قریشی

مرحوم اور میں بیٹھے گپ کر رہے تھے کہ جگر صاحب بغیر کسی سابقہ اطلاع کے اچانک پہنچ گئے۔ فرمایا: میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے بمبئی گیا تھا۔ واپسی کے لیے جب اسٹیشن پہونچا، تو جی میں آئی کہ آپ سے بھی ملتا جاؤں۔

بالعموم جگر کے یہاں خیال اور عمل بیک وقت ہوتا تھا، یعنی کوئی بات اُن کے ذہن میں آئی، تو پھر اس پر فوراً بلا توقف عمل کرتے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا۔ حکیم صاحب سے ملنے کے خیال کا آنا تھا کہ انھوں نے بڑھ کر کھڑکی سے میرٹھ کا ٹکٹ خرید لیا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ حکیم سیف سے ان کے حد درجہ مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات تھے، اور حکیم صاحب بھی ان کی خدمت کر کے دلی مسرت محسوس کرتے تھے۔

وہ میرٹھ میں دو دن رُکے اور وہاں سے گونڈہ چلے گئے۔ اس کے بعد پھر اُن سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔

مارچ ۱۹۵۰ء میں ان پر پہلی مرتبہ دل کا دورہ پڑا۔ وہ اس حملے سے جانبر تو ہو گئے، لیکن اس کے بعد ان کا کہیں باہر جانا آنا قطعاً بند ہو گیا، اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد یہ دورے پڑتے رہے۔ بالآخر اسی "بیماریٔ دل" سے وہ ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء صبح کے وقت اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے:۔

دل کو سکون، روح کو آرام آ گیا
موت آ گئی کہ یار کا پیغام آ گیا

جگر کی شخصیت بڑی پیاری اور دل آویز تھی۔ دل کے صاف، زبان کے کھرے، وہ کسی کے بُرے میں نہیں تھے۔ میں نے کبھی کسی کی غیبت ان کی زبان سے نہیں سنی۔ صرف یہی نہیں۔ وہ دوسرے کے صریح نقص کی جگہ بھی اس کی خوبیوں کا بیان کرنے لگتے۔ بلکہ کبھی کبھی وہ دوسرے کے نقص کی ایسی توجیہہ کرتے کہ وہ نقص ظاہر میں کم دکھائی دینے لگتا۔ ہمارے ایک شاعر دوست عقیدے کے لحاظ سے دہریے ہیں۔ وہ پوری بیباکی سے

جا و بیجا اپنے عقیدے کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں اور انھوں نے نظم و نثر میں بھی اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے۔ ایک مرتبہ جگر سے ان سے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے کہا: کاش ان کی زندگی کا کم از کم یہ پہلو ہی درست ہوتا۔ کہنے لگے: بھائی، دلوں کے بھید جاننے والا تو خدا ہے، لیکن جس تحدّی اور شدّت سے وہ اپنے الحاد کا اظہار کرتے ہیں، اس سے مجھے شبہہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں چور ہے اور وہ واقعی ایسے نہیں۔ آپ جانتے ہیں، بعض طبیعتیں کسی کے سامنے بھی سر جھکانے میں عار محسوس کرتی ہیں۔ کسے باشد' ان کے لیے کسی کی اطاعت قبول کرنا، ہتک کے ہم معنی ہے۔ وہ جدّی پٹھان ہیں' اور ان کے باپ دادا کی سرکشی اور شورہ پشتی کے واقعات آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ پس' وہ خدا کی خدائی تسلیم کرنے میں بھی اپنی توہین سمجھتے ہیں، حال آنکہ دل سے وہ ملحد نہیں۔

اس بات کو جانے دیجیے کہ ان کی تاویل درست ہے کہ نہیں۔ بلکہ اصلیت یہ ہے کہ غلط ہے کیونکہ میں یقین سے جانتا ہوں کہ ان کا استدلال مضبوط نہیں اور وہ صاحب بھی واقعی ملحد ہیں اور اس کے اعلان میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ان کے اس قول سے خود جگر کی سیرت اور کردار کا جو رُخ ہمارے سامنے آتا ہے، وہ کتنا دلکش ہے۔

اسمائے حسنیٰ میں ستّار اور غفّار بھی ہیں۔ اگر یہ سچ ہے کہ انسان کا مطمح نظر یہی ہونا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو خدائی رنگ میں رنگ لے (وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً) تو اس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ان دونوں خدائی صفات کو بھی اپنی زندگی کا جزو بنانے کی کوشش کرے۔ اگر ہم دوسروں کے عیوب کی بجائے ان کی خوبیوں پر نظر رکھیں، تو یہ دنیا کتنی حسین بن جائے۔

بے عیب ذات خدا کی ہے۔ جگر صاحب میں بھی کمزوریاں تھیں، لیکن ان کی خوبیوں کے

مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی، اور یہ تو ارشادِ خداوندی ہے کہ نیکیاں بدیوں کو محو کر دیتی ہیں۔ پس میں یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی شخص جگر کا دشمن ہو سکتا ہے۔ بلکہ میرا یقین تھا کہ کوئی شخص انھیں جتنا بھی قریب سے دیکھیگا، اتنا ہی اُن سے محبت کریگا:

وہ حلم، وہ تواضع، وہ طرزِ خود فراموشی
خدا بخشے جگر کو، لاکھ انسانوں کا انساں تھا

نیاز اور نیاز مند

چالیس؎ برس کا زمانہ تھوڑا نہیں ہوتا۔ کہنے کو دو لفظ ہیں، لیکن جب پیچھے مڑ کر ۱۹۲۴ء کو یاد کرتا ہوں، تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا وہ کوئی اور دنیا تھی اور اب یہ ۱۹۷۳ء کی بھی کوئی اور دنیا ہے۔

یہی سولہ سترہ برس کا میرا سن تھا جب میں نے ۱۹۲۴ء کے اوائل میں وزیر آباد سے انگریزی کے دسویں درجے (میٹریکولیشن) کی سند لے کر گورنمنٹ کالج، گجرات میں داخلہ لے لیا۔ میں یہاں بوجوہ کالج ہوسٹل میں نہ رہ سکا۔ اس لیے رہنے کو شہر میں ایک کمرہ کرایے پر لینا پڑا۔ میرے مسکن سے تھوڑی دور، کالج کے راستے میں، ایک صاحب محمد یوسف کی کپڑے کی دکان تھی۔ اسم بامسمّٰی، گورے چٹے جوان، ۲۸۔۔۳۰ برس کی عمر، تعلیم تو واجبی تھی، لیکن آدمی بہت ذہین تھے۔ شعر بھی کہتے تھے، یوسف تخلص تھا، اور چونکہ سیماب اکبرآبادی سے تلمّذ تھا، اس لیے اپنے آپ کو یوسف سیمابی لکھتے تھے۔

؎ یہ مضمون نیاز فتحپوری کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

میرے ملنے والوں میں ایک صاحب تھے، عنایت اللہ اسد۔ میری ہی عمر کے، شاید ایک آدھ برس کا تفاوت ہو۔ ان کے ذریعے میرا یوسف صاحب سے تعارف ہو گیا۔ یوسف صاحب بڑے یار باش آدمی تھے۔ روزانہ عصر کے وقت ان کی دکان پر گویا جلسہ ہوتا۔ ان میں سے بیشتر شاعر تھے، بقیہ کو محض سننے کا شوق تھا۔ بالعموم یہ ہنگامہ چراغ جلنے کے بعد تک رہتا۔ اس دوران میں یوسف صاحب بالعموم حاضرین کی چائے پانی سے بھی کچھ خاطر مدارات کرتے۔ آخر جب دکان بڑھانے کا وقت ہوتا، تو دوست احباب اپنے اپنے گھر کی راہ لیتے، اور یوسف صاحب دکان بند کر کے اپنے گھر کو روانہ ہو جاتے۔ یہ ان کا گرمی سردی، بارہ مہینے کا معمول تھا۔ ظاہر ہے کہ جہاں اس قماش کے دنیا جہان کے بے فکرے جمع ہوں گے، وہاں کوئی گاہک کیوں آنے لگا۔ نتیجہ وہی نکلا جس کی کسی عقل کے اندھے کو بھی توقع ہو سکتی تھی۔ یوسف صاحب نے دو ہی برس میں بزرگوں کی جمع جتھا یار دوستوں پر اڑا دی اور دکان میں تالا پڑ گیا۔ اب سوچتا ہوں، تو یوں خیال ہوتا ہے کہ شاید دکان کا تو محض بہانہ تھا۔ یوسف صاحب نے یہ دوستوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے لیے ایک اڈے کا انتظام کر رکھا تھا، ورنہ تجارت کا انھیں تجربہ تھا، نہ سلیقہ:

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

خیر، آمدم برسرِ مطلب۔ یوسف صاحب بہت سے اخبار رسالے بھی منگواتے تھے۔ معارف، زمانہ، پیمانہ، نگار، ہفتہ وار ریاست، اور جب اسی سال نیرنگ خیال چھپنا شروع ہوا، تو یہ بھی۔ وہ اور بھی کئی رسالوں کے خریدار تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ بعض لوگ تو صرف ان پرچوں کے پڑھنے کے لیے ان کے ہاں آتے تھے، جیسے یہ دکان نہیں، کوئی دارالمطالعہ ہو۔ ایک دن میں نے وہاں نگار کا کوئی شمارہ دیکھا، تو اسے پڑھنے کو اٹھا لایا۔

میں نے جب نگار کا یہ شمارہ دیکھا، تو پہلی ہی نظر میں اس کا گرویدہ ہو گیا۔ مضمون ایک سے ایک بڑھ کر، اعلیٰ معیار کا، بڑھیا دبیز کاغذ، کتابت، طباعت بہت اچھی "عروسِ جمیل و لباسِ حریر" کا مصداق۔ جی نے کہا، یہ تو پڑھنے، بلکہ رکھنے کی چیز ہے۔ میری طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ طفیلی بن کر ہر مہینے پرچہ یوسف صاحب سے مستعار لوں۔ اگلے دن میں نے پہلا کام یہ کیا کہ پانچ روپے چندہ بھیج کر اپنا نام خریداروں میں لکھوا لیا اور پچھلے دو برس کے پرچے بھی منگوا لیے۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب نگار بھوپال سے شائع ہوتا تھا، اور اس پہ مدیرِ مسئول کا نام "رئیس التحریر نیاز فتحپوری" چھپتا تھا۔

یہ تھا میرا تعارف نیاز صاحب سے!

میری ابتدائی تعلیم جس نہج پر اور جس ماحول میں ہوئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اُردو، فارسی اور اسلامیات سے بچپن ہی میں شغف پیدا ہو گیا تھا۔ اگر خود ستائی کا مجرم نہ گردانا جاؤں، تو کہہ سکتا ہوں کہ فارسی نظم و نثر کا اچھا خاصا حصہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں میری نظر سے گزر چکا تھا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس دور میں نیاز صاحب کی تحریریں کتنی مشکل اور فارسی ترکیبوں سے بوجھل ہوتی تھیں۔ لیکن مجھے ان کے پڑھنے اور سمجھنے میں دقت نہیں ہوئی، بلکہ یہ امرِ واقع ہے کہ ان کے پڑھنے سے فرحت محسوس ہوتی تھی۔

ہائی اسکول میں میرے ایک ہم سبق دوست ملک احمد حسن رہتاسی (مرحوم) تھے، جو بعد کو بہت دن تک ہفتہ وار "دورِ جدید" (لاہور) کے ایڈیٹر بھی رہے۔ خدا اُن کی مغفرت کرے، وہ بھی میری طرح اردو فارسی اور خاص طور پر شعر کے رسیا تھے۔ ہم دونوں کا دانت کاٹی روٹی والا معاملہ تھا۔ وہ احمدی تھے۔ ان کی بدولت مجھے اسلام سے متعلق بہت وسیع مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ نہ جانے وہ میرے لیے کہاں کہاں سے کتابیں ٹٹور کر لاتے تھے اور میں بڑی سے بڑی کتاب دو چار دن میں ختم کر کے واپس کر دیتا تھا۔ قدرتی

بات تھی کہ ہائی اسکول کی تعلیم ختم کرتے تک میری مذہبی واقفیت عموماً اور اسلامی واقفیت خصوصاً میری اپنی عمر کے طلبہ سے کہیں زیادہ تھی۔ اس زمانے میں نگار کے ہر پرچے میں نیاز صاحب کا اسلام اور قرآن سے متعلق کوئی نہ کوئی مضمون ضرور ہوتا تھا۔ ان مضامین کو دیکھ کر پہلی مرتبہ میرے دل میں براہ راست قرآن شریف پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس وقت تک اسلام سے متعلق میری تمام معلومات اردو کتابوں تک محدود تھی۔ عربی میں نے پڑھی نہیں تھی اور نہ مجھے اس کے حاصل کرنے کا کوئی موقع ہی میسّر آیا تھا۔
نیاز صاحب جس طرح قرآن کی تفسیر کرتے تھے، اس کی جدت اور عقلیت نے مجھے بہت متاثر کیا۔ چنانچہ ایک دن میں بازار سے مولوی نذیر احمد دہلوی کے ترجمے والا قرآن لے آیا۔ میں نے فرصت کے اوقات میں کوئی دس پندرہ دن میں یہ ترجمہ پڑھ ڈالا۔ اس کی زبان مجھے بہت پسند آئی اور میں نے اس کے بعض مقامات بار بار مطالعہ کیے۔ اس بات پر کم و بیش چالیس برس گزر چکے ہیں، لیکن مجھے آج تک اس ترجمے کے کچھ حصّے زبانی یاد ہیں۔
میں نے دیکھا کہ نیاز صاحب کا ترجمہ کئی مرتبہ مولوی نذیر احمد کے ترجمہ سے مختلف ہوتا ہے۔ رہا ان کی تعبیر و تفسیر کا انداز، تو یہ مولوی نذیر احمد تو رہے الگ، میرے اپنے تمام پہلے مطالعات و تصوّرات کے بھی خلاف تھا۔ اس کے بہت دن بعد جب میں نے سرسیّد کی تفسیر کے مطبوعہ اجزا دیکھے، تو میں نے محسوس کیا کہ نیاز صاحب اس سے ضرور متاثر ہوئے ہیں؛ دونوں کے سوچنے کا ڈھنگ تقریباً یکساں ہے۔
بہرحال ان کے یہ اسلامی مضامین مجھے بہت پسند آئے اور میں نے طے کر لیا کہ مجھے عربی پڑھنا چاہیے، اور اگر یہ نہ ہو سکے، تو کم از کم قرآن کو معنوں کے ساتھ کسی استاد سے سبقاً سبقاً ضرور پڑھنا چاہیے۔ میری یہ آخری آرزو دو برس بعد لاہور پہنچنے پر پوری ہوئی (۱۹۲۶-۱۹۲۸ء) اور پھر خدا نے ایسا سامان پیدا کر دیا کہ مجھے ایک زمانے تک مصر میں

قیام کرنا پڑا۔ یہاں میں نے عربی میں بھی کچھ شد بد پیدا کر لی۔

نگار کا باب الاستفسار اس کی خصوصیات بلکہ اولیات میں سے ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس پہلو سے کسی کو بھی اس کے تتبع کی شاید ہی جرأت ہو۔

یہ دوسری چیز تھی جس نے مجھے خاص طور پر اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ ہر مہینے ایک یا دو سوالوں کا جواب لکھتے تھے، لیکن اس میں تنوع کا یہ عالم تھا کہ علم و ادب کا شاید ہی کوئی گوشہ ان کی قلمرو سے رہ گیا ہو۔ شعر و ادب، تاریخ، تفسیر، حدیث، تصوف، فنونِ لطیفہ۔ غرض دنیا بھر کے موضوع۔ ان کی زد سے کوئی نہیں بچا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ میں ان سے بہت حد تک مرعوب ہو گیا، بلکہ یہ احساس آج تک رفع نہیں ہوا۔

اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں کہ آہستہ آہستہ نگار میرا محبوب ترین رسالہ بن گیا۔ جس مہینے اس کے پہنچنے میں دیر ہو جاتی یا پرچہ کہیں ڈاک میں گم ہو جاتا، تو میں بےچین ہو جاتا، اور جب تک پرچہ دیکھنے کو نہ ملتا، یوں معلوم ہوتا، جیسے زندگی کے معمول میں کوئی ناقابل برداشت خلا پیدا ہو گیا ہے۔

انسانی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنی پسند کی چیز کی نوک پلک سنوارنے میں لگا رہتا ہے۔ یہی نگار کے سلسلے میں میرے ساتھ ہوا۔ جن لوگوں نے اس زمانے کا نگار دیکھا ہے انھیں یاد ہو گا کہ اس کے سرورق پر خطِ نستعلیق میں نگار کے علاوہ بہت کچھ اور عبارت بھی ہوتی تھی مثلاً "اردو کا علمی و ادبی مجلہ"، مقام اشاعت، قیمت، مدیر کا نام وغیرہ (یہ محض حافظے کی مدد سے لکھ رہا ہوں۔ ممکن ہے، جزئیات میں کچھ اختلاف ہو) مجھے سرورق پر اتنی عبارت اور تفصیل سخت ناپسند تھی:

مشاطہ را بگو کہ براسبابِ حسنِ یار
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید

چنانچہ ایک دن میں نے دل کڑا کر کے نیاز صاحب کو خط لکھا کہ حضرت! یہ تمام عبارت غیر ضروری ہے۔

سرورق پر صرف لفظ "نگار" رہے اور بس۔ آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے، جب انھوں نے میری تجویز پر صاد کیا اور اس کے بعد اس کا سرورق اس طرح ہو گیا، جیسا کہ بعد کو اکثر اصحاب نے دیکھا ہوگا۔

خود مجھے لکھنے کی طرف توجہ بھی نگار کے مطالعے اور نیاز صاحب کی تحریروں سے ہوئی۔ میں نے شروع میں ایک آدھ چیز انگریزی سے ترجمہ کی اور خود بھی لکھی۔ لیکن مجھے انھیں نگار میں اشاعت کے لیے بھیجنے کی جرأت نہ ہوئی۔ غالباً ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا ایک مضمون "غالب کی ذہنیت" کے عنوان سے دو قسطوں میں نگار میں شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے کہیں کہیں غالب پر نکتہ چینی کی تھی۔ اس پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ کئی اصحاب نے اس مضمون کے بعض حصّوں پر سخت اعتراض کیا اور ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اس سلسلے میں ایک مختصر مضمون میں نے بھی "غالب اور ذوق" کے عنوان سے لکھا اور بڑی حیص بیص اور تامّل کے بعد اسے نیاز صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔ چند ماہ بعد یہ ۱۹۲۶ء کے کسی شمارے میں چھپا تھا۔ یہ میرا پہلا مضمون ہے جو نگار میں چھپا، اور غالب سے متعلق بھی یہ میرا پہلا مضمون تھا۔ اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً میرے کچھ مضمون نگار میں شائع ہوئے، جن میں سے بعض میں نے خود نیاز صاحب ہی کی فرمائش پر قلمبند کیے، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنی تحریروں کو نگار میں اشاعت کے لیے بھیجنے پر میں اپنے آپ کو کبھی آمادہ نہیں کر سکا۔

۱۹۲۶ء میں انٹرمیڈیٹ میں کامیابی کے بعد میں مزید تعلیم کے لیے لاہور چلا آیا۔ یہاں میں نے (جیسا کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں) قرآن کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ سبق کے وقت میری اپنے استاد سے بڑی بحث ہوا کرتی تھی۔ نگار کے طویل مطالعے کے باعث میرا اسلامی مسائل سے متعلق سوچنے کا انداز ہی کچھ اور طرح کا ہو گیا تھا۔ سبق میں جہاں کہیں کوئی ایسا موضوع آ جاتا، جس سے متعلق میں نگار میں کوئی مضمون پڑھ چکا تھا، تو فوراً سوال

کر بیٹھتا۔ بخاری صاحب کچھ جواب دے دیتے۔ خیال کرتے ہونگے کہ اس کی تشفی کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ میں اس پر جرح شروع کر دیتا۔ وہ پہلے تو طرح دیتے کہ بات نہ بڑھنے پائے، اس لیے کچھ ادھر اُدھر کی بات کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے۔ لیکن جب دیکھتے کہ میں بال کی کھال نکالے بغیر ٹلنے کا نہیں، تو کتاب بند کر دیتے اور ہنس کر فرماتے: اچھا صاحب! یہ بتائیے کہ آپ مجھ سے پڑھنے کو آتے ہیں یا مجھے پڑھانے کو۔ لیکن سو آفرین ہے ان کے صبر و تحمل کو کہ وہ میرے بحثنے بلکہ کٹ حجتی تک کرنے پر کبھی ناراض نہیں ہوئے؛ خندہ پیشانی سے میری سنتے اور مسکرا مسکرا کر جواب دینے کی کوشش کرتے۔ افسوس کہ میں قریب نصف قرآن سے زیادہ ان سے نہ پڑھ سکا اور باقی مجھے اپنے طور پر مترجم نسخے کی مدد سے پورا کرنا پڑا۔ لیکن میں ان کا احسان بھول نہیں سکتا کہ کم فرصتی کے باوجود انھوں نے سال ڈیڑھ سال میرے ساتھ گزارا کیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

اب میں تعلیم سے فارغ ہو چکا ۔ یہ ۱۹۳۲ء شاید ۱۹۳۳ء کی بات ہے۔ میں نے مطالعے کے اثنا میں محسوس کیا کہ قرآن میں عورت کی زندگی سے متعلق بہت تفصیلی تعلیم دی گئی ہے؛ لیکن یہ کسی ایک مقام پر نہیں، بلکہ مختلف سورتوں میں منتشر حالت میں ملتی ہے۔ جی میں آئی کہ کیوں نہ اسے یکجا کر کے اس پر ایک مضمون لکھا جائے۔ میں نے نیاز صاحب کو اپنے اس ارادے کی اطلاع دی اور یہ بھی درخواست کی کہ اگر ہو سکے تو عنوانات مقرر کر دیجیے، جن کی روشنی میں یہ مضمون مرتب کروں۔ انھوں نے جواب دیا کہ فہرستِ عنوانات خود تیار کیجیے۔ اس سے چند مہینے پہلے رسالہ جامعہ (دلی) میں کسی کا ایک مضمون اس موضوع پر شائع ہوا تھا۔ انھوں نے اسے دیکھنے کی بھی ہدایت کی۔ غرض میں نے عنوان مقرر کر کے ان کی خدمت میں بھیج دیے۔ انھوں نے ان سے اتفاق کیا اور فرمایا کہ جب مضمون مکمل ہو جائے، تو اسے نگار میں اشاعت کے لیے بھیج دیجیے۔

میں نے شروع سے یہ طے کر لیا کہ اساسی طور پر تمام مسائل کا استخراج قرآن سے کروں گا، اور

حدیث محض نفس کی تشریح اور توضیح کے لیے پیش کرونگا اور یہ بھی تا بحدِ امکان بخاری اور مسلم سے یا زیادہ سے زیادہ صحاح ستہ سے۔ اتنی پابندیوں کے باوجود لکھنے بیٹھا، تو بات سے بات پیدا ہونے لگی، اور وہ جو خیال تھا کہ پورا مقالہ رسالے میں دو یا تین قسطوں میں چھپ جائیگا، کسی طرح درست ہوتا نظر نہ آیا۔ جب مضمون خلافِ توقع لمبا ہونے لگا، تو میں نے پھر لکھا کہ یہ تو میرے اندازے سے بہت طویل ہوگیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس کی فکر نہ کریں، جو جی میں آئے، اسے قلم بند کر ڈالیں، ترمیم بعد کو کر لیجیے گا۔ قصہ کوتاہ، میں نے کوئی سوسوا سو صفحے میں اسے ختم کیا اور مسودہ ان کی خدمت میں بھیج دیا۔

نیاز صاحب نے پورا مضمون دیکھا، اور اسے واپس کرتے ہوئے لکھا کہ بعض مسائل پر مزید غور و خوض درکار ہے مثلاً مجھے یاد ہے کہ انھوں نے متعہ سے متعلق لکھا تھا کہ شیعی نقطۂ نگاہ معلوم کرنے کے لیے فلاں فلاں کتاب کا مطالعہ کر لو۔ جب مسودہ واپس آگیا تو میں نے اُن سے اجازت لے کر اسے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم (مدیر معارف) کی خدمت میں پیش کیا۔ میں چاہتا تھا کہ اگر حسن اتفاق سے یہ رسالہ شائع کر سکوں، تو کم از کم اس میں کوئی ایسی غلطی نہ رہ جائے، جو کسی بنیادی اسلامی تعلیم کے خلاف ہو۔ مرحوم نے میری توقع سے کہیں بڑھ کر مضمون کی تعریف کی، بلکہ یہاں تک لکھا کہ اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ مضمون کس کا لکھا ہوا ہے، تو میں اسے پڑھ کر یہی خیال کرتا کہ یہ کسی مسلمان عالم نے لکھا ہے۔ نفسِ مضمون سے متعلق انھوں نے فرمایا کہ بعض مسائل سے متعلق مجھے آپ سے اختلاف ہے۔ اس پر میں نے درخواست کی کہ یا تو مسودے کے حاشیے میں اشارہ کر دیجیے، یا خط میں تحریر فرمائیے، تاکہ میں استفادہ کر سکوں۔ انھوں نے فرمایا کہ نہیں، اس کی ضرورت نہیں! اگر ملاقات ہوگی، تو تفصیل سے گفتگو کرینگے۔ مجھے بھی کوئی عجلت نہیں تھی اور اس کے علاوہ

زندگی کے اور جھمیلے بھی تھے:

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبّت کے سوا

میں نے لکھ دیا کہ بہت اچھا، مسودہ اپنے پاس ہی رہنے دیجیے؛ جب ملیں گے تو بات چیت کرنے کے بعد اسے واپس لے لوں گا۔ اتفاق دیکھیے کہ اس کے بعد ان سے ملاقات ہوئی بھی، لیکن ایسی صورت میں کہ تفصیلی گفتگو کا موقع نہ ملا۔ پھر میں ۱۹۳۹ء میں ہندستان سے باہر چلا گیا، تو انھوں نے لکھا کہ آپ کا مسوّدہ میرے پاس امانت پڑا ہے، اسے جہاں کہیں، وہاں بھیج دوں۔ میں نے جواب دیا کہ ملک احمد حسن کے پاس لاہور بھیج دیجیے۔ احمد حسن نے اسے میرے پاس مصر روانہ کر دیا۔

ان چھ سات برس میں بھی میرا مطالعہ بطور جاری رہا ہی تھا۔ اب میں نے خود ہی مسوّدے پر نظر ثانی کی۔ جہاں کوئی کسر نظر آئی، اسے ٹھیک کیا اور اس کے بعض حصّے دوبارہ لکھے۔ میں نے مضمون کے چھ باب تجویز کیے تھے: (۱) بیٹی؛ (۲) بیوی؛ (۳) ماں؛ (۴) مطلّقہ یا بیوہ؛ (۵) وارثہ؛ (۶) عورت مذاہب عالم میں؛ پہلے پانچ ابواب میں صرف اسلامی تعلیم اور آخر میں اس کا دوسرے مذاہب سے تقابل اور موازنہ۔ جب مضمون مکمّل ہو گیا، تو میں نے بوجوہ خیال کیا کہ آخری باب کو اس کتاب کے ساتھ شائع نہیں کرنا چاہیے۔ یہ موضوع اپنی جگہ مکمّل ہے اور اسے الگ رکھنا چاہیے۔ میں نے نیاز صاحب سے اس کا ذکر کیا، تو انھوں نے اتفاق کرتے ہوئے لکھا کہ اسے نگار میں اشاعت کے لیے بھیج دیجیے۔ چنانچہ یہ مضمون 'عورت اور اسلام' کے عنوان سے ۱۹۴۵ء میں نگار کے تین شماروں میں چھپا۔ پہلے پانچ باب بالآخر ۱۹۵۱ء میں "عورت اور اسلامی تعلیم" کے عنوان سے کتابی صورت میں نیاز صاحب نے اپنے تعارف کے ساتھ اپنی نگرانی میں چھاپے۔ میں مضمون کا تسلسل قائم رکھنے کو، حالات سے بہت آگے نکل گیا۔

نیاز صاحب سے خط و کتابت کا سلسلہ ۱۹۲۴ء ہی میں قائم ہو گیا تھا۔ وہ خطوں کا جواب

حد درجہ باقاعدگی سے، بلاتاخیر دیتے۔ ان کے خطوں پر رائے زنی کرنا اس مضمون کے حدود سے باہر ہے اور ان سے متعلق کسی حد تک اپنی تفصیلی رائے میں ایک اور مضمون میں ظاہر بھی کر چکا ہوں، جو نقوش (لاہور) میں چھپا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی انشا کی تمام رعنائیاں ان خطوں سے ظاہر ہوتی ہیں۔ ان کے جو خطوط "مکتوبات نیاز" کے نام سے تین جلدوں میں چھپے تھے، ان سے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کسی شخص کے نام نہیں لکھے گئے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ شبہہ کس حد تک درست ہے۔ البتہ اتنا یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں بعض ایسے خطوط ہیں، جو خود میرے نام لکھے گئے تھے۔ ان کی بانکی البیلی نثر، شعروں کا برجستہ استعمال اور ہلکا سا مزاح

لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

شعروں کے برمحل استعمال میں ان کے پیشرو مولانا ابوالکلام آزاد اور میر ناصر علی (صلائے عام والے) تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس پہلو سے وہ ان دونوں سے متاثر ہوئے ہیں۔

ابھی تک ان سے ذاتی طور پر ملنے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ پہلی ملاقات ۱۹۳۶ء کے جاڑوں میں ہوئی۔ میں اس زمانے میں دلّی میں تھا۔ انھوں نے لکھا کہ فلاں دن آل انڈیا ریڈیو سے ایک تقریر نشر کرنے کو آ رہا ہوں۔ یہ ریڈیو کے ابتدائی دور کی بات ہے جب اس کا دفتر پرانی دلّی میں علی پور روڈ پر تھا۔ جس شام ان کی تقریر تھی، میں ریڈیو اسٹیشن پہنچ گیا۔ اسٹیشن ڈائرکٹر جناب سید ذوالفقار علی بخاری سے میری کچھ یاد اللہ تھی، انھی نے میرا تعارف کرایا۔ وہاں زیادہ بات چیت کا موقع نہ ملا، لہٰذا میں نے اگلے دن ملنے کے لیے وقت طے کیا اور واپس چلا آیا۔

وہ اپنے پرانے دوست حبیب احمد صاحب کے پاس قرول باغ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

---

۵ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا، تو ان کی تقریر "اہرام مصر" کے موضوع پر تھی۔

اتفاق سے میں بھی ان دنوں وہیں قرول باغ میں رہتا تھا اور جناب حبیب احمد کا مکان بھی میرے مسکن سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ چنانچہ میں اگلے دن وقت مقررہ پر حاضر خدمت ہوا۔ دیر تک گپ رہی۔ کسی سنجیدہ موضوع پر گفتگو نہیں ہوئی؛ پہلی ہی ملاقات پر نہ اس کا محل تھا، نہ ضرورت۔ ہم ایک دوسرے کو بارہ برس سے جانتے تھے اور جب پہلی مرتبہ ہی ملے ہیں، تو اسی طرح، جیسے پرانے ملنے والے باہم ملتے ہیں، اجنبیت کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔

اس موقع کا ایک لطیفہ سنیے:

دوسرے دن شام کو نیاز صاحب کہیں باہر جا رہے تھے، میں بھی موجود تھا۔ کہہ چکا ہوں یہ جاڑوں کا زمانہ تھا۔ انھوں نے اچھی طرح گرم کپڑے پہن لیے۔ جب خوب کس کسا کر کمرے سے باہر نکلے، تو حبیب احمد صاحب نے کہا کہ اتنے زیادہ گرم کپڑوں کی کیا ضرورت تھی؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ صاحب! سردی کا موسم ہے، اس کا علاج یہی ہے کہ یا تو انسان شراب سے اپنے کو گرم رکھے، یا اونی کپڑوں سے۔ شراب پینے کی توفیق نہیں، اس لیے احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ کپڑوں کے پہلو سے کوتاہی نہ ہو۔ میرے منہ سے نکل گیا: شراب نہ پینے کی جو توجیہہ آپ نے کی ہے، حرام کرنے والے نے اس کا خیال نہیں کیا۔ تو کیا کہتے ہیں: صاحب! جس زمانے میں یہ حرام ہوئی ہے، اس وقت جس چیز کو شراب کہتے تھے، وہ واقعی اس قابل تھی کہ اسے حرام کر دیا جاتا۔ بھلا وہ بھی کوئی شراب تھی! کھجوریں اور انگور، گندم اور جَو۔ انھیں پانی میں ڈال دیتے۔ آٹھ دس دن کے بعد جب خمیر تیار ہو جاتا، تو ہاتھ سے اس کا ملغوبہ بنا کر اسے نچوڑ یا چھان لیتے۔ یہ شراب تھوڑی ہی! اسے آپ زیادہ سے زیادہ ٹھنڈا جوشاندہ کہہ سکتے ہیں۔ شراب تو اس چیز کا نام ہے جو اب ملتی ہے۔ ذرا اسے دیکھیے تو کہ کتنی صاف، شفاف اور دلکش ہے کہ خواہ مخواہ پینے کو جی چاہے۔ اسے بھلا کون حرام قرار دے سکتا ہے!

میں ۱۹۳۹ء میں مصر چلا گیا اور کوئی سات برس کے بعد تین چار مہینے کے لیے وطن واپس آیا، تو ان سے ملنے کو لکھنؤ گیا۔ انہی کے ہاں اترا اور دو دن ٹھہر کر دلّی چلا آیا اور پھر مارچ ۱۹۴۷ء میں باہر چلا گیا۔ اگلے پانچ برس میں میرا زیادہ قیام مصر اور عراق میں رہا۔ اب کے واپسی ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔ لیکن بدقسمتی سے حالات اچانک کچھ ایسے پیش آگئے کہ مجھے ڈیڑھ دو مہینے کے بعد ہی پھر باہر جانے کی ضرورت پیش آگئی۔ میرا دل نہ مانا کہ ملے بغیر واپس چلا جاؤں۔ چنانچہ میں نے تار دیا کہ اگلے دن پہنچ رہا ہوں۔ جب وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ حیدرآباد گئے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انھیں میرا تار ہی نہیں ملا تھا۔ ملاقات نہ ہو سکی، جس کا مجھے بہت قلق تھا لیکن وقت اتنا تنگ تھا کہ میں ان کی حیدرآباد سے مراجعت تک انتظار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہی اور میں دلّی چلا آیا؛ چند دن بعد ہوائی جہاز سے مصر چلا گیا۔

میں اواخر نومبر ۱۹۵۴ء میں دلّی آیا، دسمبر میں لکھنؤ گیا۔ میری غیر حاضری میں ان کی صاحبزادی شوکت کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی تعزیت بھی کرنا تھی۔ میں یہاں دو تین دن ٹھہرا۔ انھوں نے جس محبت اور شفقت کا اظہار کیا، اب اس کا ذکر بھی ان کے خلوص کی توہین ہو گی۔ کیا بتاؤں کہ کہاں کہاں وہ مجھے ساتھ لیے لیے پھرے۔ ان سے بڑی بڑی باتیں ہوئیں۔ ان کی زندگی کے متعدد واقعات سنے۔ ان کا دفتر دیکھا، جہاں ہر چیز قرینے سے اپنی اپنی جگہ پر رکھی تھی۔ ان کے کام کرنے کا ڈھنگ دیکھا۔ ان کی پابندیِ اوقات سے متعلق کچھ کہنا تو تحصیلِ حاصل ہے۔ اسی ایک بات سے اندازہ لگا لیجیے کہ نگار فروری ۱۹۲۲ء میں جاری ہوا تھا۔ اس ۴۲ برس میں کبھی ایک مرتبہ بھی تو ناغہ نہیں ہوا۔ پہلے تو یہی دیکھیے کہ مذہبی پرچوں کی بات نہیں، خالص علمی ادبی پرچوں میں اتنی لمبی عمر کس کی ہوئی۔ زمانہ (کانپور) غالباً ۴۲ برس زندہ رہا۔ لیکن منشی دیا نرائن نگم مرحوم کہا کرتے تھے کہ زمانہ کا خرچ روزنامہ آزاد سے نکلتا

ہے، ورنہ خود زمانہ خسارے میں چل رہا ہے۔ یہ نہیں کہ نگار پر مشکل وقت نہیں آئے جب ۱۹۳۲ء-۱۹۳۳ء میں بعض اسلامی حلقوں سے اس کے خلاف تحریک چلی اور نیاز صاحب پر کفر کا فتویٰ صادر ہوا ہے، تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ اب نگار بند ہو جائیگا۔ یہ بھی کچھ کم سخت واقعہ" نہ ہوتا، لیکن اس سے بھی بڑھ کر خود ان کی اپنی جان تک کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ ان صبر شکن حالات میں بھی ان کی پامردی اور مستقل مزاجی نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا اور پرچہ برابر نکلتا رہا۔ یہاں مجھے اس سے بحث نہیں کہ اس تنازعے میں کون راستی پر تھا اور کون غلطی پر۔ اگرچہ پورے واقعات سے بہت حد تک واقف ہوں اور چاہوں، تو ان پر بھلا برا محاکمہ بھی کر سکتا ہوں، لیکن ایک تو نقار خانے میں طوطی کی صدا کون سنتا ہے اور دوسرے اب گڑے مُردے اکھاڑنے سے حاصل بھی کیا ہوگا! یہاں مقصود صرف ان کے کردار کا یہ پہلو پیش کرنا ہے کہ نیاز صاحب کے مزاج میں، گفتار و کردار میں، بات کی پچ ہے۔ استواری ہے، یا وہ چیز جسے بزرگ وضعداری کہا کرتے تھے۔ نیاز صاحب قوم کے پٹھان ہیں۔ پٹھانوں میں ضد کا عنصر بہت ہے۔ اس لیے آپ اسے ضد بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن یہ اندھی دھند یا نا عاقبت اندیشانہ ضد نہیں۔ ان کی دنیوی سوجھ بوجھ بلا کی ہے؛ وہ کسی مسئلے کے حسن و قبح اور ما لہٗ و ما علیہ پر پوری طرح غور و فکر کیے بغیر کوئی اقدام نہیں کرتے۔

میں پچھلے پانچ برس سے پھر وطن سے باہر زندگی بسر کر رہا ہوں:

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

ان سے آخری ملاقات روانگی سے چند ماہ پیشتر دلّی میں ہوئی تھی۔ خیال تھا کہ جب دلّی واپس جاؤنگا، تو پھر حاضرِ خدمت ہونگا، لیکن پارسال انھوں نے نقلِ مکان کر لیا۔ غالب نے کسی ایسے ہی موقع کے لیے کہا تھا:

بتخانہ میں اسد بھی بندہ تھا گاہ گاہے — حضرت چلے حرم کو، اب آپ کا خدا ہے

یہ صورتیں الگ

میں یہ تو نہیں کہنا چاہتا کیونکہ آخر دلی اور کراچی میں اتنا بُعد تو نہیں، جتنا بتخانے اور حرم میں ہے۔ لیکن اتنا کہہ دینے میں بھی کیا حرج ہے:

پیامِ من کہ رساند بیارِ مہر گسل
کہ بر شکستی و ما را ہنوز پیوند ست

قسم بجانِ تو گفتن طریقِ ایمان نیست
بخاکِ پائے تو و آں ہم عظیم سوگند ست

کہ با شکستنِ پیمان و برگرفتنِ دل
ہنوز دیدہ بدیدارت آرزو مند ست

یہ مختصر مضمون لکھنے سے میری غرض یہ نہیں تھی کہ میں ان کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لوں، اور بتاؤں کہ انھوں نے اپنی ساٹھ سالہ ادبی زندگی میں، زبان کی، شعر و ادب کی، انشاء کی، تنقید (یا ان کی اصطلاح میں انتقاد) کی، مذہب اور تاریخ کی، صحافت کی، کیا کیا خدمات سر انجام دی ہیں، یا کس طرح سے ہمارے مشہور لکھنے والوں کی بہت بڑی تعداد نہ صرف ان کی ذات سے، بلکہ ان کے اسلوبِ تحریر سے بھی متاثر ہوئی اور انھوں نے نگار ہی سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ ان کی ہمہ جہتی شخصیت پر کوئی تبصرہ کر کے تاریخ ادب اردو میں ان کا مقام متعیّن کروں۔ یہ کام مجھ سے زیادہ قابل اور اہل لوگ کرینگے اور آئندہ بھی کرتے رہینگے۔ میرا مقصود یہ چند سطریں لکھنے سے صرف اتنا تھا کہ میں اپنی طرف سے ان کی خدمت میں ہدیۂ نیاز پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ان سے بہت استفادہ کیا، اور بہت کچھ سیکھا ہے اور میری معنوی نشو و نما میں نیاز اور نگار کا بہت ہاتھ رہا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس کا برملا اظہار کر دوں۔

از عیشِ ما مپرس، نظیری، خبر کہ ما
چوں خضر لب ز چشمۂ نایاب شستہ ایم

نیاز فتحپوری

مشرقی یوپی میں ایک پرانا تاریخی شہر فتحپور نام کا ہے۔ یہ ضلع کا صدر مقام بھی ہے۔ کبھی یہاں کے پٹھان اپنی جہالت اور شورہ پشتی کے لیے مشہورِ زمانہ تھے۔ انھیں پڑھنے لکھنے سے سروکار نہیں تھا، آپس کی سرپھٹول اور فوجی ملازمت ان کا روایتی پیشہ تھا۔ ان لوگوں میں سب سے پہلے جس شخص نے اپنی خاندانی اور قومی روایات کے برخلاف تعلیم حاصل کی، اور وہ بھی اس معیار کی کہ فارسی نظم و نثر میں سند اور استادی کا درجہ حاصل کیا، اس کا نام محمد امیر خاں تھا۔ تعلیم مکمل کر لینے کے بعد وہ انگریزی محکمۂ پولیس میں ملازم ہوگئے۔ جس زمانے میں وہ نئی گھاٹ (ضلع بارہ بنکی) میں تھانے کے مہتمم کی حیثیت سے متعین تھے وہاں ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام ماں نے نیاز محمد خان رکھا اور والد نے تاریخ کی رعایت سے لیاقت علی خان، جس سے ۱۳۰۲ برآمد ہوتے ہیں۔ یعنی ان کی پیدائش ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء میں ہوئی۔ یہی نیاز محمد خان آگے چل کر علمی اور ادبی دنیا میں نیاز فتحپوری کے نامِ نامی سے معروف ہوئے۔

نیاز کی ابتدائی تعلیم والد کی نگرانی میں گھر پہ ہوئی، پھر فتحپور کے مدرسۂ اسلامیہ میں بھیج دیے گئے۔ یہ مدرسہ مولانا سید ظہور الاسلام نے قائم کیا تھا، جن کا ندوۃ العلما کی تحریک

کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس مدرسہ میں نیاز نے درس نظامیہ کی تکمیل کی۔ عربی فارسی اور علوم اسلامیہ کے علاوہ انھوں نے دسویں درجے تک انگریزی کی تعلیم بھی یہیں پائی۔ ۱۸۹۹ء میں میٹرک کے امتحان کے بعد وہ اپنے والد کے پاس لکھنؤ چلے گئے، جہاں وہ ان دنوں کوتوال کے عہدے پر فائز تھے۔ یہاں انھوں نے کوئی سال بھر میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی اور اسلامیات کی تکمیل کی۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد روزگار کا مسئلہ سامنے آیا۔ چونکہ ان کے والد عمر بھر پولیس میں ملازم رہے تھے، اور افسرانِ اعلیٰ سے ان کے تعلقات بہت خوشگوار تھے، ان کی کوشش سے یہ بھی پولیس میں انسپکٹری کے لیے منتخب ہو گئے۔ ابتدائی ٹریننگ مراد آباد میں ہوئی اور اس کے بعد منڈیہ (ضلع الٰہ آباد) میں بطور سب انسپکٹر تقرر ہو گیا۔ والد کے کہنے سے انھوں نے ملازمت قبول تو کر لی، لیکن واقع یہ ہے کہ پولیس کی نوکری ان کے مزاج اور افتاد کے مطابق نہیں تھی۔ اس لیے طبیعت جلد ہی اس سے اُچاٹ ہو گئی، اور دو سال بعد ۱۹۰۲ء میں وہ مستعفی ہو کر واپس فتحپور چلے آئے۔ یہاں وہ مدرسۂ اسلامیہ کی (جہاں انھوں نے کبھی تعلیم پائی تھی) انگریزی شاخ کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔ اس عہدے پر وہ کوئی تین برس یعنی ۱۹۰۵ء تک کام کرتے رہے۔

۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۹ء تک کے چار برس مختلف قسم کے کام میں بسر ہوئے۔ ۱۹۰۸-۱۹۰۹ء میں وہ ہانسی (ضلع حصار) میں جیمس اسکنرؔ کی جاگیر کے ادارۂ نظم و نسق کے سکتر رہے۔ اسی زمانے میں ان کا مسوری جانا ہوا، جہاں ان دنوں سید سجاد حیدر یلدرم بھی ایک افغان امیر زادے کے اتالیق کی حیثیت سے مقیم تھے۔ یلدرم اُردو نثر میں رومانی تحریک اور ادبِ لطیف کے بانیوں میں سے ہیں۔ نیاز نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ چنانچہ ان کی ابتدائی انشا میں جو رومانیت ہے، وہ بہت حد تک یلدرم کی صحبت کا اثر ہے۔

۱۹۱۰ء میں وہ چند مہینے کے لیے مولانا ظفر علی خان مرحوم کے روزنامے "زمیندار" لاہور

کے شعبۂ ادارت سے بھی منسلک رہے۔ اسی زمانے میں مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی بھی اس اخبار میں ملازم تھے۔ چونکہ دونوں افتادِ طبع میں یکسر مختلف تھے۔ سلیم جتنے خشک اور کھرے تھے، نیاز اتنے ہی رند مشرب۔ اس لیے ان کا سلیم سے متاثر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ دونوں میں دوستی کا رشتہ پیدا ہو گیا، جو سلیم مرحوم کی وفات (۱۹۲۸ء) تک قائم رہا۔

۱۹۱۵ء میں وہ بھوپال پہنچے۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے ان کی زندگی کے ایک اہم واقعے کا ذکر کر دیا جائے، جس سے متعلق آج تک کچھ نہیں لکھا گیا۔ اور بہت سے لوگوں کے دل میں اس کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں بھی ہیں۔ یہ "قمر زمانی بیگم" کا افسانہ ہے۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں نظام الدین شاہ دلگیر اکبر آبادی ایک ماہانہ پرچہ نقاد نکالا کرتے تھے۔ کسی وجہ سے یہ بند ہو گیا۔ اس کے مضمون نگاروں میں بیشتر آگرے کے وہی "یارانِ نجد" تھے، جن کے صلاح و مشورہ سے بعد کو نگار جاری ہوا۔ ان اصحاب نے ایک دن بیٹھ کر مشورہ کیا کہ کسی طرح سے دلگیر کو نقاد دوبارہ جاری کرنے پر آمادہ کرنا چاہیے۔ سوال یہ تھا کہ کیا ترکیب کی جائے! دلگیر کی رنگین مزاجی کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔ لہٰذا فیصلہ ہوا کہ ان کی اس افتاد کا فایدہ اٹھایا جائے اور کسی عورت کی طرف سے خط لکھ دیا جائے۔ چنانچہ خط کا مسودہ تیار ہوا، جس میں اس بات پر افسوس کا اظہار تھا کہ پورے ملک میں اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث نقاد ہی تو ایک پرچہ تھا، جو ادب کے شیدائیوں کے کام کا تھا، اسے آپ نے کیوں بند کر دیا؟ خدارا، ایک مشتاق کی آواز سنیے اور اسے پھر سے جاری کر دیجیے۔ خط کے آخر میں لکھنے والے کا نام تھا: قمر زمانی بیگم۔

اس سلسلے میں دو سوال پیدا ہوئے۔ پہلا یہ کہ خط کون شخص لکھے۔ دلگیر اس پوری جنڈال

چوکڑی کے سوادِ خط سے واقف تھے کیونکہ یہ لوگ نقاد کے مضمون نگاروں میں رہے تھے۔ اور یوں بھی روز کے ملنے والے تھے۔ بھید کھل جانے کا قوی اندیشہ تھا۔ اس کا علاج یہ سوچا گیا کہ خط نیاز الٹے ہاتھ سے لکھیں۔ اس طرح خط بدل جائیگا اور دلگیر اسے پہچان نہیں سکیںگے۔ دوسرا سوال اس سے زیادہ ٹیڑھا تھا۔ خط پر پتا کیا دیا جائے، جہاں سے مراسلت بحفاظت کی جا سکے؟ آخر کار فیصلہ ہوا کہ دلگیر کے نام خط لکھ کر ڈاکٹر ضیا عباس ہاشمی کے پاس بھیجا جائے، جو ان دنوں گوالیار میں ملازم تھے۔ یہ اسے وہاں سے ڈاک میں ڈالیں۔ جواب بھی وہیں منگوایا جائے۔ اور ہاشمی صاحب اسے آگرے بھیج دیا کریں۔ چنانچہ خط پر ایک فرضی پتہ، ہاشمی سے مشورہ کر کے دیا گیا، جہاں سے وہ دلگیر کے خطوں کو آسانی سے لے سکتے تھے۔

غرض یہ مراسلت شروع ہوئی۔ دو چار خطوں کے بعد دلگیر نے نقاد جاری کر دیا۔ قمر زمانی بیگم کے خطوط بھی اس میں شائع ہونے لگے۔ وہ اپنے مضامین اور نظموں میں بھی اس سے خطاب کرنے لگے۔ جب اس باہمی نوک جھونک پر کچھ مہینے گزر گئے، تو دلگیر نے سوال کیا کہ آپ کب تک پسِ پردہ رہینگی؟ کوئی ایسی صورت نکالیے کہ ملاقات ہو، کچھ اپنی کہوں، کچھ آپ کی سنوں۔ جب ان لوگوں نے یہ منصوبہ بنایا تھا، تو انھیں توقع نہیں تھی کہ یہ خط و کتابت اتنی لمبی ہو جائیگی۔ اور یقیناً یہ تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ دلگیر کسی وقت دُوبدو ملاقات کی درخواست بھی کر دینگے۔ چنانچہ دلگیر کا یہ خط ملا، تو اول تو انھیں ٹالنے کی کوشش کی گئی، لیکن جب وہ کسی طرح نہیں مانے، اور اصرار کرنے لگے، تو انھیں لکھا گیا کہ میں ایک عزیز کے ہاں کسی تقریب میں شرکت کے لیے دلّی جانے والی ہوں، اگر آپ وہاں تشریف لائیں، تو فلاں دن کسی نہ کسی طرح سے وقت نکال کر میں تھوڑی دیر کے لیے مل سکونگی۔ یہاں فتحپوری کے پاس کسی زمانے میں ایک عبادا جا ہوٹل ہوا کرتا تھا، ملاقات کی جگہ کے

لیے اس کا انتخاب کیا گیا۔

ادھر ان لوگوں نے اپنے ایک دوست محمد احمد کو قمر زمانی کا پارٹ ادا کرنے پر آمادہ کر لیا۔ محمد احمد جسم کے بہت سبک اور دھان پان سے نوجوان تھے اور ان کے لہجے میں بہت نسوانیت تھی۔ وہاں بھیجنے سے پہلے نیاز نے محمد احمد کو خوب "سدھایا"۔ بیٹھنا کیسے ہے، پان لگانے کی نوبت آئے، تو کتھا کیونکر لگایا جائے اور ہاتھ کی انگلیوں کے خم کیسے ہوں اور کونسی انگلی کس وقت ہلے؛ بات کرتے وقت آواز کا اتار چڑھاؤ کیسے ہو؛ کونسا نسوانی محاورہ کس موقع پر استعمال کیا جائے۔ غرض انھیں سکھانے پڑھانے میں کئی دن صرف کیے گئے تھے۔

جس دن یہ ملاقات ہونا تھی، یہ پوری پارٹی آگرے سے دلّی پہنچ گئی؛ اور ملاقات کے مقررہ وقت سے پہلے ادھر اُدھر جم گئی، تاکہ دیکھ سکیں کہ کیا گزرتی ہے۔

عین وقت پر دلگیر تشریف لائے۔ آپ خیال کر سکتے ہیں کہ وہ کس عالم میں ہونگے۔ ان کا آنا یوں کہیے کہ ایک فاتح کا آنا تھا، جو کسی ملک کی فوجوں کو شکست فاش دینے کے بعد شاہانہ جاہ و جلال اور کرّوفر سے اس میں داخل ہو رہا ہو۔ آدمی تھے جذباتی اور رنگین طبع، جب کمرے میں آئے ہیں، تو اس طرح سے گویا کچّے گھڑے کی چڑھی ہوئی ہے۔ پانو رکھتے کہیں تھے اور پڑتا کہیں تھا۔ "قمر زمانی بیگم" پہلے سے کمرے میں موجود تھیں، برقع میں لپٹی، سمٹی سمٹائی، کرسی میں دھنسی ہوئی۔ غرض ادھر اُدھر کی گفتگو کے بعد دلگیر نے کسی بات پر "قمر زمانی بیگم" کو کسی خط کا کوئی فقرہ یاد دلایا؛ ان بیچاروں کو ان خطوط کے بیشتر حصّے حفظ تھے، خدا معلوم کتنی مرتبہ ایک ایک خط کو پڑھا تھا۔ محمد احمد بھلا کیا جانیں کہ کیا خط تھا۔ لیکن آدمی تھے ہوشیار، انھوں نے اپنے حافظے کی کمزوری کا کچھ عذر کر کے وار خالی دیا۔ اس کے بعد پھر کہیں دلگیر نے کسی قریبی زمانے کے خط کی طرف اشارہ کیا۔ اب کے پھر انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا؛

تو اس پر دیگر کو کچھ شبہ سا ہوا، لیکن خاموش رہے۔ اِدھر "قمر زمانی بیگم" بھانپ گئی کہ اب عافیت اسی میں ہے کہ ملاقات ختم کر دی جائے، ورنہ بھانڈا پھوٹنے ہی والا ہے۔ چنانچہ محمد احمد معذرت کے فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور باہر نکل گئے۔ دیگر اس اچانک جدائی پر سٹپٹا گئے، لیکن کچھ کر بھی نہ سکتے تھے۔ اب ان حضرات سے ایک چُوک ہو گئی۔ جب دیگر باہر نکلے، تو ہوٹل کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے یہ سب یکے بعد دیگرے کسی نہ کسی جگہ اُن کے سامنے آ گئے اور ان سے علیک سلیک کرنے لگے۔ دیگر کو شبہ تو پہلے ہی ہو چکا تھا، اب جو ان لوگوں سے مڈبھیڑ ہوئی، تو انھیں یقین ہو گیا کہ مجھے جُل دیا گیا ہے۔ باقی قصہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

غرض یہ ہے حقیقت، "قمر زمانی بیگم" کی۔ بعض لوگوں نے اس پردے میں نیاز کا نام ملوث کرنے کی کوشش کی ہے، اور طرح طرح کے بہتان تراشے ہیں۔ لیکن واقعہ اس سے زیادہ نہیں۔ یہ ایک علمی مذاق تھا، اور بس۔ میں نے نیاز کی زندگی میں ان سے درخواست کی تھی کہ وہ خود یہ سارا قصہ قلمبند کر کے شائع کرا دیں، یا پھر اجازت دے دیں کہ میں اسے لکھ دوں۔ بوجوہ وہ ان دونوں باتوں پر رضامند نہ ہوئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ پوری خط و کتابت آج بھی ڈاکٹر ضیا عباس ہاشمی (پاکستان) کے خاندان میں محفوظ ہو گی۔

القصہ، سب طرف سے فارغ ہو کر جب نیاز بھوپال پہنچے ہیں، تو یہاں بھی ان کا ابتدائی تقرر محکمۂ پولیس ہی میں ہوا۔ لیکن انھیں اگر پولیس کی نوکری ہی کرنا تھی، تو اس کے لیے بھوپال جانے کی کیا ضرورت تھی؛ وہ تو انھیں اس سے بہت پہلے انگریزی علاقے میں بھی مل چکی تھی اور انھوں نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ بارے کچھ دوڑ دھوپ کے بعد اس سے نجات ملی اور ان کا محکمۂ اوقاف میں تبادلہ ہو گیا۔ لیکن یہ ماحول بھی سراسر دفتری تھا اور ان کے تصنیف و تالیف کے شوق کے منافی۔ قدرتاً انھوں نے احتجاج

کیا اس پر عُلیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم نے کہلوایا کہ نیاز صاحب فی الحال یہ اسامی قبول کر لیں، ہم جلد ہی اُن کے لیے کوئی موزوں جگہ تلاش کر کے انھیں وہاں بھیج دینگے۔ مرتا کیا نہ کرتا، یہ اوقاف میں چلے گئے، اور لگے اب انتظار کرنے کہ کب وہ وعدہ وفا ہوتا ہے! ریاستوں کے کام، جہاں حکومت کی مشین آہستہ خرام بلکہ مخرام کے مصداق چیونٹی کی چال چلتی تھی۔ اس انتظار میں دو سال گزر گئے۔ آخر انھوں نے تنگ آکر مندرجۂ ذیل عرضداشت، والیۂ ریاست کی خدمت میں گزرانی:

زمن سپاسِ تو آید ہمیں کہ نالانم — زخندہ ات چہ تو ابرِ دہ ام کہ گریانم
نگاہِ مہر کہ بر من فگندۂ، بینم — سحابِ لطف کہ بر من فشردۂ، دانم
دلے ز آرزوے خود ہنوز منفعلم — ز اقتضاے کمالِ خودش پشیمانم
بدستِ من سرِ دامانِ خود رسیدن دِہ — وگرنہ چاک شدن خواہش گریبانم
عجب نباشد، اگر می زنی بدستارت — بجاے طرّہ، کہ من گوہرے زعمّانم
ببر مرا بشباہت، کہ مشکم از تاتار — بکش مرا ببرت، تیغے از صفاہانم
مرا بہ افسر و دیہیمِ خود، بدہ جاے — کہ من بہ تاب و صفا، لعلے از بدخشانم
مرا بپرس ز حسان و شیخ شیرازی — کہ نغمۂ عرب و طوطیٔ ز ایرانم
جفا کنی کہ تو امروز نیشتر سازی — ہماں امید کہ دِی ساختی رگِ جانم
تلطفے کن و قدرم شناس و کارم دِہ — کہ باشد از نظرِ عدل و نظم شایانم

وگرنہ دِہ خبر از نامرادیم کہ زنم
بسنگِ سختِ فنا، قلبِ شیشہ سامانم

میرے علم میں نہیں کہ ادبِ اُردو کی پوری تاریخ میں کسی ادیب نے اپنے ولیٔ نعمت اور آقا کی خدمت میں ایسی درخواست پیش کی ہو جس کے لفظ لفظ سے خودداری، خود شناسی اور اپنے حقوق کی حفاظت اور قدردانی پر اصرار ٹپکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ

یہ عرضداشت "قصیدۂ شقشقیہ"، بن گئی ہے، جس میں درخواست سے زیادہ "مدحِ خود" اور تعلّی و تحدّی کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ اور اگر یہ بات خیال میں رہے کہ مخاطب ایک عورت اور وہ بھی والیۂ ریاست ہے، تو اس کے لہجے اور مصرعوں کے اسلوبِ بیان پر حیرت ہوتی ہے۔ اس پر سعدی کا وہ قول یاد آجاتا ہے: شاہان وقتے بسلامے برنجند و دیگر وقت بدشنامے خلعت دہند۔ میں اس عرضداشت کو علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم کی عالی ظرفی اور سخن فہمی اور قدردانِ سخن ہونے پر برہانِ قاطع خیال کرتا ہوں کہ انھوں نے اس پر نیاز سے باز پرس نہیں کی اور انھیں معتوب کرنے کے بجائے ان سے لطف و نوازش اور اعزاز و اکرام کا سلوک کیا۔

بہرحال اس درخواست کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور علیا حضرت کے حکم پر ۱۹۱۸ء میں نیاز دفترِ تاریخ میں منتقل ہو گئے۔ یہ دفتر بہت حد تک علیا حضرت کی اپنی نگرانی میں تصنیف و تالیف کا کام کرتا تھا۔ بلکہ شروع میں اس کا مقصد خود انھیں کی تصنیفات شائع کرنا تھا۔ اس کی سرگرمیوں میں وسعت بعد کو آئی اور یہاں سے دوسری کتابیں بھی شائع ہونے لگیں۔ یہاں متعدد اہلِ علم و قلم حضرات مختلف موضوعات تاریخ، مذہب، سیاست، فلسفہ وغیرہ ــــ سے متعلق کتابیں لکھا کرتے تھے۔ اس محکمے کے مہتمم اعلیٰ مولوی محمد ابن زبیری مرحوم تھے۔ البرامکہ والے مولوی عبدالرزاق کانپوری بھی اسی دفتر میں کام کرتے تھے۔ نیاز نے اپنی اولین کتابیں ــ گہوارۂ تمدن، صحابیات، المسئلۃ الشرقیہ (مصطفےٰ کامل پاشا کی عربی کتاب کا ترجمہ) تاریخ الدولتین وغیرہ ــ یہیں بھوپال میں لکھی تھیں ــ جن سے ان کی شہرت بحیثیت مصنّف قائم ہوئی۔

۱۹۲۱ء کے اواخر میں اُن کے چند مخصوص احباب کا آگرے میں اجتماع ہوا۔ جن میں لطیف الدین احمد دل۔ احمد اکبر آبادی)، ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی، مانی جائسی، مخمور اکبر آبادی، نظام الدین شاہ دلگیر، ملک حبیب احمد، مقدّس اکبر آبادی کے نام خاص

طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شاہ دلگیر کا رسالہ نقّاد اپنے دوسرے دور کے بعد بھی اب مدّتوں سے بند تھا، اور یہ سب دوست ٹھہرے لکھنے والے، شاعر اور نثّار۔ تجویز پیش ہوئی کہ ایک ماہانہ رسالہ شائع کیا جائے، اور منظور ہوگئی۔ یہ پہلے طے ہو چکا تھا کہ اُس صورت میں اس کے مدیر نیاز رہیں گے۔ رہا نام کا سوال تو جب نیاز سے پوچھا گیا، تو انھوں نے فوراً کہا: نگار۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب ترکیا کی مشہور شاعرہ نگار بنتِ عثمان کی شاعری کا جادو ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ فیصلہ ہوا کہ نیاز پرچہ مکمّل کر کے بھوپال سے بھیج دیا کرینگے اور یہ آگرے سے چھپ کر شائع ہوا کریگا۔ اس طرح پہلا پرچہ فروری ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا اور دسمبر تک اسی انتظام سے چھپتا رہا۔ لیکن چونکہ اس میں دشواری تھی کہ مدیر تو بھوپال میں ہو، اور پرچہ آگرے سے شائع ہو، اس لیے ایک سال بعد فروری ۱۹۲۳ء میں وہ اسے بھوپال ہی سے شائع کرنے لگے، اگرچہ یہ اب بھی چھپتا آگرے ہی میں تھا۔ ۱۹۲۵ء کے آخر تک یہی انتظام رہا۔ یوں نگار کے مقامِ اشاعت کے بھوپال منتقل ہو جانے سے، وہ اس کے واحد مالک اور مدیرِ اعلیٰ ہو گئے۔

نگار کے اجرا سے قبل نیاز صحافی اور مضمون نگار اور شاعر اور مصنف کی حیثیت سے خاصے معروف تھے۔ ان کی نگارشات الہلال (کلکتہ) اور صلائے عام (دلّی) اور نقّاد (آگرہ) کے سے مؤقر رسالوں میں چھپتی رہی تھیں، اور پڑھنے والے ان کے اسلوبِ بیان، قدرتِ زبان، طرزِ تحریر، گیرائی و گہرائی کے معترف تھے۔ غرض وہ علمی اور ادبی حلقوں میں اجنبی کے طور پر نہیں آئے تھے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے ان کے مضامین دیکھے تھے، یا ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا، ان کے بھی وہم و گمان میں یہ نہیں ہوگا کہ ان کی شخصیت اتنی ہمہ جہتی ہے، اور ان کی استعداد اتنی وسیع اور بوقلموں۔ ان کے اصلی جوہر اب نگار کی ادارت کے زمانے میں کھلے۔ اس میں بیشتر مضمون ان کے

اپنے قلم سے ہوتے تھے۔ انھوں نے ایک زمانے تک کسی سے مضمون لکھنے کی فرمائش نہیں کی۔ مختلف عنوانات پر خود ہی لکھتے رہے۔ آہستہ آہستہ مضمون نگاروں کا حلقہ پیدا ہونے لگا۔ لیکن نیاز کا معیار اتنا کڑا تھا کہ بہت کم خوش نصیبوں کا مضمون ان کی بارگاہ میں مقبول ہوتا، اور نگار میں چھپتا۔ وہ بے جھجک مضمون رد کر دیتے، اور کوئی معذرت بھی نہیں کرتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ جہاں نگار کا اپنا معیار بلند تر ہوتا چلا گیا، وہیں اس کے مضمون نگاروں کو بھی مطالعے اور محنت کی عادت ہو گئی۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر کوئی کور کسر رہ گئی، تو مضمون واپس آ جائیگا، اور کون شخص یہ ذلت قبول کرنے پر تیار ہوگا!

۱۹۲۲ء میں ہمارے ہاں بعض مشہور اور وقیع پرچے شائع ہو رہے تھے: معارف، زمانہ، ادیب، ہمایوں، پیمانہ وغیرہ — ان میں سے ہر ایک باون گز کا تھا۔ ان کی موجودگی میں کسی نئے پرچے کا خواص کے حلقوں میں قبولِ عام کی سند حاصل کر لینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا، لیکن یہ واقع ہے کہ ہوا یہی۔ اس پرچے کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ پہلے دن سے خود کفیل ہو گیا۔ جن اصحاب کے مشورے سے اسے جاری کیا گیا تھا، انھوں نے کچھ مالی امداد کا وعدہ بھی کیا تھا۔ لیکن پرچہ جاری ہوا، تو اس کی مانگ اتنی ہو گئی کہ اسے کسی بیرونی امداد کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اور رفتہ رفتہ یہ صورت ہو گئی کہ یہ اُن کے اُجلے خرچ اور آبرومندانہ بسر اوقات کا ذریعہ بن گیا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ نگار عام پسند پرچہ نہیں تھا؛ نہ اس میں تصویریں چھپتی تھیں، نہ فلمی اشتہار، بلکہ دوسرے اشتہار بھی بہت کم ہوا کرتے تھے۔ اس کے مضامین بھی عام سطح اور پسند کے نہیں تھے۔ اس کے باوجود بتدریج اس کا حلقہ اتنا وسیع ہو گیا کہ یہ نیاز کے لیے کامیاب ذریعۂ معاش بن گیا۔

اس کامیابی کا راز کیا تھا؟

نگار سے پہلے جو پرچے موجود تھے، وہ بالعموم ادبی رہے۔ ان میں علمی اور سنجیدہ مضمون شاذ و نادر ہی شائع ہوتے تھے اور جو پرچے کچھ سنجیدہ تھے، وہ اتنے خشک اور ثقیل تھے کہ اُن سے علم میں اضافہ تو بیشک ہوتا تھا، لیکن عوام کا تو کیا ذکر، خواص میں سے بھی بہت کم لوگ ان سے لطف اندوز ہو سکتے تھے۔ نگار نے ان دونوں کے درمیان کی راہ نکال لی۔ اس نے آغاز سے خالص علمی مقالات بھی شائع کیے اور اس میں بلند پایہ ادبی چیزیں بھی شامل رہیں۔ اس طرح گویا وہ سب حلقوں ــــ عوام و خواص کے ذوق کی تسکین کا ذریعہ بن گیا۔

لیکن معاملہ اسی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ آپ بالکل ادبی مضمون بھی ایسی زبان اور ایسے اسلوب میں لکھ سکتے ہیں کہ اس میں کوئی دلکشی نہ رہے اور کسی کا جی اسے پڑھنے کو نہ چاہے۔ نیاز کا اصلی کمال ان کی طرزِ تحریر اور اسلوبِ نگارش میں تھا۔ وہ سنجیدہ سے سنجیدہ اور مشکل سے مشکل موضوع پر بھی ایسی شگفتہ اور دلکش نثر میں سب کچھ کہہ جاتے تھے کہ پڑھنے والا صرف کہیں اکتا نہیں تھا، بلکہ چٹخارے لیتا رہ جاتا تھا۔ وہ بنیادی طور پر ادیب تھے اور حسن پرست۔ یہ دونوں چیزیں اُن کی ہر تحریر کا امتیازی وصف ہیں، اور اسی نے پڑھنے والوں کو ان کا اور نگار کا والہ و شیدا بنا دیا۔

۱۹۲۷ء میں نیاز بھوپال کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ آ گئے۔ لامحالہ نگار کا دفتر بھی ان کے ساتھ یہاں آ گیا۔ اب گویا نگار کے عروج کا دور شروع ہوا۔ بیشک بھوپال میں بھی وہ کامیابی اور نیکنامی کے ساتھ چل رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھوپال کی ریاستی فضا آزادیِ تحریر کے لیے سازگار نہیں تھی؛ اور ریاست بھی ایسی جہاں روایت کی اتنی سخت پابندی تھی کہ اس سے سر مو تجاوز بھی گویا قانون کی خلاف ورزی کے مرادف تھا۔ بھوپال میں مولانا شبلی کو سیرۃ النبی کی تالیف میں جو کچھ پیش آیا تھا، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نیاز کے لیے یہاں رہتے ہوئے اسلامی علوم و مسائل پر آزادی سے لکھنے کا بھلا کیا موقع ہو سکتا تھا!

وہ اُردو کے علاوہ کہ ان کی مادری زبان تھی، ہندی، فارسی، عربی، ترکی، انگریزی۔ پانچ اور زبانیں جانتے تھے اور ان میں علیٰ وجہ مراتب انھیں پوری مہارت حاصل تھی۔ چونکہ ان کی ساری تعلیم کم و بیش مذہبی مدرسوں میں ہوئی تھی، اس لیے اسلام اور اس کے مختلف علوم و فنون کا مطالعہ انھوں نے کم عمری ہی میں کرلیا تھا۔ آدمی تھے ذہین اور طبّاع اور محنتی، بعد کو انھوں نے اپنے وسیع ذاتی مطالعے اور غور و فکر سے ان علوم کی تکمیل کرلی، جس سے انھیں پورا رسوخ حاصل ہوگیا۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ ان کی 'عربی کی واقفیت' کافی نہیں تھی یعنی وہ عربی سے محض آشنا تھے۔ بیشک، انھوں نے کسی 'دارالعلوم' میں عمرِ عزیز کے پندرہ بیس برس کسی شیخِ معمّر کے حضورِ زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تھا۔ لیکن ہم نے ان اصحاب کو بھی دیکھا ہے، جنھوں نے پندرہ بیس برس نہیں، تیس تیس برس تک یہ مجاہدہ کیا ہے، اس کے باوجود وہ کورے کے کورے رہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے کسی نے دریافت کیا حضور، انسان بالغ کس عمر میں ہوجاتا ہے؟ جواب دیا: خدا کی قسم، بعض لوگوں کے داڑھی مونچھ نکل آتی ہے اور وہ صاحبِ اولاد ہوجاتے ہیں، لیکن وہ پھر بھی بالغ نہیں ہوتے۔ ان کا دماغ اور ذہن کسی کمسن بچّے سے زیادہ نہیں ہوتا۔ تو گزارش یہ ہے کہ عربی (یا کوئی زبان بھی) محض کسی درسگاہ میں یا کسی قابل استاد کے ہاں حاضری دینے سے نہیں آتی۔ اس کے لیے کچھ اور بھی درکار ہے۔

ورائے شاعری چیزے دگر ہست

جب یہ لکھنؤ آئے، تو یہاں انھوں نے باقاعدگی سے دینی مسائل و موضوعات سے متعلق لکھنا شروع کیا۔ ولادت و وفاتِ مسیح، معجزاتِ مسیح، خضر علیہ السّلام، جنت و دوزخ، یاجوج ماجوج، پلصراط وغیرہ اسی زمانے کے مضمون ہیں۔ آج کہ اس بات پر پچاس برس گزر چکے ہیں، آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس زمانے کے نوجوانوں کے طبقے پر ان مقالات کا کیا اثر ہوا تھا۔ قدامت پسند حلقوں میں تو گویا بھونچال آگیا۔

انھوں نے اسے کفر و الحاد و زندقہ سے تعبیر کیا، جب کہ نئی نسل کے نزدیک اسلام اور قرآن کی صحیح تفسیر ہی یہ تھی۔ نیاز کا استدلال مضبوط، معقول اور مسکت ہوتا تھا۔ اس پر اُن کا اسلوب بیان ایسا بدیع اور ہلکا سا مزاح کا رنگ، ایسا لطیف تھا کہ پڑھنے والا اش اش کر اٹھتا تھا۔

مذہبی حلقے ان ماہانہ حملوں سے تلملا اٹھے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ان کا مقابلہ کرنا یا جواب دینا بھی ان میں سے کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ آخر کار ۱۹۳۲ء میں دو مشہور عالموں نے باہمی مشورے سے نیاز اور نگار کے خلاف ایک باقاعدہ مہم چلانے کا منصوبہ بنایا۔ دوسرے علما تو پہلے ہی سے مخالف ہو رہے تھے، انھوں نے بھی اس پر صاد کیا۔ قصہ کوتاہ، نیاز پر فتوائے کفر صادر کیا گیا۔ نیز فیصلہ ہوا کہ ان کے خلاف توہین مذہب کا مقدمہ دائر کیا جائے۔ ستم یہ کہ عوام کو ان کے قتل پر اکسانے سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔ نیاز نے ایک مرتبہ خود مجھے بتایا تھا کہ میں یہ سارا زمانہ کبھی پستول کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلا، رات کو بھی اسے تکیے کے نیچے رکھ کے سوتا تھا۔ اس زمانے میں یو۔پی حکومت میں اُمورِ داخلیہ (ہوم ڈیپارٹمنٹ) کے ممبر ایک مشہور مسلمان بزرگ تھے۔ مقدمہ چلتا، تو قدرتاً ان کے حکم اور انھیں کے دفتر کی طرف سے یہ کارروائی ہوتی۔ نیاز جا کر اُن سے ملے، اور ان پر واضح کیا کہ اگر مجھ پر توہینِ مذہب کا مقدمہ قائم کیا گیا، تو ظاہر ہے کہ میں خاموش تو رہونگا نہیں؛ میں ان سب مولویوں کو صفائی کے گواہ کی حیثیت سے عدالت میں طلب کرونگا اور ان پر میری جرح ہوگی، حدیث کی کتابوں اور تفسیروں کے بارے میں کیونکہ مجھ پر یہ الزام اس لیے لگایا گیا ہے کہ میں بیشتر کتب حدیث اور تفسیروں کے مندرجات کو تسلیم نہیں کرتا۔ آپ کو نہیں معلوم کہ ان احادیث کے مجموعوں میں کیسی کیسی روایات بھری پڑی ہیں۔ یوں اس مقدمے کے نتیجے میں مذہب کی اس سے کہیں زیادہ توہین ہوگی جتنی مجھ سے منسوب کی جا رہی ہے۔ اور پھر اس کے بعد اسلام سے متعلق جو مواد

مخالفین کے ہاتھ لگیگا، اس کا اندازہ آپ خود کر لیجیے۔ ہوم ممبر صاحب آدمی تھے سمجھدار اور دور اندیش، وہ اس دھمکی کا مطلب پا گئے اور انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ نیاز پر توہینِ مذہب کا مقدمہ نہیں چلایا جائیگا۔

لیکن مخالفت روز افزوں ترقی پر تھی۔ منصوبے کے مطابق سب شہروں میں جلسے ہو رہے تھے، قراردادیں ہو رہی تھیں، پوسٹر چھپ رہے تھے، نیاز کو دھمکیوں اور گالیوں بھرے خطوط موصول ہو رہے تھے۔ آخر بعض اکابر نے بیچ بچاؤ کیا اور نیاز تیار ہو گئے کہ نگار میں ایک معافی نامہ شائع کر دیں۔ چنانچہ یہ انھوں نے شائع کر دیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے صلح حدیبیہ کے تتبع میں ایسا کیا تھا۔ اس وقت حالات کا اقتضا یہی تھا کہ عارضی طور پر جارحانہ اقدام چھوڑ کر خموشی سے اپنی طاقت کو پھر سے مجتمع کیا جائے۔ یہی انھوں نے کیا۔ وہ چندے خاموش رہے اور پھر انہی موضوعات سے متعلق لکھنے لگے۔ چونکہ تعلیم یافتہ اور ترقی پسند طبقہ ان کے ساتھ تھا، اس لیے اسبا کے کوئی ان کا بال بھی بیکا نہ کر سکا۔

نیاز خود متعدد معاصر حضرات کی تحریروں سے متاثر ہوئے۔ شاعروں میں وحشت، رجھان آبادی اور اقبال کے بڑے مداح تھے۔ نثر میں یلدرم، مہدی افادی اور صلائے عام والے میر ناصر علی دہلوی کا، اور صحافت میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خان کا ان کی تحریروں پر گہرا اثر رہا ہے۔ ٹیگور کے زیر اثر انھوں نے بعض بہت بلیغ انشائیے لکھے۔ ٹیگور کی کتاب گیتانجلی پر نوبل انعام ملا، تو انھوں نے اس کا اردو نثر میں ترجمہ "عرضِ نغمہ" کے نام سے شائع کیا۔ اس کے ساتھ انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے، اس میں ٹیگور کے خیالات کا فارسی شاعری سے موازنہ اور مقابلہ کیا ہے۔ یہ خاصے کی چیز ہے۔

نیاز صاحب متعدد زبانیں جانتے تھے اور ان میں سے عربی، فارسی اور انگریزی کی انھوں نے باقاعدہ تعلیم پائی تھی۔ ہندی اور ترکی کا اپنے طور پر مطالعہ کیا۔ بہرحال ان سب میں

بہت اچھی استعداد کے حامل تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب وہ لکھنے بیٹھتے، تو انھیں اظہارِ خیال کے لیے لفظوں کی کمی کی دشواری کبھی نہیں محسوس ہوتی تھی۔ وہ انگریزی اصطلاحات کا ایسا برجستہ اور صحیح ترجمہ کرتے تھے کہ باید و شاید۔

ان زبانوں کے علاوہ انھیں علم و ادب کے مختلف شعبوں کی اتنی معلوماتِ عامّہ حاصل تھی، اور خاص طور پر فارسی علم و ادب سے متعلق ان کا مطالعہ اتنا وسیع اور عمیق تھا کہ وہ پوری ذمہ داری اور وثوق کے ساتھ اس کے مختلف پہلوؤں پر فیصلہ کُن گفتگو کرنے کا حق رکھتے تھے اور کرتے تھے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ اچھی اردو لکھنے اور اس میں امتیاز حاصل کرنے کے لیے فارسی کا اچھا خاصا علم درکار ہے۔ چونکہ انھیں فارسی اور عربی دونوں پر پوری قدرت حاصل تھی، اس لیے انھیں نہ کبھی الفاظ کی تلاش میں وقت ہوئی، نہ ان کے استعمال میں غلطی۔

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ ہماری نئی نسل کے بیشتر لکھنے والوں کی تحریروں میں خیالات کا الجھاؤ پایا جاتا ہے، اور الفاظ کا غلط استعمال تو اِلّاماشاءاللہ سب کے ہاں بکثرت ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ اصحاب اردو کے اجزائے ترکیبی سے نابلد ہیں۔ اور اس پر مزید ستم یہ ہوا ہے کہ ان میں سے کسی کے دل میں مطالعے کے ذریعے سے اپنے علم کو وسیع اور مکمل کرنے کی خواہش پیدا نہیں ہوتی۔ فن چونکہ محنت طلب چیز ہے اور محنت ہی سے ہمارے نوجوان (اور جوان) ادیب اور شاعر جی چُراتے ہیں، اس لیے سب کے سب فن سے بالکل کورے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی تحریریں فنی، لسانی، ادبی اغلاط سے پُر ہیں۔

نیاز نہ صرف ان زبانوں کے ادب سے کما حقہٗ واقف تھے، بلکہ ان کی فنی مہارت اور وہ چیز جسے حاسّۂ سادسہ کہتے ہیں، اتنی تیز اور نکتہ رس تھی کہ جب کبھی ان کے سامنے کوئی شعر پڑھا جاتا (یا نثر ہی کا کوئی ٹکڑا ہوتا) وہ اس کی ان خامیوں سے بھی فوراً آگاہ

ہو جاتے تھے، جہاں تک بادی النظر میں کسی کی نگاہ جائیگی بھی نہیں۔

اسی میں نیاز کی کامیابی کا راز ہے۔ وسیع مطالعہ، فن سے پوری واقفیت، شگفتہ اور دلآویز تحریر۔ انھوں نے اردو زبان کی جو خدمت کی ہے، وہ اپنی جگہ پر تاریخ کا ایک پورا باب ہے۔ مخالف اور موافق رائیں، تو ہر موضوع سے متعلق ہوتی ہی رہی ہیں، اور آیندہ بھی ہوتی رہیں گی، لیکن جہاں تک کام کی مقدار اور معیار کا تعلق ہے، بہت کم ادیب نیاز کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

نیاز میں قابلِ رشک ہمہ گیری تھی۔ مختلف علوم سے شغف، فن کی واقفیت، مطالعے کی وسعت، محنت و مشقت کی عادت، اصول کی پابندی، کردار کی بلندی، ارادے کی قوت، بات کی پچ، دوست پروری، وضعداری ــ غرض کس کس بات کا ذکر کروں! اردو دوستوں کو ان کی مثال سامنے رکھتے ہوئے پورے عزم اور ولولے سے کام کرنے کی ضرورت ہے، ان کا فرض ہے کہ علم و فن سے متعلق سہل انگاری، بیدلی سے کام کرنے کی روش، بے مقصدی کی عادت کو خیرباد کہ دیں، اپنی اکتسابی تکمیل پر توجہ کریں اور کچھ کرنے کی امنگ لے کر آگے بڑھیں۔ اردو کا پچھلی چار صدیوں کا سرمایہ مطالبہ کر رہا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کریں۔ یاد رہے کہ اُردو کا سفر ختم نہیں ہو گیا ہے، بلکہ ایک طرح سے تو یہ اب شروع ہوا ہے۔

آزادی سے پہلے ہندستان کی مختلف زبانوں میں بہت تھوڑا علاقہ تھا، اور ایک، دوسرے سے مقابلہ تو ہرگز نہیں تھا۔ حکومت کی طرف سے بھی کسی زبان پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اردو اپنی گوناگوں خوبیوں اور سیکھنے کی آسانی کے باعث عوام کی زبان بن گئی تھی۔ آج صورتِ حال دوسری ہے۔ تمام صوبے (یا ریاستیں) اپنے ہاں کی زبان کی ترقی و ترویج میں سرگرم ہیں۔ اور اگرچہ کسی دوسری زبان کی مخالفت رسمی طور پر تو نہیں ہوتی، لیکن عملاً ہو بھی رہا ہے۔ ان حالات میں اب اردو کی بقا و حیات کا دارومدار ان لوگوں پر ہے، جو اسے اپنی زبان سمجھتے ہیں، اور جو ملک کے سب حصوں میں منتشر ہیں۔

اس سے پہلے سوال اس کی ترقی اور توسیع کا تھا، اب خود اس کی بقا کا ہے۔ اسی لیے میں نے کہا کہ کام در اصل اب شروع ہوا ہے: کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق۔

میرے ان کے تعلقات کا آغاز ۱۹۲۴ء میں ہوا۔ میں نے اس سال فروری میں میٹرکولیشن کی سند لے کر گورنمنٹ انٹر کالج، گجرات میں داخلہ لیا تھا۔ یہاں ایک دوست کے ہاں میں نے نگار کا کوئی شمارہ دیکھا۔ جیسا کہ لکھ چکا ہوں، یہ اس زمانے میں بھوپال سے نکلتا تھا۔ میں نے جو اسے پڑھا، تو بیک نظر اس کا دالہ و شیدا ہو گیا۔ اگلے دن میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اس کا چندہ بھیج کر باقاعدہ خریداروں میں اپنا نام لکھوالیا۔ اور فائل مکمل کرنے کو پچھلے دو برس کے پرچے بھی منگوا لیے۔

میری ابتدائی تعلیم پرانے مکتبی انداز پر ہوئی تھی، جس میں فارسی کا عنصر غالب تھا۔ یہ اسی کا صدقہ تھا کہ مجھے اس زمانے میں بھی نیاز کے مضامین کے سمجھنے میں کبھی کوئی وقت محسوس نہیں ہوئی، حالانکہ اس دور میں ان کی تحریر خاصی مشکل اور عربی فارسی ترکیبوں سے بوجھل ہوتی تھی۔

کچھ اپنی اُردو فارسی سے واقفیت کے طفیل، اور کچھ ماحول کی برکت سے، جب بھی میرا اسلامیات کا مطالعہ غیر معمولی طور پر وسیع تھا، لیکن یہ سب محدود تھا اُردو کتابوں تک۔ میں اس زمانے میں عربی سے قطعاً نابلد تھا اور کبھی اسے پڑھنے کی طرف خیال بھی نہیں گیا تھا۔ اب نگار میں ہر مہینے اسلامی موضوعات پر مضامین دیکھنے کے بعد میرے دل میں قرآن پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چونکہ اصلی عربی متن پڑھنا ممکن نہیں تھا، میں نے ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے ترجمے سے یہ کمی پورا کرنے کی کوشش کی۔ مشکل یہ تھی کہ نیاز جس طرح قرآنی آیات کی تفسیر اور اسلامی مسائل کی تشریح کرتے تھے، وہ عام مصنفین سے الگ، بلکہ بہت حد تک ان کے مخالف ہوتی تھی۔ اس سے ذہنی خلش کا پیدا ہونا لازمی بات تھی۔ بار بار دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ

کاشکے عربی کا اتنا علم ہوتا کہ میں خود یہ فیصلہ کر سکتا کہ نیاز راہِ راست پر ہیں یا دوسرے علماء۔

اس تمنا کے بر آنے میں بہت دن لگے۔ گجرات سے انٹر کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں بی اے میں تعلیم پانے کے لیے لاہور چلا آیا۔ یہاں ۱۹۲۸-۱۹۲۹ء کے دو برس میں نے قرآن پڑھنے میں صرف کیے۔ میں نے نصف سے زیادہ قرآن ایک جید عالم سے ترجمے اور تفسیر کے ساتھ پڑھا، بقیہ اس کے بعد مجھے اپنے طور پر پورا کرنا پڑا۔ پھر جب میں ۱۹۳۹ء میں مصر گیا، تو وہاں کے دس بارہ برس کے قیام سے مجھے اتنی عربی آ گئی کہ اب میں ترجمے کی مدد کے بغیر اسے براہِ راست پڑھنے اور سمجھنے لگا۔

مصر جانے سے قبل ہی میں نے ایک طویل مضمون "عورت اور اسلام" کے موضوع سے متعلق لکھا تھا۔ چونکہ میں اس کے بارے میں تفصیل سے ایک اور جگہ لکھ چکا ہوں، اس لیے اسے دُہرانا بے سود ہے۔ اس مضمون کا مسودہ میں نے نیاز کے پاس بھیجا۔ انھوں نے اسے پڑھا اور بڑے حوصلہ افزا الفاظ میں اس کی تعریف کی، اور کہا کہ اگرچہ بعض مسائل میں مجھے آپ سے اختلاف ہے، لیکن نتائج کے اخذ کرنے میں آپ کا بھی اتنا ہی حق ہے، جتنا میرا۔ لہٰذا آپ اسے اسی صورت میں چھپوا ڈالیے۔ چونکہ مجھے اس کی کوئی جلدی نہیں تھی، اس لیے یہ مسودہ مدتوں پڑا رہا۔ بہت دن بعد جب میں بغداد میں تھا، میں نے اسے ان کی خدمت میں بھیج دیا، اور انھوں نے اسے اپنے تعارف کے ساتھ ۱۹۵۱ء میں "عورت اور اسلامی تعلیم" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کر دیا۔

میری اس کتاب کی اسلامی حلقوں میں جیسی کچھ حوصلہ افزا پذیرائی ہوئی، اور جس طرح سے اس پر بعض مشہور علما نے تعریفی تبصرے کیے، وہ میری توقع سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے۔ لیکن یہ بھی امرِ واقع ہے کہ مجھے مقالہ لکھنے کی جرأت منجملہ اور اسباب کے نگار کے مطالعہ کے بعد ہوئی تھی۔ اگر میں نگار کے آزادانہ اور اجتہادی طریقۂ استدلال سے مانوس نہیں ہو گیا ہوتا، تو

اوّل تو کبھی یہ مقالہ وجود میں نہ آتا؛ اور اگر لکھا بھی جاتا، تو اس میں کوئی جدت نہ ہوتی؛ زیادہ سے زیادہ غالباً پیشرو مصنّفوں کی باتیں نئے پیرایے سے اپنے الفاظ میں لکھ دیتا۔

غرض میری ذہنی تربیت میں غیر شعوری طور پر نگار اور صاحبِ نگار کا بہت ہاتھ رہا ہے۔ یہ بھی حسنِ اتفاق ہے کہ غالب سے متعلق میرا سب سے پہلا مضمون بھی نگار ہی میں شائع ہوا۔ ہوا یہ کہ ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم نے نگار میں "غالب کی ذہنیت" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ یہ دو قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے غالب پر کچھ نکتہ چینی کی تھی۔ بعض حلقوں نے اسے ناپسند کیا اور اس سے ایک لمبی بحث کا آغاز ہو گیا۔ اس مضمون میں انھوں نے بسبیل تذکرہ ذوق پر بھی کچھ لے دے کی تھی۔ غالب کی عظمت اپنی جگہ، لیکن ذوق پرور مجھے کچھ بھٹکا سا معلوم ہوا۔ اس پر میں نے ایک مختصر سا مضمون "ذوق اور غالب" کے عنوان سے لکھا، جو چند ماہ بعد نگار کے ۱۹۲۶ء کے کسی شمارے میں چھپا تھا۔ اس زمانے میں کسی مضمون کا نگار میں چھپ جانا بہت بڑی سند خیال کی جاتی تھی۔ اس لیے قدرتاً مجھے بہت مسرت ہوئی۔ یہ میرا سب سے پہلا مضمون ہے، جو نگار میں چھپا

اگرچہ نیاز سے خط و کتابت کے تعلقات ۱۹۲۴ء ہی میں قائم ہو گئے تھے، لیکن پہلی ملاقات ۱۹۲۶ء میں ہوئی اور اس کے بعد بارہا ملنے کے مواقع پیدا ہوتے رہے اور بتدریج ہمارے تعلقات بتدریج بہت یگانگت کے ہو گئے۔ اگرچہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے خطوط تقسیم ملک کے ہنگامے میں ضائع ہو گئے، لیکن میرا اندازہ ہے کہ اب بھی میرے پاس ان کے دو ڈھائی سو سے کم خطوط نہیں ہونگے۔

نیاز کا مکتوب نگاری کا اسلوب بہت دلکش ہے۔ جدید ترکیبیں، تاریخی واقعات کی تلمیحیں، اساتذہ کے اشعار اور مصرعے یا ان کے ٹکڑے، ہلکا سا مزاح، ان کے خطوط کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سب خط فرضی ہیں، یعنی

یہ کسی کے نام نہیں لکھے گئے۔ خدا معلوم اس بدگمانی کا باعث کیا ہے، ان میں سے بعض خطوط خود میرے نام لکھے گئے تھے۔ بہرحال ان سب باتوں سے قطع نظر ان کی انشا اتنی دلفریب اور بدیع ہے کہ ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد انھیں ختم کیے بغیر ہاتھ سے رکھ دینا ممکن نہیں۔

لکھنؤ آنے کے بعد نیاز نے کئی کتابیں شائع کیں۔ بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ وہ دائرہ المعارف یا انسائیکلوپیڈیا سے بے حوالہ نقل اور ترجمہ کر لیتے تھے۔ یہ عین ممکن ہے کہ انھوں نے ہر جگہ اپنے ماخذ کا حوالہ نہ دیا ہو۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر کوئی انسان برسوں کسی موضوع سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کرتا رہے اور آخر میں خود ایک کتاب تالیف کر دے، جو گویا اس کے تمام مطالعے کا نچوڑ ہے، تو وہ کون کون سی کتاب کا حوالہ دے سکتا ہے؟ اور کیا اس صورت میں یہ بات ضروری بھی ہے کہ وہ ان سب کتابوں کے نام گنائے جو اس کے زیرِ مطالعہ رہ چکی ہیں؟

اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ انھوں نے صوفی، منڈی بہاء الدین کی فرمایش اور اصرار پر ایک کتاب "صحابیات" لکھی۔ اس سے پہلے اسی موضوع سے متعلق مولانا عبدالسلام ندوی کی کتاب "سیرۃ الصحابیات" شائع ہو چکی تھی۔ اس پر لوگوں نے شور مچایا کہ نیاز نے پہلی کتاب کی نقل کر لی ہے۔ حالانکہ نیاز کی کتاب پہلی سے تقریباً دوگنی ہے، اور اس میں کہیں زیادہ تراجم شامل ہیں؛ انفرادی تذکروں میں بھی حالات بہت جگہ زیادہ ہیں۔ لیکن اصلی مشکل اور تھی۔ صحابیات کے حالات کے لیے ماخذ تو بہرحال ایک ہی تھے۔ وہی سیرۃ الصحابیات کے مؤلف نے استعمال کیے، وہی صحابیات کے لکھنے والے نے۔ ناگزیر تھا کہ کہیں نہ کہیں توارد ہو جاتا کیونکہ عربی عبارت کا ترجمہ کرنے میں لامحالہ ایک ہی طرح کے جملے اور الفاظ استعمال کرنا پڑینگے۔ لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی، یہ الزام عائد کر دیا گیا کہ نیاز نے پہلی کتاب کی نقل کر لی ہے۔

۱۹۳۲ء کے ہنگامے کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک کتاب "من ویزداں" شائع کی تھی۔ یہ دراصل مختلف موضوعات سے متعلق مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں انھوں نے اخلاقیات، الٰہیات، معتقدات کے بارے میں اپنے خیالات قلمبند کر دیے ہیں۔ مذہبیات سے متعلق نہایت درجہ عقلی طریقے پر بحث کی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم مصنف کی ہر ایک رائے سے متفق ہی ہوں؛ لیکن اگر آپ اسے غور سے مطالعہ کریں، تو ناممکن ہے کہ ان کے خلوص اور بے غرضی سے انکار کر دیں۔

اب ان کی حیثیت اردو ادب کے مرد بزرگ کے طور پر تسلیم کر لی گئی تھی۔ حکومت نے بھی ان کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف کیا اور اپریل ۱۹۶۲ء میں انھیں "پدم بھوشن" کے خطاب سے نوازا، جس کے وہ ہر لحاظ سے مستحق تھے۔

نیاز سیاسی مسائل میں بھی بہت آزاد رائے کے مالک تھے۔ ملک تقسیم ہوا، اور ان کے خاندان کے بہت سے لوگ پاکستان چلے گئے، لیکن وہ اپنی جگہ پر جمے رہے۔ نگار میں ان کے سیاسی اداریے پڑھنے کی چیز ہوا کرتے تھے۔ ان کا ہرگز ارادہ نہیں تھا کہ ہندستان چھوڑ کر پاکستان چلے جائیں، حالانکہ اس کے بہت مواقع پیدا ہوئے۔ لیکن روز بروز ان کی صحت خراب ہوتی گئی۔ کچھ شدید خانگی پریشانیاں بھی لاحق ہو گئیں۔ اب انھیں رہ رہ کر اس بات کا خیال آنے لگا کہ موت تو اٹل ہے اور ایک نہ ایک دن آ کر رہیگی، میرے بعد میری بیوی اور ان خردسال بچوں کا کیا حشر ہو گا۔ اس تشویش نے ان کی صحت پر ناگوار اثر کیا۔ آخر کار انھوں نے فیصلہ کیا کہ ہر پہلو سے یہی بہتر ہے کہ میں پاکستان چلا جاؤں۔ چنانچہ جولائی ۱۹۶۲ء میں وہ بیوی بچوں سمیت کراچی چلے گئے۔ ان کے کردار کی مضبوطی کا ایک اور ثبوت ملاحظہ ہو۔ جولائی کا نگار یہاں ہندستان میں شائع ہوا تھا، اور اگست کا پرچہ انھوں نے کراچی پہنچنے کے بعد وہاں سے شائع کیا۔

کراچی کی آب و ہوا انھیں بہت راس آئی۔ تندرستی بہتر ہوگئی، بھوک لگنے لگی، کام کاج میں بھی پھر اسی باقاعدگی اور مستعدی کا اظہار کرنے لگے، جس کے وہ عمر بھر عادی رہے تھے۔ نگار نے بھی وہاں بہت ترقی کی۔ اشتہار ملنے لگے، اور پرچہ محکمۂ تعلیم نے اپنی مصدّقہ فہرست میں شامل کر لیا۔ خود نیاز روزنامہ جنگ (کراچی) میں ایک کالم مستقل لکھنے لگے۔ مزید برآں نیشنل میوزیم، کراچی کے مخطوطات کی فہرست کی ترتیب ان کے سپرد ہوئی، جس کے وہ ہر طرح سے اہل تھے۔

لیکن عمر کے تقاضوں کو کون ٹال سکتا ہے! موت برحق ہے اور یہ بنی آدم کی میراث ہے جب اس کا وقت آجاتا ہے، تو یہ کسی کے ٹالے نہیں ٹلتی، نیاز فتح پوری اپنی عمر بھر ہر ایک چیز کے خلاف جہاد کرتے رہے، لیکن موت کو وہ بھی مانتے تھے، اور جب ان کا وقت آگیا، تو وہ بھی چل بسے۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

دسمبر ۱۹۶۵ء میں ان کے چہرے پر ورم کے آثار نمودار ہوے۔ ابتدا میں اسے معمولی شکایت خیال کیا گیا۔ پھر تشخیص ہوئی کہ سرطان (کینسر) کا موذی عارضہ ہے۔ عمل جراحی بظاہر کامیاب رہا اور اس کے بعد وہ ہر طرح صحتیاب ہوتے دکھائی دینے لگے۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ یہ محض سنبھالا ہے۔ آخرکار اسی میں وہ ۲۴ مئی ۱۹۶۶ء کو اس سفر پر روانہ ہوگئے، جس سے کوئی واپس نہیں آیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔

انھوں نے ہندستان کے معیار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خاصی لمبی عمر پائی۔ ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۴ء سالِ ولادت تھا، اور ۱۳۸۶ھ/ ۱۹۶۶ء سالِ وفات؛ گویا قمری حساب سے ۸۴ سال اور میلادی سے ۸۲۔ جہاں عام تناسب ۲۰ - ۲۵ سال کا ہو، وہاں اتنی عمر کو نعمتِ غیر مترقبہ تصور کرنا چاہیے۔

لیکن اصلی چیز ماہ و سال کی طوالت نہیں، بلکہ یہ کہ مرنے والے نے اس فرصت کا استعمال کیسے کیا، اس کے اچھے یا برے اعمال کیسے رہے؛ جس میدان میں کام کیا،

اس کے معیار اور سطح کے بلند کرنے میں اس کا کتنا حصہ رہا! جس حلقے میں بسر کی، کیا ان لوگوں کی مسرتوں میں اس کی وجہ سے کچھ اضافہ ہوا، یا ان کی آرزوؤں کے بر لانے میں اس نے کچھ مدد دی! یہ وہ سوال ہیں، جن کے جواب — مثبت یا منفی — پر کسی زندگی کی کامیابی یا ناکامی سے متعلق کوئی حکم لگایا جا سکتا ہے؛ ورنہ گزرنے کو تو بہر حال ہر کسی کی گزر ہی جاتی ہے؛ سورج کا طلوع و غروب تو کسی کے حکم کا پابند نہیں!

نیاز کا سب سے بڑا کارنامہ اردو زبان کی خدمت ہے۔ اسی پہلو سے ان کا نام یادگار رہیگا اور اسی میدان میں اُن کے اچھے برے کام کی بنا پر ہمیں ان کی زندگی سے متعلق فیصلہ کرنا چاہیے۔

نیاز نے اپنی زندگی میں بہت بُت توڑے — ادبی، سماجی، مذہبی۔ کافر انھیں مومن اور مومن انھیں کافر سمجھتے رہے، حال آنکہ وہ صرف انسان تھے۔ اور انسان، ایک اچھا انسان بننے ہی کو وہ معراجِ حیات خیال کرتے تھے۔ آج وہ اس جگہ پہنچ چکے ہیں جہاں بالآخر ہم سب کو جانا ہے؛ صرف باری کا فرق ہے، کوئی آگے، کوئی پیچھے۔ ہمارا کوئی حق نہیں کہ ہم ان کے اعمال پر حکم لگائیں۔ خود شیشے کے مکان میں بیٹھے ہوئے ہم کسی پر پتھر پھینکنے والے کون ہوتے ہیں! میں نے اپنی زندگی میں آدھی دنیا کے طرح طرح کے لوگ دیکھے ہیں — متقی، پرہیزگار بھی اور رندِ بادہ خوار بھی؛ خدا کا نام سن کر کانپ اٹھنے والے بھی، اور ملحدِ خالص بھی۔ لیکن سچ مانیے کہ انسان بہت کم دیکھے۔ اس بہت مختصر تعداد میں نیاز بھی شامل تھے۔

جگرم بے تو کباب است، تو ہم می دانی

دلِ دیوانہ خراب است، تو ہم می دانی

دوستی نیست کہ در باغ نفشینم بیتو

باغ بے دوست عذاب است، تو ہم می دانی

وہ صورتیں الٰہی

بامیدِ تو کنم صبر، ولیکن چه کنم
عمر در عین شتابست، تو هم می‌دانی

هم از آن تشنه نوازی که لبت کرد شبے
جانِ من در شکر آبست، تو هم می‌دانی

از حسن این چه سوالست که معشوقِ تو کیست؟
این سخن را چه جوابست، تو هم می‌دانی

غلام رسول مہر

۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء کو مولانا غلام رسول مہر کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے لاہور میں انتقال ہو گیا۔

نئی نسل کے، خصوصاً ان لوگوں نے جو آج پچیس کے پیٹے میں ہیں، یہ ایک سطری خبر پڑھی یا سنی ہوگی؛ لیکن انھیں کیا معلوم کہ غلام رسول مہر کون تھے؟ انھوں نے اردو صحافت کی کیا خدمت کی؟ اور علم و ادب میں کیا اضافہ کیا؟ ملکی سیاست میں اُن کا کتنا حصّہ تھا؟ اور حقیقت یہ ہے کہ میں بھی اس مختصر تحریر میں ان سب سوالوں کا تشفی بخش جواب کہاں دے سکتا ہوں!

مولانا غلام رسول ۱۵ اپریل ۱۸۹۵ء کو مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر سے چار میل دور ایک چھوٹے سے گاؤں پھولپور میں پیدا ہوئے۔ گھر میں کچھ موروثی زمینداری تھی اور یہی خاندان کی بسر اوقات کا ذریعہ تھی۔ پھولپور آج بھی مختصر سی بستی ہے؛ اس زمانے میں تو اور بھی چھوٹی ہوگی۔ یہاں تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ یہ جب پانچ چھ برس کے ہوئے، تو قریب کے ذرا بڑے گاؤں کے مدرسے میں بھیج دیے گئے۔ اس کے بعد جالندھر شہر کے مشن ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۱ء میں دسویں درجے کی سند

لے کر لاہور منتقل ہو گئے۔ اسلامیہ کالج اس زمانے میں مسلمان طلبہ میں بہت ہر دلعزیز تھا۔ یہ بھی انٹر کے درجے میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۱۵ء میں یہیں سے بی۔ اے کی سند لی۔

وہ ابھی انٹر کے طالب علم تھے کہ جولائی ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اپنا مشہور ہفتہ وار الہلال، کلکتے سے جاری کیا۔ الہلال بلا مبالغہ اردو صحافت میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا سائز، ٹائپ کی چھپائی، کاغذ، تصاویر، مضامین کی تبویب، مختلف ممالک سے اس کے نامہ نگاروں کے مراسلات — غرض اس کی کس کس ادلیت کا ذکر کیا جائے! یہ سب باتیں اپنی جگہ، لیکن اس کی دو خصوصیتیں ناقابلِ فراموش ہیں: اول، اس کا اسلوبِ تحریر۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا خطیبانہ انداز جس میں نصّ و حدیث سے ایسا برجستہ استدلال تھا کہ اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کے دل میں آگ لگا دی، جن کے لیے در اصل یہ پرچہ جاری کیا گیا تھا۔ دوسرے، اس کی حکومت کے خلاف نکتہ چینی اور قوم پرور انہ بلکہ کانگریس کی مؤید پالیسی تھی۔ سر سیّد کے زمانے سے مسلمانوں کا مطمحِ نظر ایک ہی رہا تھا: انگریز دوستی اور کانگریس دشمنی۔ اسی لیے اعلیٰ تعلیمیافتہ طبقے کے مٹھی بھر لوگوں سے قطعِ نظر مسلمان من حیث القوم کانگریس سے الگ تھلگ رہے؛ اور تیس برس تک کسی کو اس کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ مولانا آزاد نے سب سے پہلے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور چونکہ انھوں نے اپنی تائید میں پوری قوت سے قرآن و حدیث کو لاکھڑا کیا، کسی کو کچھ کہتے نہ بنی۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا محمود الحسن دیوبندی کو یہ کہنا پڑا کہ آزادی کا جو سبق ہم بھلا چکے تھے، وہ ہمیں مولانا ابوالکلام آزاد اور الہلال نے یاد دلایا۔

مہر بھی الہلال کے خریدار بن گئے اور اپنے ہزاروں معاصرین کی طرح اس کے والہ و شیدا ہو گئے۔ مولانا آزاد نے اس کے علاوہ مسلمانوں کو منظم کرنے کے لیے ایک تحریک چلائی تھی، جس میں شامل ہونے والے سے بعض شروط پر بیعت لی جاتی تھی۔ مولانا عبدالرزاق

ملیح آبادی نے اپنی کتاب "ذکر آزاد" میں بیعت کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَبِمَا جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ وَاٰمَنْتُ بِالرَّسُوْلِ اللّٰہِ وَ بِمَا جَاءَ مِنْ عِنْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ وَاَسْلَمْتُ وَاَقُوْلُ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔

بیعت کرتا ہوں میں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بواسطۂ خلفاء اور تابعین کے اس پر کہ

(۱) اپنی زندگی کی آخری گھڑی تک کلمۂ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اعتقاد اور عمل پر قائم رہونگا، اگر استطاعت پائی۔

(۲) پانچ وقت کی نماز قائم رکھونگا۔ رمضان کے روزے رکھونگا، زکوٰۃ اور حج ادا کرونگا، اگر استطاعت پائی۔

(۳) ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں نیکی کا حکم دونگا برائی کو روکونگا، صبر کی وصیت کرونگا۔

(۴) میری دوستی ہوگی تو اللہ کی راہ میں، دشمنی ہوگی تو اللہ کی راہ میں۔

(۵) اور بیعت کرتا ہوں اس بات پر کہ ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں، اپنی جان سے، اپنے مال سے، اپنے اہل و عیال سے، دنیا کی ہر نعمت اور دنیا کی ہر لذت سے زیادہ اللہ کو، اس کے رسول کو، اس کی شریعت کو، اس کی امت کو محبوب رکھونگا۔ اور اس کی راہ میں جو حکم کتاب و سنت کے مطابق دیا جائیگا، سمع و الطاعۃ کے ساتھ اس کی تعمیل کرونگا۔

یہ جماعت حزب اللہ کہلاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس سے مقصود مسلمانوں کی اصلاح اور انھیں دین کے احکام کا پابند اور ان پر عامل بنانا تھا۔ مہر صاحب بھی الہلال کے

خریدار کی حیثیت سے اس تحریک سے ناواقف نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ وہ بھی حزب اللہ کے رکن بن گئے۔ ان تمام اراکین کے نام اور پتے ایک رجسٹر میں درج کیے جاتے تھے، جو مولانا آزاد کے دفتر میں محفوظ رکھا گیا تھا۔

مہر صاحب نے ۱۹۱۵ء میں بی۔ اے پاس کر لیا۔ اب تلاشِ روزگار کی مہم شروع ہوئی اس زمانے میں ریاست حیدرآباد تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ملجا و ماویٰ تھی۔ اس ریاست کا رقبہ بیاسی ہزار مربع میل تھا، جو یورپ کے کئی ممالک سے زیادہ تھا۔ نظام حیدرآباد کے بعض امرا و عمائد کے پاس بڑی بڑی جاگیریں اور پائگاہیں تھیں، جن کا ہزارہا ایکڑ کا رقبہ تھا اور ان کی لاکھوں کی آمدنی تھیں۔ یہ امیر اپنی اپنی جاگیر میں خود مختار تھے اور ان کی حیثیت کسی چھوٹے موٹے حکمران اور نواب سے کم نہیں تھی۔

ایسے ہی ایک امیر وقارالامرا تھے۔ انھوں نے اپنی جاگیر میں رعایا کی تعلیم کے لیے مدارس اور تعلیم کا معقول انتظام کر رکھا تھا۔ مہر صاحب کو بھی انھیں کی پائگاہ میں انسپکٹر مدارس کی ملازمت مل گئی۔

یہ پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء) کا زمانہ تھا۔ جب نومبر ۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوئی، تو اتحادیوں نے دورانِ جنگ کے تمام وعدے بھلا کر ترکی پر دھاوا بول دیا، جو جنگ میں جرمنی کا حلیف اور اتحادی طاقتوں کا حریف رہا تھا۔ سلطانِ ترکی عالمِ اسلام کے خلیفۃ المسلمین تھے۔ اتحادیوں کی اس معاندانہ روش سے دنیا بھر کے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ہندستان کے مسلمان خاص طور پر انگریزوں کے خلاف ہو گئے، کیونکہ انگریزی فوج میں ہندی مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد نے مختلف محاذوں پر لڑائی میں حصّہ لیا تھا۔

یہ مہر صاحب کی جوانی کا زمانہ تھا۔ وہ بھی اس صورتِ حال پر تلملا اٹھے۔ بعض مقامی دوستوں کے مشورے سے انھوں نے ایک اخبار جاری کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کا نام سلطنت

تجویز ہوا تھا۔ جب مالی پہلو سے اطمینان ہو گیا، تو انھوں نے اسے جاری کرنے کی درخواست داخل کر دی۔

اُدھر مولانا ابوالکلام آزاد کا اخبار الہلال ہر ہفتے آگ اُگل رہا تھا۔ ایک طرف وہ مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات اور اُن کی پرانی تاریخ کی روایات کی طرف بلاتا؛ دوسری طرف یورپی حکومتوں کی اسلام دشمنی اور ترکی سے عناد پر سخت نکتہ چینی کرتا۔ حکومت پر مخفی نہیں تھا کہ الہلال کی ان تحریروں کا اثر کتنا دور رس ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے نومبر ۱۹۱۴ء میں الہلال کی دو ہزار کی وہ ضمانت ضبط کر لی جو اس سے ستمبر ۱۹۱۳ء میں حادثۂ مسجد کانپور کے بعد لی گئی تھی۔ اس پر مولانا آزاد نے اخبار بند کر دیا۔ سال بھر بعد انھوں نے نومبر ۱۹۱۵ء میں "البلاغ" کے نام سے دوسرا پرچہ جاری کیا، جو نام کے اختلاف کے ماسوا ہر طرح الہلال کا مثنیٰ تھا۔ جنگ ہنوز جاری تھی، بلکہ اتحادی افواج جرمنوں کی یلغار اور پیش قدمی کے سامنے ہر جگہ پسپا ہو رہی تھیں۔ ایسے میں حکومت کیوں کر خاموش رہ سکتی تھی! حکومتِ بنگال نے ۲۳ مارچ ۱۹۱۶ء کو مولانا آزاد کو حکم دیا کہ وہ ایک ہفتے کے اندر صوبۂ بنگال سے باہر چلے جائیں۔ پنجاب، یوپی وغیرہ کی حکومتیں ان کے اپنے ہاں داخلے پر پہلے سے پابندی عائد کر چکی تھیں۔ انھوں نے ہر طرف کے دروازے بند دیکھ کر رانچی (بہار) کا رُخ کیا اور یہاں قریب کے ایک قریے مورابادی میں رختِ سفر کھول دیا۔ انھیں یہاں آئے تین مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو حکومت نے انھیں یہیں نظر بند کر دیا۔

مولانا آزاد جب مارچ ۱۹۱۶ء میں کلکتے سے روانہ ہوئے تو اُن کے گھر اور دفتر کی تلاشی لی گئی اور پولیس نے ان کے تمام مسودات اور کاغذات اور الہلال سے متعلقہ رجسٹر وغیرہ اپنے قبضے میں کر لیے۔ انھیں میں وہ رجسٹر بھی تھا، جس میں حزب اللہ کے اراکین

کے نام درج تھے۔ مولانا مہر کا نام بھی ان میں تھا۔ حکومت کی نظر میں یہ تمام لوگ مشتبہ قرار پائے۔ مختلف صوبائی حکومتوں کو حکم موصول ہوا کہ ان سے متعلق تحقیق کی جائے اور ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کی جائے۔ اس پر مولانا مہر سے متعلق بھی پوچھ گچھ شروع ہوئی، تو نشدہ شدہ معلوم ہوا کہ وہ حیدرآباد میں مقیم ہیں۔ فائل اُن کے تعاقب میں حیدرآباد پہنچی۔ تفتیش پر کھلا کہ انھوں نے ایک اخبار "سلطنت" کے ڈیکلریشن کی درخواست دے رکھی ہے، جو زیرِ غور ہے۔ حکومت جو مولانا آزاد کے اخبار الہلال سے تنگ آچکی تھی، بھلا اُن کے کسی مرید کے اخبار کی اجازت کیوں دینے لگی تھی! چنانچہ ان کی درخواست نامنظور ہو گئی۔

۱۹۲۰ء میں مہر صاحب حیدرآباد سے ملازمت ترک کر کے واپس پنجاب چلے آئے۔ یہ کانگریس اور خلافت کی تحریکوں کے شباب کا زمانہ تھا۔ یہ بھی وطن پہنچ کر خلافت کی سرگرمیوں میں حصّہ لینے لگے، اور بالآخر جالندھر خلافت کمیٹی کے سکرٹری مقرر ہو گئے۔ جالندھر کے قیام اور خلافت کمیٹی میں کام کے زمانے میں انھیں پھر اپنا اخبار جاری کرنے کا خیال آیا۔ بعض دوستوں نے صلاح دی کہ بہتر ہو، اگر تجربہ حاصل کرنے کو پہلے کسی دوسرے اخبار میں کام کیا جائے۔ یہ کام جالندھر میں رہ کر نہیں ہو سکتا تھا۔ صحافت کا مرکز لاہور تھا اور یہاں اس وقت مولانا ظفر علی خان اور ان کے روزنامے "زمیندار" کا طوطی بولتا تھا۔

زمیندار شروع میں ہفتہ وار پرچہ تھا جسے ظفر علی خان کے والد مولوی سراج الدین احمد خان نے جاری کیا تھا۔ یہ پہلے تھوڑی مدّت لاہور سے شائع ہوتا رہا، لیکن بعد کو وہ اسے اپنے وطن کرم آباد (ضلع گوجرانوالہ، مغربی پنجاب) لے گئے۔ اس زمانے میں زمیندار واقعی اسم بامسمّیٰ تھا۔ اس میں کھیتی باڑی کے فروغ اور کسانوں کی معاشی اور معاشرتی اصلاح کے نقطۂ نظر سے مضامین شائع ہوتے تھے۔ دسمبر ۱۹۰۹ء میں مولوی سراج الدین

احمد خان کا انتقال ہو گیا۔ ظفر علی خان نے والد کی وصیت کے احترام میں زمیندار کو زندہ رکھنے کا تہیہ کر لیا۔ لیکن ہفتہ وار اخبار اور وہ بھی دیہی نوعیت کا اور اس پر وہ شائع بھی ہو کرم آباد کے سے کوردہ سے ــــ یہ ان کی جولانیٔ طبع کے لیے کافی نہیں تھا۔ ادھر لاہور کے احباب بھی مصر تھے کہ وہ لاہور منتقل ہو جائیں۔ قصہ کوتاہ انھوں نے مئی ۱۹۱۱ء میں کرم آباد کو خیرباد کہا اور اس کے بعد ہفتہ وار زمیندار اور پنجاب ریویو ماہنامہ (جسے انھوں نے اگست ۱۹۱۰ء میں کرم آباد ہی میں جاری کیا تھا) لاہور سے شائع ہونے لگے۔ مختلف یورپی اقوام کے اسلامی ممالک کے خلاف جارحانہ اقدام کا یہی زمانہ تھا۔ اوّل، اٹلی نے ۱۹۱۱ء میں طرابلس الغرب (لیبیا) پر حملہ کر دیا۔ مولانا ظفر علی خان نے اکتوبر ۱۹۱۱ء میں زمیندار کو روزانہ کر دیا۔ اس دور کا پہلا شمارہ ۵ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو شائع ہوا تھا۔

۱۹۱۲ء میں بلقان کی متعدد ریاستوں نے متحدہ محاذ بنا کر ترکی کے یورپی حصے پر دھاوا بول دیا اور اڈریانوپل (ادرنہ) پر قبضہ کر لیا۔ اس سے ہندی مسلمانوں میں جوش و خروش پیدا ہونا ہی چاہیے تھا۔ لیکن اسے ہوا دینے میں ظفر علی خان کی تحریر و تقریر کا بہت ہاتھ تھا۔ ان کا اخبار زمیندار ان کی آواز کو ملک کے کونے کونے تک پہنچانے لگا۔ حادثۂ مسجد مچھلی بازار، کانپور (اگست ۱۹۱۳ء)، پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴-۱۹۱۸ء)، رولٹ ایکٹ (۱۹۱۹ء)، جلیانوالہ باغ، امرتسر کا خونین ڈرامہ (۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء) صرف چند واقعات ہیں، جنھوں نے زمیندار کو اور اس کے مدیر کو ہر دلعزیزی کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ لیکن اب وہ حکومت کی آنکھوں میں بھی خار کی طرح کھٹکنے لگے۔ زمیندار اور اس کے مطبع کی ضمانت کئی بار ضبط ہوئی، جسے مولانا کے عشاق نے ہمیشہ چند دن میں جمع کر کے ان کی جھولی میں ڈال دیا۔ جب سب وار خالی گئے، اور مولانا ظفر علی خان کی شعلہ نوائیوں میں کسی طرح کمی نہ آئی، تو بالآخر حکومتِ پنجاب نے ستمبر ۱۹۲۰ء میں خود

انھیں گرفتار کر کے دو برس کے لیے جیل بھیج دیا۔

یہ صورتِ حال مولانا ظفر علی خان کے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔ انھوں نے پیش بندی کے طور پر چار پانچ مہینے پہلے نئے ایڈیٹر کا انتظام کر لیا تھا۔ مولانا عبدالمجید سالک اس زمانے میں سیّد ممتاز علی (سید امتیاز علی تاج کے والد) کے ادارے دارالاشاعت سے وابستہ اور ان کے اخبارات 'پھول' اور 'تہذیب نسواں' کے ایڈیٹر تھے۔ مولانا ظفر علی خان نے انھیں زمیندار کے ادارۂ تحریر میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ سالک صاحب اپنی ملازمت اور مالی حالت سے مطمئن تھے اور دارالاشاعت کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن انھیں ظفر علی خان کے اصرار کے سامنے سر جھکاتے ہی بنی۔ سیّد ممتاز علی نے بھی بطیبِ خاطر انھیں جانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ یکم مئی ۱۹۲۰ء کو وہ زمیندار کے دفتر پہنچ گئے۔ وہ تھوڑے دن بعد مدیر مسئول مقرر ہو گئے۔ اور جب ستمبر ۱۹۲۰ء میں ظفر علی خان جیل گئے، تو وہ اب اخبار کے گویا ہر لحاظ سے کرتا دھرتا بن گئے۔

یہ پکڑ دھکڑ کا زمانہ تھا اور زمیندار خاص طور پر انگریزی حکومت کے نزدیک گردن زدنی قرار دیا جا چکا تھا۔ یکے بعد دیگرے اس کے کئی ایڈیٹر گرفتار ہوئے، لیکن یہ کچھ ایسا سخت جان ثابت ہوا کہ اسے کبھی قابل ایڈیٹر کی کمی محسوس نہ ہوئی۔ سالک صاحب جب زمیندار کے اڈیٹر مقرر ہوئے ہیں، تو ان کی عمر ۲۵ سال کی تھی۔ لیکن انھوں نے ایسی قابلیت اور سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا کہ پرانے اور تجربے کار صحافی بھی ان کا لوہا مان گئے۔ حکومت بھی تاک میں تھی۔ وہ ان ایام میں زمیندار کے چیف ایڈیٹر تھے اور اس کا اداریہ لکھا کرتے تھے۔ بالآخر ایک اداریہ حکومت کی نظر میں قابلِ اعتراض ٹھہرا۔ جس نومبر ۱۹۲۱ء کے شروع میں انھیں تحریکِ عدم تعاون کے کارکن کی حیثیت سے گرفتار کر لیا گیا اور فیصلے میں ایک سال کی سزا ہو گئی۔

اس زمانے میں زمیندار کے مینیجر شفاعت احمد صاحب تھے اور سید عبدالقادر شاہ،

اسلامیہ کالج میں تاریخ کے پروفیسر ان کے دلی دوست اور دست راست۔ سالک صاحب کی گرفتاری اور قید کے بعد ان دونوں کی نظر مہر صاحب کی طرف گئی۔ انھوں نے اصرار سے مہر صاحب کو لاہور بلایا۔ ان دوستوں کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے وہ نومبر ۱۹۲۱ء میں لاہور آگئے، اور زمیندار کے اڈیٹر مقرر ہو گئے۔ لیکن وہ یہاں مشکل سے ہفتہ بھر رہے ہوں گے۔ ہوا یہ کہ ان کے بعض بزرگ پھولپور سے لاہور پہنچ گئے، اور انھیں مجبور کیا کہ وہ زمیندار سے مستعفی ہو جائیں اور ان کے ساتھ وطن واپس چلیں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ اس زمانے میں زمیندار کی ایڈیٹری پھولوں کی سیج نہیں تھی۔ عین ممکن تھا کہ جس طرح ان سے پہلے کے تمام ایڈیٹر گرفتار ہو گئے تھے، مہر صاحب بھی اپنی آزادی سے محروم ہو جاتے۔ غالباً ان کے اعزہ نے بھی اسی خطرے کا احساس کر کے انھیں اس نوکری سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا۔ لیکن مجھے شبہہ ہے کہ بات اس سے زیادہ تھی اور اس پردۂ زنگاری میں کوئی معشوق بھی کام کر رہا تھا۔ مہر صاحب، جیسا کہ لکھ چکا ہوں، ایک زمیندار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ انگریزی حکومت کا اس طبقے پر جو اثر تھا، اس کا اندازہ آج کی نسل نہیں کر سکتی۔ یقیناً حکومت نے اپنے کل پرزوں کا پورا زور لگا دیا ہو گا۔ القصہ مہر صاحب زمیندار سے مستعفی ہو کر پھولپور چلے گئے۔ ادھر حکومت نے چند روز بعد پھر زمیندار کی ضمانت ضبط کر لی اور اخبار کی اشاعت کلیتہً بند ہو گئی۔

تین ماہ بعد فروری ۱۹۲۲ء میں زمیندار کے پھر شائع کرنے کا انتظام مکمل ہو گیا۔ تو اب مہر صاحب دوبارہ مستقلاً لاہور پہنچ گئے۔ چند مہینے بعد نومبر میں سالک صاحب بھی اپنی ایک سال کی قید کاٹ کر رہا ہوئے۔ اب مہر اور سالک کے اشتراک کا وہ دور شروع ہوا، جو بجا طور پر اردو صحافت کا زریں دور ثابت ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ زمیندار صحافت کی درسگاہ تھا۔ مولانا ظفر علی خان کو اردو، فارسی، عربی، انگریزی، چاروں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ اور وہ اردو اور فارسی

دونوں میں شعر بھی کہتے تھے۔ ان کے ساتھ جن اصحاب کو کام کرنے کا موقع ملا، وہ بعد کو اُردو کے مشہور اور کامیاب صحافی ثابت ہوئے۔ بھلا جس اخبار میں عبداللہ العمادی (خدا بندہ)، وحیدالدین سلیم پانی پتی، نیاز فتحپوری، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، مرتضیٰ احمد خان میکش، نصراللہ خان عزیز کے سے دیو قامت صحافیوں نے کام کیا ہو اور تجربہ حاصل کیا ہو، اس کی خدمات کبھی فراموش کی جا سکتی ہیں! یہاں ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

یہ واقع ہے کہ ظفر علی خاں بنیادی طور پر علمی اور ادبی آدمی تھے۔ ان کے سے انشاپرداز اردو نے بہت کم پیدا کیے، انھیں نظم و نثر پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی، اور فی البدیہہ شعر کہنے میں تو کوئی ان کا حریف تھا ہی نہیں۔ نئے نئے قافیے لکھنا کوئی ان سے سیکھے۔ اس کا دعویٰ خود انھوں نے بھی ایک شعر میں کیا ہے۔ کہتے ہیں:

عطا کیے طبعِ نکتہ رس نے مرے قلم کو سخنوری میں

خیال انوکھا، بیان اچھوتا، زمیں نئی اور روش نرالی

وہ اگر سیاست کے خارزار میں نہ الجھ گئے ہوتے اور یکسوئی سے علم و ادب اور صحافت ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رہتے تو آج ہماری زبان کا دامن کیسے کیسے گلہائے رنگ رنگ سے معطر اور مشکبو ہوتا۔ اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ میرے نزدیک یہی بات مولانا ابوالکلام آزاد اور حسرت موہانی اور شاید کسی حد تک مولانا محمد علی پر بھی صادق آتی ہے۔ کون بتا سکتا ہے کہ ان اصحاب کی شکل میں اردو ادب نے کتنی بڑی قربانی دی ہے، سیاست کی بارگاہ پر!

خیر، یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ مہر اور سالک کے قران السعدین نے روزنامۂ زمیندار کو کامیابی اور شہرت کے عروجِ کمال پر پہنچا دیا تو یہ قدرتی بات تھی۔ انھوں نے اردو صحافت کو چار چاند لگائے اور دوسرے اخباروں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ ثابت

ہوئے ۔ اخبار کا اداریہ مہر صاحب لکھتے تھے اور اس کا مزاحیہ کالم 'افکار و حوادث' کے عنوان سے سالک صاحب ۔ یہ سب کو تسلیم ہے کہ مہر صاحب کا سا مدلّل، ٹھوس اور بھرپور اداریہ کسی اخبار کو نصیب نہیں ہوا ۔ وہ صحیح معنی میں صحافی تھے ۔ بلکہ روایت ہے کہ ایک مجلس جس میں مولانا ظفر علی خان اور مہر کے علاوہ مولانا محمد علی جوہر بھی موجود تھے، مولانا محمد علی نے ظفر علی خان سے مخاطب ہو کر کہا کہ صاحب' آپ صرف انشا پرداز ہیں، صحیح معنوں میں صحافی یہ مہر صاحب ہیں ۔ سالک اپنے کالم میں ملک کے سیاسی' سماجی، معاشرتی مسائل پر طنز و مزاح کے انداز میں ایسا تبصرہ کرتے تھے کہ ان کا شکار اس کی چبھن سے تلملا بھی تھا اور زبان و بیان کے چٹخارے سے لذت اندوز بھی ہوتا تھا ۔

سالک کی دیکھا دیکھی اُن کے معاصرین نے بھی اپنے ہاں فکاہی کالم کا اضافہ کیا ۔ ان میں سے بعض کامیاب بھی رہے اور ان کے بعد کی نسل میں کچھ اصحاب کا اچھے مزاحیہ لکھنے والوں میں شمار کیا جا سکتا ہے؛ لیکن کیا اس سے انکار ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی بھی سالک کی بلندی کو نہیں پہنچا ۔ اس کے دو سبب ہیں ۔ اول' سالک صاحب عِلم آدمی تھے؛ ان کا مطالعہ بہت وسیع اور گوناگوں تھا ۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کے مزاحی ٹکڑوں میں بھی وقار اور وزن پیدا ہو جاتا تھا ۔ دوسرے، انہیں زبان پر مسلّمہ قدرت حاصل تھی ۔ ان سے محاورے اور روزمرّے کی غلطی کا امکان ہی نہیں تھا ۔ ان کی عبارت چست اور نوک پلک سے ایسی درست ہوتی کہ اس میں کہیں انگلی رکھنے کی گنجایش نہیں ہوتی تھی ۔ ایک چراغ حسن حسرت (سندباد) کو چھوڑ کر بتائیے' ان کے حریفوں میں کون اس معیار پر پورا اترا یا اتر سکتا تھا ۔

۱۹۲۷ء کے شروع میں مہر اور سالک کے مولانا ظفر علی خان کے صاحبزادے اختر علی خان سے کچھ اختلافات پیدا ہو گئے ۔ اختر علی خان کی سب سے بڑی پونجی یہ تھی کہ وہ ظفر علی خان کے بیٹے تھے ۔ اس کے سوا ان میں اپنے والد کی ایک صفت بھی تو نہیں تھی ۔ لیکن یہ بھی

امر واقع ہے کہ وہ اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے اور زمیندار کے بلا شرکت غیرے مالک تھے۔ مہر اور سالک نے بہت طرح دی، لیکن نہ صرف یہ کہ اختلافات رفع نہ ہوئے، بلکہ ظفر علی خاں نے بھی ان لوگوں کی شکایات سے التفات نہ کیا۔ مجبور ہو کر ان دونوں نے اواخر مارچ ۱۹۲۷ء میں زمیندار کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

مہر اور سالک دونوں علمی آدمی تھے۔ روزانہ اخبار کی بے پناہ اور ہمہ وقتی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوئے، تو انھوں نے اطمینان کی سانس لی کہ اب گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر کچھ تصنیف و تالیف کا کام کرینگے۔ لیکن انھیں کیا معلوم کہ

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

ان کے زمیندار سے الگ ہونے کے ساتھ ہی اخبار کے سارے عملے نے بھی ملازمت چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ ان میں ادارتی شعبے کے لوگ اور کاتب تک سب شامل تھے۔ یہ لوگ مہر صاحب کے پاس آئے اور انھیں اپنی خدمات پیش کیں۔ اگرچہ مہر صاحب طے کر چکے تھے کہ اب نہ وہ خود کوئی اخبار نکالینگے، نہ کسی اور اخبار میں ملازمت کرینگے، لیکن اب سوال اس عملے کے روزگار کا تھا؛ اور یہ لوگ اخبار کے کام کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہیں تھے۔ ادھر بعض دوستوں نے اصرار کیا کہ وہ اپنا روزانہ اخبار جاری کریں۔ سب سے مشکل مسئلہ روپے کا تھا۔ پہلی تجویز یہ تھی کہ ایک سو دوستوں سے جن کی فہرست تیار کی گئی تھی، کہا جائے کہ ہر ایک سو سو روپے فوراً ادا کر دے۔ وعدہ سب نے کر لیا، لیکن اس کا ایفا کم ہی نے کیا؛ اگرچہ یہ بھی سچ ہے کہ بعض احباب نے تین تین سو، بلکہ پانچ پانچ سو تک ادا کر دیا۔ بہر حال دو تین دن میں ساڑھے تین ہزار جمع ہو گیا اور اسی کے بل بوتے پر اخبار جاری کر دیا گیا۔ خدا نے اس میں برکت دی اور یہ بہت کامیاب رہا۔ "انقلاب" کا پہلا شمارہ ۲ اپریل ۱۹۲۷ء کو شائع ہوا تھا۔

مہر و سالک جن حالات میں زمیندار سے الگ ہوئے تھے، وہ اس سے سخت دل گرفتہ

تھے، اور انھیں مولانا ظفر علی خان سے جائز شکایت تھی کہ انھوں نے اپنے بیٹے کی محبت میں تمام اصولوں کو دھتا بتا دیا، اور پرانے رفیقوں اور ہمکاروں کی صحیح شکایتوں کی پروا نہ کی۔ ایسی حالت میں کہ دل شکوہ و شکایت سے لبریز ہوں، انسان اپنے غم و غصّے کے اظہار کے لیے بیتاب رہتا ہے۔ اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے، اسی موقع کے لیے کہا گیا ہے۔ اس لیے اندیشہ تھا کہ اب کہ مہر اور سالک کے ہاتھ میں اپنا اخبار ہو، اور ان کے دل مولانا ظفر علی خان کے خلاف بھرے ہوئے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ دونوں اخباروں کے درمیان جنگ چھڑ جائے۔ چنانچہ مولانا ابو الکلام آزاد نے مہر صاحب کو لکھا کہ اب علیحدگی ہو چکی ہے، زمیندار سے کسی طرح کا رقیبانہ طرزِ عمل روا نہ رکھا جائے، یہ ہر اعتبار سے غلط اور مضر طریق کار ہوگا۔ خود مولانا ظفر علی خان بھی کوئی کشمکش نہیں چاہتے تھے۔ شروع میں واقعۃً دونوں طرف سے موافقت اور مساعدت کے جذبات کا اظہار ہوتا رہا۔ لیکن فلکِ ناہنجار کو صلح و آشتی کی یہ فضا نہ بھائی۔ مولانا ظفر علی خان کو شبہہ تھا کہ انقلاب جاری کرانے میں اقبال اور فیروز خان نون کا ہاتھ ہے۔ ممکن ہے انقلاب کی پیشانی پر چھپنے والے اقبال کے مندرجہ ذیل شعر سے بھی ان کے شبہے کو تقویت پہنچی ہو، جس میں زمیندار کو کنایے میں ڈوبا ہوا تارا کہا گیا تھا۔

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تک؟

اسی لیے ظفر علی خان نے کہا تھا:

مجموعہ انقلاب کا اقبال و نون ہیں
(لفظ انقلاب کے حروف میں اقبال اور ن ہے)

بس اس پر مہابھارت چھڑ گئی۔ پھر تو وہ گھمسان کا رن پڑا کہ مدتوں بعد تک بھی ادبی

حلقوں میں اس کی گونج سنائی دیتی رہی۔ انقلاب میں مہر اور سالک کے احباب کا پورا گروہ جو نیاز مندانِ لاہور کہلاتے تھے، لکھتا تھا۔ محمد دین تاثیر، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، ابو الاثر حفیظ، پنڈت ہری چند اختر کے سے مشاہیر اور قادر الکلام شاعر و ادیب روزانہ انقلاب کے صفحات میں زمیندار اور مولانا ظفر علی خان کے خلاف نظم و نثر میں لکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی سید احمد شاہ بخاری 'پطرس' بھی ان میں آملتے تھے۔ کوئی اور ہوتا، تو اتنے تنگ نرغہ سے گھبرا کر ہتھیار ڈال دیتا۔ لیکن آفرین ہے ظفر علی خان کو! پریشان اور ہراساں ہونا تو درکنار، انھوں نے سب مخالفوں کو للکارا:

زمیندار ایک، آپ اتنے، مگر اوج سیاست پر
یہ اک کنّل لڑیگا آپ کے سارے پتنگوں سے

ظفر علی خان جو مکھی لڑ رہے تھے۔ اداریہ لکھا جا رہا ہے، نظم کہی جا رہی ہے، سالک کے 'افکار و حوادث' کے جواب میں نقاش کے نام سے فکاہات قلمبند ہو رہے ہیں۔ یہ سخن گسترانہ باتیں اپنی جگہ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مہر و سالک دونوں نے ظفر علی خان سے بہت کچھ سیکھا تھا اور اب ان ہی دونوں کا ان کے خلاف محاذ قائم کرنا انھیں بہت شاق گزر رہا تھا۔ اپنے اس رنج و غم کا اظہار انھوں نے ایک نظم میں بھی کیا تھا، لکھتے ہیں:

انقلابِ زمانہ دیکھیے گا — کل جو تھے دوست، آج ہیں دشمن
قطع رشتے ہوئے اخوت کے — بھائیوں کا بگڑ رہا ہے چلن
جھک گئی تھی جو بارِ احساں سے — ہے اب اکڑی ہوئی وہی گردن
میرے دامن نے دی پناہ جنھیں — ہاتھ ان کا ہے اور مرا دامن
مجھ پہ چلنے لگی مری ہی سناں — اب ہیں وہ گیو اور میں ہوں پشن
ہوتی آئی ہے یوں ہی دنیا میں — رسم ہے روزگار کی یہ کہن
خوب فرما گئے چچا سعدی: — "کس نیاموخت علم تیر از من

"کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد"

ایک اور نظم کے یہ دو شعر بھی دیکھیے:

مہر و سالک کے انقلاب کو دیکھ ۔۔۔ انقلابات ہیں زمانے کے
مہر و سالک ہوں اور میرے خلاف ۔۔۔ اتفاقات ہیں زمانے کے

بالآخر بعض اکابر شہر نے بیچ بچاؤ کیا اور دونوں طرف کے ادیبوں کو ایک دوسرے سے گلے ملا دیا۔

چونکہ سب لکھنے والے ایک درجہ کے نہیں تھے، اس لیے جبتک کبھی کبھی بات متانت کی سطح سے اتر کر سوقیت کی حدوں کو چھو لیتی تھی، لیکن عام طور پر معیار بلند اور تخلیقات کی ادبی حیثیت قائم رہی۔ یہ جنگ مہینوں جاری رہی، جس سے شہر کی فضا بھی متأثر ہونے سے نہ بچ سکی۔

جن اصحاب کو انقلاب کے مسلسل مطالعے کا موقع ملا ہے، وہ مجھ سے اتفاق کرینگے کہ اس اخبار نے کبھی صحافتی معیار سے کمتر کوئی بات نہیں کی۔ مہر نے یورپ اور ایشیا کے بیشتر ممالک کا سفر کیا تھا اور وہاں کے کئی اکابر سے ان کے ذاتی دوستانہ تعلقات تھے، ان ملکوں کے اندرونی اور بیرونی معاملات پر ان کی گہری نظر تھی، جو ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔ یہی باعث ہے کہ ان کے اداریے ہمیشہ صحیح معلومات پر مبنی اور مدلل و مدلل ہوتے تھے، اور ان کے مخالف بھی بادلِ ناخواستہ انھیں داد دینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

۱۹۴۷ء میں آزادی آئی۔ ملک تقسیم ہو گیا ایک کی جگہ دو ملک وجود میں آئے۔ انقلاب اس کے بعد بھی دو سال تک جاری رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ مہر صاحب پر روشن ہو گیا کہ تبدیل شدہ حالات آزاد صحافت کے حق میں نہیں۔ اگر وہ چاہیں کہ اپنی آزادیِ رائے بھی قائم رکھیں اور حکومت بھی ان سے خوش رہے، تو یہ ناممکن ہے۔ چونکہ ان کی نظر

میں آزادیِ ضمیر ورائے، خوشنودیِ حکومت سے عزیز تر تھی، انھوں نے انقلاب کی قربانی دینے کا فیصلہ کیا، اور ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو انقلاب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ایک کامیاب، بااثر ورسوخ، نفع مند اخبار کو اصول کی خاطر بند کر دینے کی ایسی اور مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔

اس کے بعد مہر صاحب نے براہِ راست سیاست اور صحافت سے بہت کم تعلق رکھا۔ مہر صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۶ء کے نصف آخر میں ہوئی۔ میں اسی سال کے وسط میں انٹر کا امتحان پاس کر کے بی۔ اے میں داخلہ لینے کے لیے لاہور پہنچا تھا۔ میں نے دسویں درجے کا امتحان اس سے پہلے جوبلی ہائی اسکول، وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ سے پاس کیا تھا۔ نویں اور دسویں درجہ میں میرے فارسی کے استاد قاضی احسان اللہ رہے تھے۔ وہ صحیح معنی میں عالم اور فارسی زبان کے رسیا تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ خرم تخلص تھا۔ اس وقت کہ میں یہ سطور لکھ رہا ہوں، ان کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔ وہ ایک مستقل مضمون کے مستحق ہیں اور انشاء اللہ بشرطِ فرصت میں کبھی اس فرض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کروں گا۔

قاضی صاحب موصوف جوبلی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر لالہ رشی رام کے دلی دوست تھے؛ دونوں ایک دوسرے کے مرتبہ شناس اور قدر دان تھے۔ ۱۹۲۴ء کے اواخر میں لالہ رشی رام کا انتقال ہو گیا۔ اس کے تھوڑے دن بعد قاضی صاحب نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ کہنے لگے: میرا دوست چلا گیا، اب میں یہاں رہوں، تو کس کے لیے؟ اس کے بعد لاہور چلے گئے۔ میں نے گورنمنٹ کالج گجرات میں داخلہ لے لیا۔ اور یوں قاضی صاحب سے میرا رشتہ ٹوٹ گیا۔

۱۹۲۶ء میں لاہور پہنچا، تو ایک دن کسی نے بتایا کہ قاضی صاحب زمیندار کے ادارۂ تحریر سے وابستہ ہیں۔ ان کا نام سنتے ہی ان کی بزرگانہ شفقت، ان کا علم و فضل اور ادبی

شوخیاں اور گستاخیاں یاد آئیں، جو طالب علمی کے زمانے میں ان کی خدمت میں مجھے حاصل تھیں۔ اگلے ہی دن میں کالج کے اوقات کے بعد زمیندار کے دفتر پہنچا۔ اطلاع کرائی، فوراً کمرے سے باہر نکل آئے۔ اس طرح سے ملے، گویا وہ میرے بزرگ اور میں ان کا خورد نہیں، وہ میرے اُستاد اور میں ان کا شاگرد نہیں، بلکہ ہم برسوں کے بچھڑے دو دوست تھے، جنھیں خوش بختی نے پھر یکجا کر دیا تھا۔ ہم دیر تک بیٹھے، ایک دوسرے کے حالات پوچھتے رہے۔ جب میں نے اجازت چاہی تو کہنے لگے: واہ، مہر صاحب اور سالک صاحب سے ملے بغیر تم کیسے جا سکتے ہو! چنانچہ انھوں نے مہر صاحب سے پچھوایا کہ اگر آپ خالی ہوں، تو میں ایک دوست کے ساتھ آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔ مہر صاحب نے فرمایا: تشریف لائیے۔ سالک صاحب بھی وہیں آگئے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر میں اپنے ہوسٹل چلا آیا۔ یہ تھی مہر صاحب سے میری پہلی ملاقات۔

میں ۱۹۳۶ء تک لاہور میں رہا۔ ان سے اکثر ملاقات رہی۔ لیکن ان کا یہ سارا زمانہ صحافت کی نذر ہوا، صحافت بھی کیسی؟ روزانہ اخبار کی ایڈیٹری اور اخبار بھی انقلاب، جو بلا مبالغہ اپنے زمانے کا بہترین روزنامہ تھا۔ لیکن ہے یہ کہ وہ بنیادی طور پر علمی مزاج کے آدمی تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ تاریخ، مذہب، فارسی اور اردو ادب و شعر سے متعلق ان کی معلومات کا اندازہ ان اصحاب کو نہیں ہو سکتا، جنھوں نے انھیں محض انقلاب (یا زمیندار) کے صفحات پر دیکھا ہے۔ ان کے علم و ادب سے شغف کا پہلا ثمرہ ان کی کتاب 'غالب' تھی جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ اس میں انھوں نے غالب کے اردو و فارسی کلام نظم و نثر سے ان کی سوانح عمری مرتب کی ہے۔ اس ایک کتاب سے ان کے مطالعے کا شوق، اہم اور غیر اہم کے درمیان انتخاب کی صلاحیت، جزئیات سے نتائج اخذ کرنے کی قابلیت، معلومات کے جمع کرنے میں جد و جہد، حسنِ ترتیب — غرض سب تصنیفی خوبیاں نمایاں ہیں۔ اور لطیفہ یہ کہ سارے کا سارا مواد ان سے

پہلے بھی جوں کا توں موجود تھا، لیکن کسی نے اسے استعمال کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ 'غالب' کے بعد اور کتابیں بھی غالب کی سیرت و سوانح سے متعلق لکھی گئی ہیں، لیکن کوئی شخص مہر کے 'غالب' کے مطالعے سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

'غالب' (مہر) کی ایک اور اہمیت بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے، جس نے اس کی افادیت کو چار چاند لگا دیے ہیں

جب یہ کتاب شائع ہوئی، تو مہر نے اس کا ایک نسخہ مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں بطور ہدیہ بھیجا۔ ظاہرا انھوں نے دورانِ تالیف میں مولانا آزاد کو اس کی اطلاع دی تھی۔ اب اس کے چھپنے پر نسخہ بھیجا، تو مولانا نے رسید بھیجتے ہوئے لکھا کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ مکمل سوانحعمری لکھ رہے ہیں، ورنہ بہت سی باتیں آپ کو لکھ بھیجتا، جو داخلِ کتاب ہو سکتی تھیں۔ بات یہ تھی کہ خاصی کمعمری ہی سے مولانا کے تعلقات اپنے عہد کے مشاہیر سے رہے تھے۔ ایسے مشاہیر جن میں سے بعض نے خود اور بعض کے عزیزوں اور رشتہ داروں نے غالب کو دیکھا تھا۔ مولانا آزاد کو غالب سے متعلق کئی معلومات ان اصحاب سے ملی تھیں۔ مزید برآں ان کا اپنا مطالعہ وسیع اور اتنا ہمہ جہتی تھا کہ اس کے دوران میں بھی کئی ایسی باتیں ان کی نظر سے گزریں، جو سوانحِ غالب میں توضیح و تشریح یا تکمیل کے لیے مفید ہو سکتی تھیں۔ مولانا آزاد نے مہر کے نام اپنے خط میں انھیں باتوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔

مہر صاحب کو جب یہ خط ملا، تو انھوں نے کتاب کے ایک اور نسخے میں بیچ بیچ میں سادہ اوراق لگوا کر اور جلد بندھوا کر ان کی خدمت میں بھیج دیا، تاکہ دورانِ مطالعہ میں اگر ان کے خیال میں کوئی بات آئے، تو وہ ان یادداشتوں کو قلم بند کر سکیں۔ مولانا اپنی فرصت کے اوقات میں کتاب دیکھتے اور ان سادہ اوراق پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے، اور یہ نسخہ بعد کو انھوں نے مہر صاحب کو بھیج دیا۔ جب کتاب دوبارہ شائع ہوئی، تو مہر صاحب نے

ان تمام یادداشتوں کو مولانا کے حوالے سے شاملِ متن کر لیا۔ اس سے واقعی کتاب کی قدر و قیمت بڑھ گئی۔ لیکن اس جگہ اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ مولانا آزاد سے دو ایک جگہ سہو بھی ہو گیا ہے۔

مہر صاحب کا منصوبہ یہ تھا کہ غالب کا تمام کلام، اردو ہو کہ فارسی، نظم ہو کہ نثر۔ پورے اہتمام سے مرتب کر کے شائع کیا جائے۔ 'غالب' سوانحمری دراصل اس وسیع کام کا نقطۂ آغاز تھا۔ لیکن بعد کو وہ اور، اور کاموں میں الجھ گئے اور یہ پروگرام مکمل نہ ہو سکا۔ البتہ انھوں نے غالب کے اردو خطوط دو جلدوں میں مرتب کر کے شائع کر دیے تھے۔ اس کتاب کا نام انھوں نے 'خطوطِ غالب' رکھا تھا۔ میں نے شکایت کی کہ آپ نے یہ نام کیوں رکھا؟ منشی مہیش پرشاد مرحوم کی کتاب کا یہی نام ہے؛ اب لوگوں کو التباس ہوگا اور حوالے میں مشکل پیش آئیگی، تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ یہ نام ناشر کے اصرار پر رکھنا پڑا، ورنہ میں اس کے حق میں نہیں تھا۔ میرے نزدیک یہ جواب تسلّی بخش نہیں تھا۔

ان کا ایک اور کارنامہ سیّد احمد شہید رائے بریلوی کی سوانحمری ہے۔ ۱۹۳۸ء میں وہ افغانستان کی سیاحت کو گئے۔ کابل میں ان کی ملاقات مولانا محمد بشیر سے ہوئی، جو شہید کے عقیدتمندوں کے حلقے میں ممتاز تھے۔ مولانا محمد بشیر نے باتوں کے دوران میں اُن سے فرمائش کی کہ سیّد احمد شہید اور ان کے رفقا کے حالات مرتّب کریں۔ انھوں نے وعدہ کر لیا۔ یقیناً اس وقت انھیں کام کی وسعت اور دشواریوں کا اندازہ نہیں تھا۔ لیکن یہ بھی ان کی افتادِ طبع کے خلاف تھا کہ کسی کام کو شروع کرنے کے بعد محض مشکلاتِ راہ کے باعث اسے ترک کر دیں۔ جب فرصت ملی، تو وہ اس پر جُٹ گئے۔ انھوں نے اس کتاب کے لیے مواد جمع کرنے میں چودہ برس صرف کیے۔ موضوع سے متعلق مطبوعہ اور غیر مطبوعہ پورے مواد کا مطالعہ کیا، جو بلا مبالغہ ہزاروں صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کے سفرِ سرحد کی تمام منازل کی ذاتی تحقیق کی انھوں نے کم و بیش سرحد کے وہ تمام مقامات خود جا کر دیکھے، جہاں سید شہید اور

ان کے ساتھیوں نے پڑاؤ کیے تھے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ یاد آگیا:

میں ہندوستان سے سات برس کی جبری غیر حاضری کے بعد ۱۹۴۶ء کے اواخر میں وطن آیا۔ چند روز بعد لاہور پہنچا، تو انقلاب کے دفتر ان سے اور سالک صاحب سے ملاقات کے لیے گیا۔ جنوری کے دن تھے۔ میں سہ پہر کو گیا، تو باہر صحن میں کرسیاں دھوپ میں بچھ گئیں۔ تھوڑی دیر میں اچھی خاصی محفل جم گئی۔ حاضرین میں مولانا غلام مرشد بھی تشریف فرما تھے۔۔۔ انھیں تصوف سے خاص شغف تھا (خدا معلوم، زندہ ہیں یا خدا کو پیارے ہو گئے) وہ بھاٹی دروازے کی اونچی مسجد میں امامت کرتے اور قرآن کا درس دیا کرتے تھے۔ چونکہ تصوف سے بے حد دلچسپی تھی، اس لیے ان کی تفسیر میں بھی تصوف کا عنصر غالب رہتا تھا۔ اسی باعث بعض اوقات ان کی تاویل دور از کار معلوم ہوتی، جس سے اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ میں نے مہر صاحب سے پوچھا کہ فرمائیے، حضرت احمد شہید سے متعلق آپ کی کتاب کس مرحلے پر ہے؟ فرمایا، پہلا مسودہ تو مکمل ہو گیا ہے، اب اس میں قطع و برید کر کے چاہتا ہوں کہ حجم کچھ کم ہو جائے کیونکہ موجودہ صورت میں اس کی ضخامت بہت زیادہ ہے۔ اس کے بعد اسی موضوع پر گفتگو ہونے لگی، تو فرمایا کہ میں بالاکوٹ گیا تھا۔ وہاں جو قبر حضرت سید صاحب کی بتائی جاتی ہے، میرے خیال میں وہ ان کی نہیں ہے۔ میں نے پوچھا: کیوں؟ کہنے لگے کہ میں نے متعدد بزرگوں کے مزارات پر حاضری دی ہے۔ حضرت سید صاحب کی قبر کو دیکھ کر دل پر وہ اثر مترتب نہیں ہوتا، جو اتنے بڑے بزرگ کے مزار سے ہونا چاہیے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ غالباً یہ قبر اُن کی نہیں ہے۔ اس پر میرے منہ سے نکل گیا کہ اثر کا مترتب ہونا مدفون کی بزرگی سے اتنا علاقہ نہیں رکھتا، جتنا آپ کی اپنی انفعالی کیفیت سے۔ سورج کی روشنی کا عکس آئینے اور پتھر پر یکساں نہیں ہوتا، حالانکہ اس کا نور ایک ہی ہوتا ہے۔ خدا معلوم جب آپ

قبر پر گئے "آپ کی دلی کیفیت کیا تھی۔ اور آپ اس وقت اس سے کوئی تاثر لینے کے قابل تھے بھی یا نہیں۔ چونکہ میری بات کسی حد تک تصوف کی حدود میں آتی تھی (مولانا غلام مرشد) کو بہت پسند آئی، انھوں نے بھی میری تائید کی۔ مہر صاحب نے چند لمحے کے لیے سر جھکایا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: بات تو آپ نے بڑے پتے کی کہی۔ اور اس سے میری ایک خلش بھی دور ہو گئی۔ عین ممکن ہے کہ یہی توجیہہ درست ہو، بہر حال یہ مسئلہ مزید تحقیق طلب ہے۔

انھیں اقبال کے کلام سے بہت مزاولت تھی۔ اقبال سے عمر بھر ذاتی تعلقات بھی رہے اور مختلف نظموں کی شانِ نزول کا جتنا علم انھیں تھا، اتنا شاید ہی کسی اور کو ہو۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اقبال کا صرف نصف یا ایک تہائی کلام چھپا ہے۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ اقبال نے اپنی کئی نظمیں یا شعر اس لیے اپنے کسی مطبوعہ مجموعے میں شامل نہیں کیے کیونکہ وہ ان کے خیال میں ان کے معیار سے فروتر تھے، یا ان کے عام اندازِ فکر سے میل نہیں کھاتے تھے۔ اپنی طویل رفاقت کے زمانے میں ایسا بہت سا کلام مہر کے پاس جمع ہو گیا تھا۔ وہ اسے توضیحی حواشی کے ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے۔ خدا معلوم، اب اس کا کیا حشر ہو گا! انھوں نے بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم کے مطالب و معانی سے متعلق مستقل کتابیں مرتب کی ہیں۔ ایک کتاب اقبال کے حالات پر مشتمل بھی چھوڑی ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے بچّوں کے ادب پر بھی خاص توجہ دی۔ اس سلسلے میں ان کی چھوٹی بڑی، خدا جھوٹ نہ بلوائے، کوئی پچاس کتابیں ہوں گی۔ انھوں نے ترجمے بھی کیے۔ اس میں زیادہ توجہ تاریخِ اسلام پر رہی۔ عجیب ہمہ گیر طبیعت پائی تھی۔ لیکن ترجمہ ہو کہ تالیف، سوانح ہو کہ تاریخ، سیاست ہو یا مذہب، ادب ہو یا شعر کوئی میدان ہو، وہ گھٹیا بات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جو بھی کہی اور جب بھی کہی، ایسی کہ نہ کبھی سننے والے کو اس سے شرم کا احساس ہوا، نہ خود انھیں کبھی بعد کو اس کے باعث ندامت ہوئی۔

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے

تاثرات

اس کتاب نے متاثر نہیں کیا۔ مالک رام کی تحریر میں کوئی انفرادیت یا ادبی چاشنی نہیں — پھر وہ بعض قسم کے تبصرے کرنے لگتے ہیں، ایسی باتیں جو عام قارئینِ ادب کے لیے نئی نہیں ہیں۔ شخصیت کے بارے میں ذاتی تاثرات، یا شخصیت کے نادر پہلو، وہ کم بلکہ بہت ہی کم سامنے لا سکے ہیں۔ "غالب" سب سے زیادہ پسند آیا — یہ اُن کی کامیاب ترین تحریر ہے۔

مالک رام نے، اپنے بقول اسلام کا خاصا مطالعہ کیا خصوصاً قرآن پاک بالاستیعاب پڑھا، اسلامی موضوعات پر لکھا بھی مگر انہیں ایمان کی دولت نصیب نہیں ہو سکی — وجہ؟
اوّل: ہدایت، نعمتِ الٰہی ہے — قرآنِ حکیم کا مطالعہ اُس شخص کو فائدہ پہنچاتا ہے جو اُسے ہدایت کے لیے پڑھے —
دوم: نیاز فتح پوری کی تحریروں نے اُن کے ذہن کو اتنا پراگندہ کر دیا کہ وہ قرآن کی حقانیت کو نہیں پا سکے۔

بہرحال مصنف ٹھنڈے مزاج کے وضع دار شخص ہیں۔ یہ کتاب معلومات افزا ہے مگر اس کا خاصا حصہ پیش پا افتادہ قسم کی باتوں پر مشتمل ہے

رفیع الدین ہاشمی
۳۱ مارچ ۱۹۸۱ء
(سرگودھا)